

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بَارَكْنَا فِيهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

آفتابِ نبوت

قرآن حکیم کی ایک آیت کو یہ نبوتِ محمدیؐ کی روشنی میں لکھا گیا ہے
اس کتاب کا مطالعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عقیدت، عظمت اور محبت کو
آپ کے دل میں مزید پروانہ کرے گا

حکیم الامت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بہتم دارالعلوم دیوبند

ادارۃ الامیاتیہ
لاہور - کراچی
پاکستان

وَقَدْ اٰتٰنَا الْحِكْمَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَنُورًا مِّنْ جَمَامٍ مِّنْ نَّوْرِ الْاٰنِ

آفتابِ نبوت

قرآن حکیم کی ایک آیت کریمہ سے نبوتِ محمدیہ کی رفعتِ شان کا حکیمانہ استنباط
اس کتاب کا مطالعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عقیدتِ عظمت اور محبت کو
آپ کے دل میں مزید یسویت کر دیگا

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ادارہ ایس ایم ایس پبلشرز، بک میلرز، کمپیوٹرز

• ایس ایم ایس پبلشرز، مال روڈ، لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۳۱۱-۳۷۲۳۳۱۲-۳۷۲۳۳۱۳
• ۱۹۰۔ انارکلی، لاہور، پاکستان۔ فون: ۳۵۳۲۵۵-۳۵۳۲۵۶
* چوکب آزدادی

ناشر : ادارہ اسلامیات لاہور
 عکسی طباعت : بار اول ۱۹۸۰ء
 باہتمام و انتظام : اشرف برادرز لاہور۔
 مطبوعہ : وفاق پریس لاہور۔
 کتابت : ندیم قادری
 قیمت مجلد :

ادارہ ایسیٹا پبلشرز، بک سیلرز، کمپیوٹرز

* سونہن روڈ پتہ: اردو بازار، کراچی۔ فون: ۲۷۲۳۰۱	* ۱۹۰۔ اندر کی لاہور، پاکستان فون: ۷۳۳۹۹۱ - ۷۳۳۲۵۵	* دنیا کی سٹیشن، مال روڈ، لاہور فون: ۷۳۳۳۳۲۔ فیکس: ۷۳۳۳۳۸
--	---	--

پتنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور۔
 دارالاشاعت اردو بازار کراچی ۱
 ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کراچی ۱۳
 مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کراچی ۱۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد :

ہمارے لئے یہ انتہائی خوش نصیبی کی بات ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے علمی افادات، حکیمانہ نکات اور گرانقدر تصانیف کی اشاعت کا منجانب اللہ ہمیں شرف حاصل ہوا ہے۔ اس سے قبل حضرت موصوف دام ظلہم کی کئی تالیفات ادارہ عکسی طباعت اور خوشنما زیب و زینت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ جس پر حضرت قاری صاحب مدظلہم نے بذریعہ خط اظہار پسندیدگی بھی فرمایا ہے۔

اب مزید ایک قدم آفتاب نبوت کی عکسی طباعت کے طور پر لگے بڑھایا گیا ہے۔ اس کتاب کی معنوی خصوصیات اور محاسن تو مطالعہ کے بعد ہی کھل سکتی ہیں اور پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ دور حاضر کے علماء میں حضرت قاری صاحب مدظلہم جیسے باریک بین حکیم و دانا، سراپا مجتہد علم و حکمت کا کیا مقام ہے۔

البتہ کتاب کی ظاہری خصوصیات کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ اپنی جانب سے کتاب کی طباعت و جلد بندی وغیرہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس سے قبل یہ کتاب ڈو مختصر حصوں میں لیتھو طباعت پر چھپی تھی۔ اس مرتبہ دونوں حصوں کو یکجا کرنے کے بعد نسبتاً بڑے سائز پر آئیٹ کی کتابت و طباعت کے ساتھ یہ جواہر پارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

امید ہے کہ کتاب سے استفادہ حاصل کرنے والے حضرات دعاؤں میں ہمیں بھی فراموش نہ فرمائیں گے۔

والسلام

ناشرین

اشرف برادران (تلمیذ الرحمن)



فہرست عنوانات (آفتاب نبوت (مکمل)

۴۹	۴	صبح صادق کے وقت کا عالمگیر اندھیرا	کلمہ آغاز
۵۳	۱۳	طلوع شفق	سیرت میں قرآن کی اعجازیاتی
۵۵	۱۵	روشن مطلع اور روشنی کے درجات	تمثیلی سیرت
۵۶	۱۵	نقطہ طلوع	سیرت اور آفتاب کی تمثیل
۵۶	۱۶	مقام طلوع	آفتاب کی خصوصیات
۵۶	۱۶	مرکز دائرہ طلوع	آفتاب کی عظمت و رفعت
۵۷	۱۸	آفتاب نبوت اور نجوم ہدایت کے نور میں جزوی	بارگاہ الہی میں سورج کی بیچارگی
	۱۹	اور کلی کافرق	انبیاء کی عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی عبدیت
۶۵	۲۰	آفتاب اور ستاروں کے نور میں فرق	اعلان عبدیت کا حکم
۶۸	۲۲	عبادات مذہب	آفتاب کی جامعیت
۶۸	۲۳	شعائر مذہب	آفتاب کا قرآنی لقب
۶۹	۳۱	تصویر مجبور	یہ تمثیل آفتاب اور چراغ سے مرکب کیوں ہے۔
۷۰	۳۳	شرائع مذہب	وجہ شبہ اور مقامات نبوت و سیرت
۷۱	۳۳	خوارق مذہب	روحانی آفتاب کی ضرورت
۷۹	۳۷	ختم نبوت	فلک آفتاب
۹۰	۳۷	نور آفتاب سارے ستاروں کے نور کی اصل ہے۔	شب تارا اور سامان روشنی
۹۰	۳۹	سرچشمہ نور کا حجم میں بڑا ہونا ضروری نہیں	نجوم ہدایت کا طلوع
۹۰	۴۰	نجوم ہدایت کے مخصوص رنگ آفتاب نبوت ہی کا	آسمان نبوت پر نجوم ہدایت کا اجتماع
	۴۰	فیض ہیں۔	آسمان نبوت پر طلوع آفتاب کے فطری تقاضے
۹۱	۴۱	آفتاب کے اصلی نور آنے پر فروری انوار کی جاست نہیں رہتی	آثار طلوع
۹۱	۴۱	آفتاب نبوت صرف خاتم النبیین ہی نہیں آخر النبیین بھی ہیں۔	آسمان نبوت کی صبح صادق
۹۲	۴۲	آفتاب نبوت ہی مصدر انوار ہے۔	یہ صبح صادق بھی آفتاب ہی کا اثر نغی

۱۳۲	جامعیت شیون	۹۲	آفتاب نبوت اگلوں اور پچھلوں کے لئے مصدر فیض سے
۱۳۷	جامعیت احوال	۹۴	آفتاب عالم کے کام اور ان سے مقالات نبوت کی توضیح
۱۵۰	رحمت مطلقہ	۹۴	خلقت اور ولادت
۱۵۲	پنجگی اور تکمیل	۹۵	طلوع اور بعثت
۱۱۵۳	حکمت تربیت اور نسخ شرائع	۹۶	پکار اور دعوت
۱۵۶	عموم فیضان اور عمومیت بعثت	۹۸	آفتاب نبوت کی جانب سے نور کی پیش کشی نہ کہ ذات کی پیش کشی
۱۵۷	ماننے والوں میں قبولیت کے مراتب	۱۰۱	بیدار و سرشار کی تقسیم
۱۵۸	منکروں کے تاثرات	۱۰۲	تنویر اور تعلیم
۱۵۹	غیر ذی روح اشیاء پر آفتاب نبوت کا اثر	۱۰۳	تاثر اور تربیت
۱۶۰	مکان اور فضا میں آفتاب نبوت کے آثار	۱۰۴	اوضاع و سنن
۱۶۳	آفتاب نبوت کے اثرات زمانہ پر	۱۱۰	تلاوت - تعلیم - تزکیہ
۱۶۵	زمانہ کا وجود آفتاب سے	۱۱۱	اسوہ حسنہ
۱۶۶	آفتاب نبوت کے ایام	۱۱۲	آفتاب نبوت سے استفادہ کے مراتب - درجہ صحابیت
۱۶۹	ہفتہ دنیا پر اقوام عالم کا اجماع	۱۱۳	صحابیت بالا تراز تنقید
۱۷۲	آفتاب نبوت کی مقدس راتیں	۱۱۴	طبقات مابعد آمدہ و راسخین فی العلم
۱۷۹	نظام زمانی	۱۱۸	علماء و اتقیاء
۱۸۳	آفتاب نبوت کے لئے زمانہ سے مومنوں کا ظہور	۱۱۹	عوام صلیاء
۱۸۶	نامزد ایام	۱۲۰	کفار و منافقین
۱۸۸	آفتاب نبوت اور اجتماعیت کبریٰ	۱۲۲	خوارق و معجزات
۱۹۵	جامع انقلاب	۱۲۵	دلیل آفتاب نبوت کی واقعیت و صداقت
۲۰۰	اس انقلاب کا ثبوت تورات و انجیل سے	۱۲۹	ناگزیر میری اعتراف
۲۰۲	اس انقلاب عمومی کا ثبوت قرآن سے	۱۳۲	عمومی تصدیق
۲۰۳	مومن کا ایمانی وجود اور اس کی ذات	۱۳۳	دوام ظہور
۲۰۶	آفتاب نبوت کی سروری میں سچا کا انحصار - آفتاب نبوت اور خلافت	۱۳۷	عظمت و شہرت عامہ قبول عام اور پیروی اقوام
۲۰۹	انحصار نجات		

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کلمہ آغاز

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى سَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

سیرۃ نبوتِ محمدؐ کے بعض بنیادی پہلوؤں کی یہ ایک طالب علمانہ یادداشت ہے جسے سیرت نگاری کا نام دینا تو مشکل ہے البتہ شوق سیرت نگاری کے جذبات کی تسکین کا نام اس پر رکھا جاسکتا ہے جسے آیت کریمہ **وَذَاعِبِاٰ اِیْیَ اللّٰهِ بِاٰذِنِهٖ وِسِرَاجًا مُّنِیْرًا** کی روشنی میں قلم رواشتہ لکھ لیا گیا تھا۔ نہ یادداشت ہی اس درجہ کی تھی کہ اسے بطور علمی تحفہ کے اہل نظر کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ حسن اتفاق سے ایک طالب علمانہ مجلس میں اس کے بعض اجزاء زیرِ قرأت آئے تو سامعین نے فرمائش کی اور اصرار کے ساتھ کی کہ اسے شائع کر دیا جائے۔ طباعت و اشاعت سے طبیعت اس لئے رکتی تھی کہ آخر کس نام سے اسے شائع کیا جائے؟ سیرت کے جتنے علمی پہلو ہو سکتے تھے ان سب پر علماء امتِ قلم اٹھا چکے ہیں کہ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی آنے والے کے لئے انہوں نے گنجائش نہیں چھوڑی کہ قلم نگاری کی جائے۔ سیرت کے تاریخی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، دینی، تبلیغی اور تعلیمی سارے ہی گوشے محققین امت کی روشنائی سے کاغذ پر اس طرح روشن ہو چکے ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا روشنی میں اضافے کی بجائے کاغذ پر سیاہی ڈال دینے اور روشنی میں حائل ہو جانے کے مرادف ہے۔ لیکن یہ خیال کرتے ہوئے کہ سیرت نبوی یا خلقِ نبوی حسب ارشاد حضرت صدیقِ رضی اللہ عنہما جب کہ

عین قرآن ہے۔ وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ : (اور آپ کا خلق قرآن ہے) اور قرآن کی شان لا تنقضی عجائبہ اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے، فرمائی گئی ہے تو دوسرے لفظوں میں سیرت نبوی کے عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ ایسے گنجائش نکلتی ہے کہ سیرت کا نام لے کر کچھ کہا جاسکے، مگر اس سلسلہ میں جبکہ مورخانہ محدثانہ، فقہانہ، متصوفانہ اور منکلمانہ طریق پر سب کچھ کہا جا چکا ہے تو اب ایک طالب علمانہ انداز ہی باقی رہ جاتا تھا۔ جس پر ایک ناقص الاستعداد طالب علم طبع آزمائی کر سکتا تھا، سو یہی ایک پہلو اس یادداشت کے منظر عام پر لے آنے کی جرات کا ذریعہ بن گیا۔

اس تحریر میں سیرت نبوت کے اساسی مقامات کھولنے کے لئے جو آیت زیب عنوان کی گئی ہے، یعنی دَاعِيَا اِلَى اللّٰهِ بِاَذْنِهِ وَاَمْرًا جَا مَنِيْرًا : اس میں یہ خیال احقر سائے ہی مقامات نبوت کھپے ہوئے ہیں، جنہیں اس آیت میں تدبر کر کے کھولا جاسکتا ہے اور وہ جس قدر بھی کھلتے جائیں گے، اسی آیت قرآنی کا مدلول بنتے جائیں گے۔ گویا یہ آیت کہ یہ سیرت نبوی کی ساری تفصیلات کے لئے بمنزلہ تخم کے ہے، جس میں سیرت کا شجرہ طیبہ سما یا ہوا ہے اور نہ صرف تفصیلات کے ساتھ بلکہ سیرت کی ان تمام امتیازی شانوں اور ممتاز فوقیت کے ساتھ جن کی وجہ سے یہ سیرت تمام سابقین کی مقدس سیرتوں سے افضل اور برتر مانی گئی ہے، اس لئے اس یادداشت میں محض سیرت کے پہلوؤں کا پیش کر دینا یا ان کی تفصیلات کو کھول دینا موضوع تحریر نہیں کہ یہ پیش کش سیرت کی ہر کتاب میں بالتفصیل موجود ہے، بلکہ ان پہلوؤں کو قرآن حکیم سے نکلتا ہوا دکھلانا اور قرآن کی ایک ہی مختصر سی آیت کو ساری سیرت کا ماخذ نمایاں کرنا اس یادداشت کا موضوع ہے۔

ظاہر ہے کہ اس موضوع کے دائرہ میں سیرت کے سارے پہلوؤں کا پیش کیا جانا ضروری نہیں، بلکہ صرف چند اساسی پہلوؤں کا نمایاں کر دیا جانا بھی اثبات موضوع کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مدعا اصلی قرآن کی طرف سیرت کا انتساب سیرت کے پہلوؤں کو قرآن سے نکلتا ہوا دکھلانا اور قرآن کو ان کا ماخذ ثابت کرنا ہے نہ کہ سیرت

کی ساری تفصیلات پیش کرنا اور یہ مدعا اس نوع کی چند مثالیں پیش کر دینے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس تحریر میں سیرت کے چند ہی پیش کردہ بنیادی پہلوؤں پر قناعت کر لی گئی ہے جو محض مثال کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمثیل کے لئے چند اعداد و شمار بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ سارے پہلوؤں کا احاطہ ضروری نہیں۔ گو تعداد میں یہ چند مثالیں پہلو بھی کم نہیں۔ تقریباً پچھتر اصولی مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اثبات، مدعا بلکہ ایضاً مدعا کے لئے کافی ہیں اور ان اصولی مثالوں کے نیچے جو فروعی مثالوں کا ذخیرہ آگیا ہے وہ اس عدد کے بھی زیادہ ہے۔ تاہم مثال چونکہ مثال ہی ہے جس کی تعداد کی طرف التفات نہیں ہوتا بلکہ اس سے اثبات، مدعا اور وضاحت، دعویٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور وہی مقصود بھی ہوتی ہے۔ خواہ مثال ایک ہو یا ایک سے زائد اس لئے اس طرف توجہ دلا دینا ضروری تھا۔ تاکہ لفظ سیرت آجانے سے سیرت کی ساری تفصیلی تاریخ کا انتظار نہ پیدا ہو جائے۔ پس یہ تحریر ایک تشبیلی تحریر ہے۔ جس سے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ اس باب میں پیش کردہ مثالوں کی طرح اور زائد مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ پس یہ ایک راہ نمائی ہے اگر رہرومی کا جذبہ رکھنے والے اس کے تحت راہ پیمائی اختیار کریں گے تو سیرت کے باقی ماندہ پہلوؤں کو بھی اسی آیت سے کھول سکتے ہیں اور وہ سب کھل کھل کر اسی آیت کے مدلول بنتے رہیں گے۔ حاصل مدعا یہ ہے کہ بیان سیرت میں قرآن اصل ہے اور یہ ساری روایتیں اور مستند حکایتیں جو سیرت کی مستند کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، قرآن کے بیان اور توضیح کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔ پس قرآن حکیم محض احکام و اصول کے بارہ میں دستور اساسی نہیں بلکہ سیرت اور تمام مقامات و اخلاقِ نبوت کے بارہ میں بھی اساس و بنیاد ہے اور جس طرح احکام کی روایتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا بیان واقع ہو رہی ہیں۔ اسی طرح سیرت کی روایتیں بھی اس کے بیان کے طور پر وارد ہوئی ہیں اور جس طرح محققین کے قول کے مطابق صرف ایک آیت ما آتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فاستہوا اسروہی کی ساری حدیثوں کے لئے ماخذ ہے اور احکام کی ساری حدیثیں اسی آیت کا بیان واقع ہو رہی ہیں۔ اسی طرح احقر کے فکر ناقص میں سیرت کی تمام احادیث و انبیا اور روایات و آثار اسی ایک آیت

وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا۔ کا بیان نور ہی میں اور ان ساری اخبار و روایات کا ماخذ بھی یہی آیت کریمہ بنی ہوئی ہے۔

چنانچہ اس ایک ہی آیت کریمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم کے سب سے بڑے داعی الی اللہ کی حیثیت سے سامنے لا کر (جو اس آیت کے مضامین کا اصل محور اور حقیقی موضوع ہے) آپ کی ساری داعیانہ سیرت اور پیغمبرانہ فضائل و کمالات کی تاریخ پر روشنی ڈال دی ہے۔ یعنی داعی الی اللہ کا کلمہ اصل مقصود بیان ہے اور باقی کلمات شاہد۔ مُبَشِّر۔ نذیر اس دعوت کے مبادی و آثار کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جن میں ساری سیرت نبوت پر نماں ہے کیونکہ بنیادی طور پر دعوت کے سلسلہ میں سب سے پہلے داعی کی ذات آتی ہے کہ وہ حجت و سند ہو اور اس کا سر قول و فعل، کردار و گفتار، عادات و اخلاق، رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرننا، رٹنا ملنا، سونا جاگنا، عادت و عبادت، معاملت، و معاشرت، حتیٰ کہ حوائج ضروریہ تک کا ایک ایک اندازہ حجت اور معیار کامل ہو کہ اس کے بغیر اس کی دعوت حجت نہیں ہو سکتی گویا دعوت داعی کی ذاتی عظمت و کمال کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی، سو اس ذاتی کردار و عظمت، اور اس کی حجت کے تمام مقامات تو شاہد ا کے نیچے درج ہیں۔ جن پر دعوت الی اللہ کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ پھر خود دعوت کے بھی کچھ اصول و ارکان ہیں جن کے بغیر دعوت مکمل اور موثر نہیں ہو سکتی اور وہ ترغیب و ترہیب ہے جس کے بغیر دعوت کی تاثیر قومی نہیں ہو سکتی کہ مخاطبین دعوت اس دعوت کا اثر قبول کریں اور یہ سارے موثرات دعوت مبشر اور نذیر کے نیچے درج ہیں۔ جن پر دعوت کی تکمیل اور تاثیر موقوف ہے۔ اس لیے داعی الی اللہ سے پہلے شاہد اور مبشر و نذیر کے کلمات، لا کہ دعوت الی اللہ کے ان دو مقاموں داعی کی ذاتی عظمت و شان یعنی ان کا شاہد و حجت ہونا اور خود دعوت کے اصول و ارکان یعنی بشری و نذیری سے ترغیب و ترہیب کی طرف رہنمائی فرمائی گئی۔ تاکہ داعی الی اللہ کی داعیانہ زندگی کے اصول و مبادی کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔

پھر دعوت کے ان اساسی کلمات شاید و مبشر و نذیر کو بلا کسی قید و شرط کے علی الاطلاق لا کر اس دعوت کی عمومیت اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت ختم نبوت کا موضوع ہے۔ اور آخر میں داعی اور دعوت کے ان ہمہ گیر پہلوؤں کو جو ان کلمات میں دیا بکوزہ کی مانند سمائے ہوئے ہیں۔ سر جامنیرا کا کلمہ لا کر ان کے کھلنے کی راہ دکھلائی گئی ہے۔ جس سے سیرت ختم نبوت کے ان سارے پہلوؤں کا نقشہ اک دم سامنے آ جاتا ہے۔ پس آیت کا عمودی کلمہ جس پر اس آیت سیرت کے تمام مضامین گھوم رہے ہیں۔ داعیاً الی اللہ ہے اور آیت کا تفسیمی اور تشریحی کلمہ جس سے یہ مضامین کھلتے ہیں۔ سر جامنیرا ہے۔ اس لئے آیت کے انہیں دو کلموں کو ہم نے اپنی تحریر کا موضوع قرار دیا ہے۔ جس سے ہمیں سیرت نبوت اور ختم نبوت کے مقامات کو اس آیت سے نکلتا ہوا دکھلانا ہے۔

ظاہر ہے کہ سیرت نبوت کے لئے بطور ماخذ قرآن کا حوالہ آ جانے اور بالفاظ مختصر قرآنی دلالت کے نیچے آ جانے سے سیرت کے ان تمام پہلوؤں کی محض تاریخی حیثیت نہیں رہتی بلکہ ان میں قرآنی دلالت سے ایک گونہ قطعیت کی ایک شان آ جاتی ہے۔ جس سے وہ عام تاریخ کی سطح سے بلند ہو کر اسناد حجیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو منکرین سیرت یا منکرین حدیث کے اوپر توجت بن جائیں گے اور عاشقان سیرت نبوت کے لئے انشراح کامل اور انبساط تام کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ اور ادھر قرآن حکیم کی اعجازی شان اور اس کے معجزانہ بیان کی ایک بلیغ ترین مثال بھی سامنے آ جائے گی۔ جس سے واضح ہو گا کہ قرآن کریم ان بے شمار حقائق کے ذخیروں کو جو دفتروں میں نہیں سما سکتے اپنے چھوٹے چھوٹے کلموں اور مختصر اعجازی جملوں میں کس طرح سمیٹ کر ادا کر دیتا ہے اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ یہ روایتی تفصیلات مل کر بھی مقصود کا وہ احاطہ نہیں کر سکتیں جو قرآن کا یہ اعجازی اجمال مدعا کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں اپنی اعجازی شان دکھا دیتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود اس تحریر سے میرا دلّی مشار اور حقیقی مقصد اگرچہ

پوچھئے تو صرف یہ ہے کہ اس جیلہ سے حضرت خاتم الانبیاء سردارِ دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اور آپ کی مقدس سیرت کا کوئی ذکر خیر اس نالائق کی زبانِ قلم پر بھی آجائے اور سیرت نگاروں کی فہرست کے کسی کونے میں اس نامر سیاہ غلامِ نبوۃ کا بھی اس بہانہ سے نام لکھا جائے اور ساتھ ہی سیرت کے ان بنیادی مقامات کے سلسلہ سے اُن ہی کی روشنی میں کچھ شرعی حقائق بھی بیان میں آجائیں جو سیرت کے پس منظر کے طور پر ان مقامات سے متعلق ہیں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں یہ سیرت نگاری اور کہاں یہ ناکارہ علم و عمل کہاں حقائق بیانی اور کہاں ایک ناقص الاستعداد کی یہ طالب علمانہ یادداشت چراغِ مردہ کجا نور آفتاب کجا ہے لیکن اگر یہ نام کی سیرت نگاری انگلی کاٹ کر شہیدوں میں داخل ہونا بھی نہ کہی جائے۔ صرف انگلی کو لہو لگا کر شہیدوں کی صورت بنالینا ہی سمجھ لی جائے۔ تب بھی اپنی سعادت کے لئے کافی ہے۔

کیا عجب ہے کہ وہ پروردگار جس کی عادت کریمہ اچھی صورتوں میں اچھی حقیقتیں ڈالنا ہے۔ اپنے اس ناکارہ بندے کی اختیار کی ہوئی اس اچھی صورت کو اچھی حقیقت سے بھر پور کر دے اور کیا بعید ہے کہ اس مختصر اور بے ربط سی تحریر سے سیرت نبوۃ کی علمی یا عملی برکات کا کوئی اثر راقم الحروف اور ناظرین حروف کے دلوں تک پہنچ جائے۔

وَمَا ذَاكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ وَهُوَ حَسْبِي وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝

محمد طیب غفرلہ ولوالدیہ

مدیر دارالعلوم دیوبند

۱۲، ریح الاول ۱۳۴۵ھ

آفتابِ نبوت

قَالَ اللَّهُ جَلَّ ذِكْرُهُ وَعَزَّ اسْمُهُ وَأَعْظَمَ شَانُهُ وَجَلَّ بُرْهَانُهُ يَا أَيُّهَا
النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى
اللَّهِ بِآذِينِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝

وَشَمْسِي خَيْرٌ مِنْ شَمْسِ السَّمَاءِ
وَشَمْسِي تَطْلُعُ بَعْدَ الْعِشَاءِ

لَنَا شَمْسٌ وَلِلْآفَاقِ شَمْسٌ
شَمْسُ النَّاسِ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرِ

سیرت میں قرآن کی اعجاز بیانی

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى ۝ موضوع تحریر اس وقت کلمہ پاک
”وسراجاً منيراً“ ہے جس میں حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی نبوت اور پیغمبرانہ سیرت کے بنیادی مقامات پر صرف دس حرفوں میں اتنی تفصیلی
روشنی ڈالی گئی ہے کہ سینکڑوں مجلدات بھی ان کی اتنی توضیح اور تفصیل نہیں کر سکتی تھیں
اور پھر ایسے جامع اور بلخ پیرایہ میں کہ نہ صرف مقامات سیرت ہی کھول دیتے گئے ہیں بلکہ
تمام انبیاء و مرسلین کی سیرتوں پر آپ کی سیرت کی فضیلت و فوقیت بھی نمایاں کر دی گئی
ہے۔ یعنی سیرت کی تفصیل اور اس کی تفصیل سب اسی ایک مختصرے کلمہ میں سمو دی
گئی ہے۔

شاید ناظرین اوراق کو حیرت ہو کہ ”سراج منیر“ کے کلمہ میں تفصیلات سیرت تو

بجائے خود ہیں۔ ہمیں تو کوئی اجمال بھی نظر نہیں آتا بلکہ اجمال بھی بجائے خود ہے ہمیں تو اس دس حرفی کلمہ میں سیرت کا کوئی دعویٰ تک محسوس نہیں ہوتا۔ یہ کوئی شاعرانہ تخیل تو نہیں، جو قرآن کے سر لگایا جا رہا ہے؛ میں گزارش کروں گا کہ حاشا ثم حاشا نہ قرآن حکیم ہی کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کسی مومن قرآن کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ اپنی کسی شاعری کو اس کے سر تھوپے وہ تو وہاں بقول شاعر کا سچا مصداق اور سچی پکی حقیقتوں کا سرچشمہ ہے جس میں تخیل آفرینی کا تصور بھی گناہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ قرآن حکیم نے "سراج منیر" کے چھوٹے سے کلمہ میں حضور کی بلند پایہ سیرت اس کی تفصیل پھر اس کی تفضیل اور پھر اس کے سارے ہی بنیادی مقامات پر واضح روشنی ڈالی ہے۔ مگر تعبیر کی راہ سے نہیں بلکہ تمثیل کے راستے سے۔ اُس نے لمبے چوڑے الفاظ میں سیرت کے ابواب کی کوئی طویل و عریض فہرست شمار نہیں کرانی۔ بلکہ تشبیہ کے راستے سے وجود شبہ کی طرف توجہ دلا کر ان مشابہتوں سے نکلنے ہوئے مقامات سیرت ایسا عجازی رنگ سے کھول دیئے ہیں کہ تھوڑے سے فکر سے با آسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

اس انداز بیان کو اختیار کرنے کی وجہ بظاہر اس طرف رہنمائی کرنا ہے کہ مقامات نبوت اور ان سے پیدا شدہ کمالات ظاہر و باطن کی کیفیاتی امور ہیں۔ جن کا تعلق بیان سے نہیں مشاہدہ سے ہے اور مشاہدہ بغیر ان مقامات سے گزرے ہوئے ہو نہیں سکتا۔ اس لئے بیان کتنا ہی فصیح و بلیغ اور جامع کیوں نہ ہو کیفیت و حقیقت اس کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ اگر ایک نابالغ بچہ کے سامنے بلوغ اور شباب کی کیفیات بیان کی جانے لگیں تو بیان کتنا ہی بلیغ اختیار کیا جائے نہ یہ کیفیت بیان سے کھل سکے گی اور نہ بچہ کسی درجے میں بھی اُسے سمجھ سکے گا۔ جب تک کہ خود جوان ہو کر بلوغ کے مقامات سے گذر نہ جائے۔ اسی طرح ایک جوان کے سامنے بڑھاپے کی کیفیات ایک بوڑھے کے آگے مختصر (جاں بلب) کی جان کنی کی کیفیات اور ایک مختصر کے سامنے عالم قبر و برزخ کی کیفیات نہ بیان کی گرفت میں آ سکتی ہیں۔ نہ یہ نارسیہ

طبقات انہیں سمجھ سکتے ہیں، جب تک کہ ان کیفیاتی مقامات سے گزر نہ جائیں۔
 دنیا بد حال پختہ پیرج خام

تمثیلی سیرت

پس وہ مقامات نبوت جو ان ذکر کردہ نفسانی کیفیات سے بدرجہا بالاتر بدرجہا لطیف تر اور برتر اب بے شمار دقیق تر ہیں۔ بیان کی گرفت میں کہاں آتے تھے اور مقام نبوت سے نا آشنا محض لوگوں کو محض لفظوں سے کیسے سمجھایا جاسکتا تھا۔ اس لئے انہیں عام فہموں سے کچھ قریب کرنے کے لئے تمثیل اور تشبیہ کا راستہ اختیار کیا گیا جو حقائق کے سمجھانے کا سہل ترین راستہ ہے۔ کیونکہ معنوی کیفیات کے مشابہ جب کوئی حسی صورت سامنے لا کر کھڑی کر دی جاتی ہے تو اس معنوی حقیقت کا سمجھنا ایک حد تک ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کتاب و سنت میں بڑے بڑے دقیق مسائل جیسے ذات و صفات حشر و نشر، جنت و نار، میزان و صراط وغیرہ کو مثالوں ہی سے سمجھایا گیا ہے۔ حجت و برہان سے نہیں کہ یہ استدلالی راستہ خالی امور کے سمجھنے سمجھانے کا ہے ہی نہیں اور بے کیف انسان کیفیات کو محض لفظی پیر پھیر سے سمجھ ہی نہیں سکتا۔

سیرت اور آفتاب کی تمثیل

اس لئے حضرت خاتم المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے کمالات ظاہر و باطن اور مقامات نبوت و خاتمیت کی لطیف ترین کیفیات کو جب کہ استدلال و بیان سے فہموں کے قریب کر دیا جانا ممکن نہ تھا تو ان کی تفہیم و بیان کے لئے یہی تمثیل کا راستہ اختیار کیا گیا اور مادی محسوسات میں اس تمثیل و تشبیہ کے لئے ایک ایسی ہستی کا انتخاب کیا گیا جو اپنے مادی اوصاف و کمالات کے لحاظ سے یکتائے عالم اور بے مثال تھی۔ جس کی نظیر سلسلہ مادیات میں نہ علویات میں تھی۔ نہ سفلیات میں نہ آسمانوں میں تھی۔ نہ

زمینوں میں گویا وہ کمالات کے لحاظ سے ایک گونہ یکتائی وحدانیت اور خاتمیت لئے ہوئے تھی اور حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ساری مخلوقات میں بے نظر اور بے مثال ہیں۔ اس لئے آپ کی یکتائے عالم ہستی کے روحانی کمالات اسی یکتائے مادیات ہستی کے کمالات کی حسی صورت میں سامنے لا کر روشناس کرائے گئے اور وہ مادیات کی یکتا اور بے نظیر ہستی آفتاب عالم تاب کی نورانی ہستی ہے جو حضور کے کمالات کے لئے بطور بلیغ مثال کے چنی گئی۔

آفتاب کی خصوصیات

چنانچہ آسمان پر ستارے اور بھی ہیں اور سب ہی برسرِ عروج و عظمت رہ کر نوراً سے سرفراز ہیں مگر جو جمال و کمال سورج کو ملا ہے، وہ اور کسی ستارے کو نہیں ملا اور جو تاثیر و تصرف اس کے حصہ میں آیا ہے، وہ اور کسی کو میسر نہیں ہوا۔ نیز جو غلبہ و اقتدار اُسے دیا گیا ہے، وہ اور کسی سیارے کو نہیں دیا گیا۔ پس آفتاب ان سارے ستاروں میں بمنزلہ بادشاہ کے ہے جس کی حکومت و تاثیر سے کوئی ستارہ مستغنی نہیں جتنی کہ سارے ستارے اپنی نورانیت اور چمک دمک میں بھی سورج ہی کے محتاج ہیں جن کی نورانیت آفتاب ہی کے نور سے قائم ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ علویات اس سے مستغنی نہیں جو سفلیات میں موثر ہیں تو سفلیات کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ وہ تو عام ستاروں سے بھی مستغنی نہیں چہ جائیکہ آفتاب سے مستغنی ہوتے چنانچہ جو اور فضا، فضا میں پھیلے ہوئے مٹریکات زمین اور اس کی پیداوار، فرشِ خاک اور اس پر بسنے والے نفوس میں سے کوئی چیز بھی اس سے جو اس کے فیضان کی محتاج نہ ہو، اس لئے سورج علویات اور سفلیات۔۔۔ نور کا مربی اور بادشاہ ہے۔

آفتاب کی عظمت و رفعت

اس کی عالمگیر رفعت و عظمت ہمہ گیر تاثیر و تصرف اور تکوینی تربیت عام کو دیکھ

کر بہت سی اقوام کو اس کی ربوبیت اور الوہیت کا دھوکہ لگا اور وہ اس کی پرستش کا شکار ہو گئیں۔ بلقیس جیسی عظیم ملکہ نے باوجود اَوْتِیْتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (اس دنیا کی ہر چیز سے دی گئی تھی) کی شان رکھنے کے اسی کی آب و تاب کے سامنے جبین نیاز جھکانی اور سر عبودیت خم کر دیا اور نہ صرف یہی بلکہ اس کی پوری قوم جو نَحْنُ اَوَّلُ قُوَّةٍ وَاوَّلُ عِبَادٍ شَدِید (ہم نہایت زبردست قوت و طاقت والے ہیں) کی دعویٰ رکھتی تھی، اگر جھکی تو اسی دیوتا کے آگے جھکی، جس کے بارہ میں قرآن نے شہادت دی کہ

یَجْذُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ————— وہ خدا کو چھوڑ کر سورج کو پوجتے تھے۔

مجوس کی باشعور قوم نے ستارہ پرستی کے سلسلہ میں جو ہیکلیں اور عبادت گاہیں بنائیں، ان میں سب سے بڑی ہیکل اسی جہاں تاب یارہ (سورج) کی تھی، جس کی عمارت سونے کے رنگ کی بنائی گئی تھی اور اس میں منوں سونا اور سونے کا پانی کھپایا گیا تھا۔ آفتاب کی مثالی صورت کا بت خالص سونے کا بنا کر اس میں رکھا گیا تھا، اس ہیکل کے احاطہ میں آفتابی ہی رنگ کے برتن اور سامان استعمال کئے جاتے تھے، اور اس طرح مجوس میں متمدن قوم بھی اگر گرمی تو اسی ستارے کی بلندی کے سامنے گرمی اور اس کی پرستش میں گم ہو کر رہ گئی، نجومی جیسی فلسفی قوموں نے بھی اگر کسی جہاں کی تاثیر و نصرت کا لوٹا مانا تو ستاروں ہی کا مانا اور ان میں سب سے زیادہ بااثر سورج کا جہاں تسلیم کیا، جس کے آگے سر نیاز جھکا دیا، وہ عالم میں تاثیر ستاروں کی مانتے ہیں اور ستاروں میں سورج کی گویا سورج تاثیر و نصرت کا شاہنشاہ ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بھی سارے ستاروں میں اگر ہذا ربی ہذا اکبر (یہ ہے میرا رب اور یہی سب سے بڑا رب ہے) کہا تو اسی روشن اور درخشنا ستارہ کو دیکھ کر کہا کہ قوم متوجہ ہو جائے اور جب لڑے ان مجازی روشنیوں سے حقیقی نور اور ہذا اکبر کے راستے سے اللہ اکبر کا جلوہ دکھایا جائے تو وہ اتنی جہت کہہ کر اس رب مطلق کے سامنے سر عبودیت خم کر دے۔

بارگاہ الہی میں سورج کی بیچارگی

یہی وجہ ہے کہ جب اس عظیم الشان سیارہ کی چمک دمک اور تاثیر و تصرف کی ہم گہری اور یکتائی کے پیش نظر سادہ لوحوں کے لئے اس گمان کا موقعہ تھا کہ وہ اس کی الہیت اور خداوندی کے دھوکے میں پڑ جائیں تو حق تعالیٰ نے جہاں اُس کی تاثیر و تصرف اور فوائد و برکات کی فہرست قرآن حکیم میں شمار کرائی۔ وہیں کھلے لفظوں میں اولاً اس کی پرستش کو اہتمام کے ساتھ روکا اور فرمایا۔

لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو، مان سجدہ
وَاسْجُدْ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن
كُنْتُمْ آيَاءَ تَعْبُدُونَ کرو اللہ کو جس نے ان کو بنایا۔ اگر تم اس کی
عبادت کرنا چاہتے ہو۔

پھر اس عظیم المرتبت سیارے کی بیچارگی و بے بسی اپنی بارگاہ رفیع کے مقابلہ میں ظاہر فرماتے ہوئے خود اس کی بندگی کی چال کو بھی آشکارا فرمایا کہ جب وہ خود ہماری بارگاہ اقدس کے سامنے سجدے کرتا ہوا چلتا ہے تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خالق شمس و قمر کو چھوڑ کر اس بے بس مخلوق کی پرستش کے دلدل میں پھنس رہے ہو۔

الْوَرَّانَ اللّٰهُ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنَّجْمُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ
وَالدَّوَابُّ وَكثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكثِيرٌ حَقُّ
عَلَيْهِ الْعَذَابُ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ
کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور جو
زمینوں میں ہے اور سورج اور چاند اور
ستارے اور پہاڑ اور درخت چوپائے
اور بہت سے انسان اور بہت سے
وہ بھی جن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔

پس اس آیت میں نہ صرف سورج کی بندگی ہی ظاہر فرمادی گئی ہے جس سے اس کی معبودیت کی نفی ہو جائے، بلکہ اُسے عام چھوٹی بڑی مخلوق کے ساتھ دلائل کے اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ بلحاظ مخلوقیت اس کی حیثیت عام مخلوق سے زیادہ کچھ

نہیں بلکہ مخلوق ہونے میں اک ذرہ زمین اور یہ آفتاب فلک سب برابر ہیں پھر اس کے آگے بڑھ کر اس کی عام نقل و حرکت میں بھی اس کی مجبوری اور بے بسی واضح فرما دی گئی تاکہ کسی درجہ میں بھی اس کی الوہیت کا وسوسہ دماغوں میں نہ آنے پائے۔ فرمایا۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ
النَّجْمَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي
فَلَکٍ يَبْتَغُونَ ۚ

سورج کی مجال میں نہیں ہے کہ چاند کو پامالے اور نہ رات دن پر مقدم ہو سکتی ہو۔ ہر ایک اپنے اپنے فلک پر تیر رہا ہے۔

بہر حال اولاً اس کی پرستش سے خصوصی ممانعت پھر اس کی مخلوقیت کی اطلاع پھر نقل و حرکت میں اس کی بے بسی اور بیچارگی کا اظہار اور پھر اس کی عبدیت و اطاعت اور فرمانبرداری کا کھلا اعلان صرف اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کی عام تعہدیت و تاثیر اور نمایاں جاہ و جلال کو دیکھ کر کوئی اس کی پرستش کی طرف نہ جھک جائے۔

انبیاء کی عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی عبدیت

سورج کی ذات میں یہ مثال ہے عموماً تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پر عظمت احوال و مقامات اور پر عبدیت و طاعت حالات کی یعنی جیسا کہ انبیاء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پر اگر خوارق اور معجزات ظاہر کئے گئے اور ان کے غیر معمولی تصرفات کے کارنامے دکھلائے گئے۔ جن سے ان کی ہستیاں مافوق العادت اور غیر معمولی عظمت و رفعت کی حامل بن کر نمایاں ہوئیں تو وہیں اس خطرہ سے کہ مخلوق ان عجائبات اور مافوق العادت امور کو دیکھ کر کہیں ان کی خداوندی کا خیال نہ جا بیٹھے۔ انبیاء پر عام بشری عوارض دکھ، درد، بیماری، مصائب، مشکلات، آفات، چوٹ، زخم خوردگی، لوگوں کی بدگوئی اور ظاہری بے بسی، بے ویلگی حتیٰ کہ قتل و مظلومیت کے حالات بھی ظاہری کئے گئے، بلکہ تبصریح حدیث نبوی انہیں عام مخلوق سے زیادہ مبتلائے مصائب کیا گیا تاکہ بارگاہِ خداوندی کی نسبت سے ان کی عبدیت و بیچارگی زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو جائے اور ان کی الوہیت اور معبودیت کے

دو کہ خود میرا بھی میرے اوپر کوئی بس نہیں اور میں بذاتِ خود حاکم نہیں بلکہ ایک متبعِ حق محکوم ہوں جس میں سارے تصرفات مالکِ حقیقی ہی کے ہیں جو قیامت تک اور قیامت کے بعد تک ہوتے رہیں گے۔

قل ما كنت بدعا من الرسل
وما ادعى ما يفعل بي ولا بكم
ان اتبع الا ما يوحى الي
وما انا الا نذير مبين

آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ تمہارے ساتھ، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعے سے آتا ہے اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

حتیٰ کہ جب منکرین نے آپ کو عاجز کرنے کے لئے مخصوص معجزات کے مطالبے شروع کئے اور کہا کہ

لن لو من لك حتى تفجر لنا من
الارض ينبوعاً تكون لك
جنة من نخيل وعنب تفجر الانهار
خلالها تفجيراً وتسقط السماء كما
زعمت علينا كسفا وتاتي بالله
والملائكة قبلاً او يكون لك بيت
من نر خرف او ترقى في السماء
ولن لو من لرقبك حتى تنزل علينا
كتاباً تقرؤة

ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دیں یا آپ کے لئے کھجور انگوڑوں کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیج بیج میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں، آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرا دیں، آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھرنہ ہو یا آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور ہم توپ کے چڑھنے کو بھی کبھی یا اور نہ کریں جب تک کہ آپ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ

(پ ۱۵ رکوع ۹)

لائیں جس کو ہم پڑھ بھی لیں۔

تو آپ سے فرمایا گیا کہ صاف لفظوں میں اپنی بے بسی اور عجز بشریت کا اعلان فرمادیجئے۔ قُلْ بُحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ۝

مہر حال سارے عجز و نیاز کے کلمات اور یہ مجبور می اور بے کسی کے عنوانات محض اس لئے ان برگزیدہ ہستیوں کے لئے تجویز کئے گئے اور ان سے کہلائے گئے کہ ان بلند پایہ حالات اور ان کے معجزات اور کرامتوں کو دیکھ کر بے بصروں کو ان کی خدائی کا دھوکہ نہ لگ جائے اور جنہیں لگ گیا ہے، وہ باقی نہ رہنے پائے۔

ٹھیک اسی طرح مادیات میں سورج کی غیر معمولی عظمت و رفعت اور آسمان و زمین کی دنیا میں اس کی یہ خاص یکتائی اس کا احتمال رکھتی تھی کہ بے بصیرتوں کو اس کی خدائی کا دھوکہ لگ جائے اور وہ خالق شمس و قمر کو چھوڑ کر شمس و قمر اور خصوصاً شمس کے پیچھے ہولیں۔ اس لئے اس پر یہ بیچارگی اور بے بسی کی گردنیں مسلط کی گئیں کہ وہ رات دن چکر میں رہے۔

کبھی عروج اور کبھی نزول، کبھی کسوف اور کبھی خسوف، کبھی روشنی کی تیزی اور کبھی ہلکا پن، کبھی حدت، کبھی شدت اور کبھی نفثت تاکہ ان تغیر پذیر احوال کو دیکھ کر اس کے بارہ میں لوگ پر تشش کے وسوسوں کا شکار نہ ہوں اور جو ہو چکے ہیں، وہ اس سے نکل جائیں اور صرف مالک الملک ہی کی معبودیت ہی کا جھنڈا عالم میں بلند رہے۔

تاہم اس کی بیچارگی کو اس شد و مد سے سامنے لایا جانا ہی اس کی بھی دلیل ہے کہ سورج ہی جیسے عظیم المرتبت سیارہ میں معبودیت کے شبہات کا مظنہ بھی ہو سکتا تھا جس کی پیش بندی اور روک تھام کی ضرورت پیش آئی۔

آفتاب کی جامعیت

اس سے ہمارا یہ مدعا صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ ان نشانات رفعت و عظمت اور ساتھ ہی آثارِ قدیرت و عبدیت کی یکتائی کی وجہ سے سورج ہی ایک ایسا یکتا اور جامع

شیون ستارہ تھا کہ عالم روحانیت کے جوہر یکیتا اور دُرِ پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص سیرتوں اور احوال و کمالات کھولنے کے لئے تخیل کا کام دے سکے اور وہی اس قابل تھا کہ اس کے احوال و صفات کو پیش کر کے حضور کے احوال و اوصاف رفیعہ کو ان کے ذریعہ مثل محسوس کے دکھایا جائے ظاہر ہے کہ جب کسی بلند ترین حقیقت اور اعلیٰ ترین روحانی کیفیت کے مشابہ کوئی بلند ترین حسی صورت سامنے آجائے گی تو اس کے مشابہ معنوی حقیقت کا ادراک آسان ہو جائے گا پس حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ظاہر و باطن اور مقامات نبوت و ختم نبوت تک فہم کی رسائی جب کہ کسی تعبیری بیان سے ممکن نہ تھی تو سراج منیر ہی کی بلیغ اور جامع ترین مثال ہو سکتی تھی جس سے تشبیہ دے کر یعنی آپ کو آفتاب نبوت دکھلا کر آپ کے تمام مقامات سیرت کو اقرب الی الفہم کر دیا جائے چنانچہ قرآن نے آپ کو سورج سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنے معجزانہ لہجے میں دعویٰ کیا کہ

وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَ
سِرَاجًا مُنِيرًا ۝
(اے پیغمبر ہم نے آپ کو بھیجا ہے)
داعی الی اللہ بنا کر اپنے حکم سے اور
روشن چراغ بنا کر۔

جس سے آپ کے آفتاب نبوت ہونے کا دعویٰ سامنے آجاتا ہے۔

آفتاب کا قرآنی لقب

اس موقع پر آپ کے ذہن میں شاید یہ کھٹک پیدا ہو کہ سراج کے معنی تو لغت عرب میں چراغ کے ہیں۔ سورج کے نہیں۔ اس لئے اس آیت میں اگر آپ کو تشبیہ دی گئی ہے تو روشن چراغ سے دی گئی ہے۔ نہ کہ سورج سے اور محض چراغ سے حضور کو تشبیہ دیا جانا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس تشبیہ سے آپ کے ہمہ گیر کمالات پر کوئی جامع روشنی ہی پڑ سکتی ہے تو پھر سراج سے سورج

کیسے مراد لے لیا گیا؟۔

جو اباً عرض ہے کہ جہاں تک لغت کا تعلق ہے عربی زبان میں سراج کے معنی محض چراغ ہی کے نہیں، بلکہ سورج کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب کی تیسری جلد میں ولشمس سراج النهار (آفتاب دن کا چراغ ہے) کہہ کر آفتاب کو چراغ کہا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ لغت میں شمس چراغ کو بھی کہتے ہیں، اور پھر والسراج الشمس (چراغ سورج ہے) کہہ کر چراغ کو آفتاب کہا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ لغت میں سراج سورج کو بھی کہتے ہیں۔ آگے صاحب لسان العرب نے اس پر اس آیت کریمہ وسراجاً نورا کو بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک بلحاظ لغت اور بلحاظ تفسیر اس آیت میں سراج کے معنی چراغ کے بھی لئے جا سکتے ہیں اور سورج کے بھی۔ چنانچہ اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

انما یرید مثل السراج الذی	بلاشبہ اس آیت میں سراج منیر سے حق
یستضاء بہ او مثل الشمس	تعالے نے حضور کو یا چراغ کی مثل فرمایا
فی النور والظہور :-	ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی
(لسان العرب ص ۱۲۲)	ہے یا آفتاب کی مانند فرمایا ہے۔ نور
	میں اور ظہور میں۔

اس سے واضح ہے کہ سراج منیر سے حضور کو آفتاب سے تشبیہ دیا جانا لغت کے عین مطابق ہے۔ تفسیر کو دیکھا جائے تو ان کی رو سے بھی سراج کے معنی چراغ اور آفتاب دونوں کے لئے جا سکتے ہیں۔ صادی حاشیہ جلالین میں لکھتے ہیں:-

قولہ وسراجاً یحتمل ان المراد	سراج منیر کے معنی میں دونوں احتمال ہیں
بالسراج الشمس وهو ظاہر	ایک یہ کہ سراج سے مراد آفتاب ہو اور
ویحتمل ان المراد بہ المصباح	ظاہر یہی ہے اور دوسرے یہ کہ اس

مراد چراغ ہو۔

بیضاوی کے محشی نے بھی آیت میں دونوں احتمالوں کا ذکر کیا ہے کہا کہ
 وهو الشمس لقوله تعالى
 وجعل الشمس سراجاً والمصباح
 (سراج منیر جس سے روشنی حاصل کی جاتی
 ہے) یا تو اس سے مراد آفتاب ہے
 کیونکہ قرآن نے آفتاب ہی کو سراج کہا
 ہے اور یا چراغ مراد ہو۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی مشہور و مقبول تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قوله وسراجاً منيراً ای
 وامرک ظاہر فیما جئت به
 من الحق كالشمس فی اشراقها
 واضاءتھا لا یجحدھا الا معاند
 (تفسیر ابن کثیر مصری)
 (سورہ احزاب ص ۵۳)

سراج منیر کے معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر تمہارا
 معاملہ تمہاری لائی ہوئی شریعت کے بارہ
 میں ایسا نمایاں اور واضح ہے یعنی تم
 اپنے امر میں ایسے روشن اور کھلے ہوئے
 ہو جیسے سورج اپنی چمک دمک میں نمایاں
 ہوتا ہے کہ معاند کے سوا کوئی اس کا

انکار نہیں کر سکتا۔

بہر حال تفسیروں کا رخ اس بارہ میں واضح ہے کہ سراج سے سورج بھی مراد لیا
 جا سکتا ہے اور لیا گیا ہے چنانچہ ابن کثیر نے احتمال کے طور پر نہیں بلکہ تعین کے
 ساتھ واضح کر دیا۔ یہاں سراج سے سورج ہی مراد ہے اس لئے لغت اور تفسیر
 دونوں اس پر متفق ہیں کہ یہاں سراج سے آفتاب مراد لیا جانا لغت اور تفسیر دونوں
 کے لحاظ سے درست اور صحیح ہے۔

لغت اور تفسیر کے علاوہ اگر عین قرآن پر نظر کی جائے تو اس سے تو نمایاں طور
 پر واضح ہوتا ہے کہ یہاں سراج منیر کے معنی آفتاب ہی کے لئے گئے ہیں اور ذات
 بابرکات نبوی کو آفتاب ہی ثابت کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں
 سراج لقب ہی آفتاب کا ہے اور اس سے سورج ہی مراد لیا جانا چاہیے جیسا

کہ قرآنی تعبیر میں چاند کا لقب نور ہے اور اس سے چاند ہی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ نوح میں چاند کو نور اور سورج کو سراج فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۝
اور ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔

بلکہ قرآن کے عرف میں سورج کا یہ لقب (سراج) اس قدر معروف اور متعین ہے کہ اگر سورج کا نام لئے بغیر ہی سراج کا ذکر کر دیا جائے تو اس سے سورج کے سوا کوئی اور شے مراد ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سورہ فرقان میں چاند کو منیر فرما کر اسکے مقابل سورج کا صرف یہ لقب (سراج) ہی ذکر کر دیا جانا کافی سمجھا گیا ہے۔ جس سے خود بخود سورج ہی ذہنوں میں آجاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا ۝

اس آیت سے تو یہ واضح ہوا کہ قرآنی عرف میں سراج آفتاب ہی کا لقب ہے اور قرآن کی اصطلاح میں سراج آفتاب ہی کو کہتے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ ایک طرف تو قرآن نے سورج کا مخصوص لقب سراج بتلایا ہے اور ادھر قرآن ہی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سراج فرمایا ہے۔ جیسا کہ آیت و سراجاً منیراً سے واضح ہے، تو لقب کی اس وحدت سے کہ سورج بھی سراج ہے اور حضور بھی سراج ہیں اور سراج کے معنی قرآنی عرف میں آفتاب کے ہیں۔ حضور کا آفتاب ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جانا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر سورج کا مخصوص لقب سراج ہے اور وہی سراج حضور کا بھی لقب ہے تو قرآنی اصطلاح کے مطابق حضور آفتاب ثابت ہوئے جو تشبیہ کا حاصل ہے اور خلاصہ یہ نکل آیا کہ اگر سورج فلکی آفتاب ہے تو حضور علی آفتاب ہیں وہ افقِ آسمان سے طلوع کرتا ہے تو یہ افقِ زمین سے جس سے اس تثیل کی نوعیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ الحاصل اولاً لغت سے پھر تفسیر سے اور پھر عین قرآن سے ثابت ہوا کہ سراج منیر میں سراج کے معنی آفتاب کے ہیں اور یہاں اس کا مصداق ذاتِ بابرکات نبوی ہے تو حضور کی ذاتِ اقدس بلحاظ لغت و تفسیر و قرآن آفتاب ثابت ہوئی، اور

نمایاں ہو گیا کہ اس آیت میں حضور کو آفتاب سے تشبیہ دینی مقصود ہے جو ہمارا مدعا تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس تشبیہ کی رو سے سیرت نبوی کے مقامات پر روشنی ڈالیں ایک اور شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ تشبیہ کے اس سلسلہ سے شاید کسی کو ذات بابرکات نبوی اور سورج میں مساوات اور برابری کا شبہ گزرے اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ شاید یہ مادی سورج اور وہ روحانی سورج برابر کے درجے کے ہوں گے یا بلاغت کے بعض استعمالات دیکھ کر کسی کو یہ وہم بھی پیدا ہو جائے کہ سلسلہ تشبیہ میں جس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

وہ اکثر اس سے افضل ہوتا ہے جسے تشبیہ دی جا رہی ہو تو چاہیے کہ سورج معاذ اللہ حضور سے افضل ہو، جبکہ حضور کو سورج سے تشبیہ دی جا رہی ہے ناہر ہے کہ اس صورت میں حضور کی فضیلت تو کیا ثابت ہوتی جو مقصود تھی اور الٹی سورج کی فضیلت ثابت ہو جائے گی جو خلاف مقصد اور موضوع کے الٹ ہو جانے کے ساتھ ساتھ خلاف واقعہ بھی ہے۔ جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس تشبیہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں آفتابوں کے مخصوص القاب ذکر فرما کر ان دونوں کی نوعیتوں کو الگ الگ نمایاں کر دیا ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ مشخص اور واضح ہو جائے اور کسی کو حضور کی نسبت سے سورج کی افضلیت یا مساوات کا دھوکہ نہ ہو۔ چنانچہ اس مادی سورج کی صفت تو قرآن نے ولج ذکر فرمائی۔

وَبَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شَدَادًا
جَعَلْنَا سِرَاجًا وَجَاهًا
اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات
مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے
ایک روشن چراغ بنایا۔

وہج کے معنی لغت عرب میں نور مع الحرات کے ہیں جو چیز روشن بھی ہو اور گرم بھی ہو۔ اُسے وہج کہیں گے اور جس میں بہت زیادہ روشنی اور بہت زیادہ گرمی ہو۔ اُسے مبالغہ کے ساتھ وناج کہیں گے۔ پس سورج جس طرح بے حد روشن

ہے کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھیر سکتی۔ اسی طرح بے حد گرم بھی ہے کہ اس کے نیچے زیادہ دیر تک یہ نگاہ والے بھی نہیں ٹھیر سکتے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سورج ناریت لئے ہوئے ہے اور آگ کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ آگ ہی کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ روشن بھی ہو اور گرم بھی ہو۔ اس لئے یہ مادی آفتاب نار ہی سیارہ معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے درج کے لفظ سے اس کی توصیف کی گئی۔

لیکن آفتاب نبوت کو حق تعالیٰ نے سراج فرما کر اس کا لقب دبا ج کے بجائے منیر ذکر فرمایا جو چاند کی شان ہے۔ چنانچہ چاند کو قرآن نے منیر اور نور فرمایا ہے۔ (وَقَمراً منیراً اور والقمر نوراً) جس میں روشنی کے ساتھ ٹھنڈک بھی ملی ہوئی ہے اس لئے منیر کے معنی ٹھنڈی روشنی والے کے ہوئے اور ثابت ہوا کہ اس آفتاب روحانی (ذات نبوی) میں روشنی تو سورج کی سی ہے جس میں چاند کا سادھما پن نہیں کہ ظلمتِ شب کا فور نہ ہو سکے۔ مگر ٹھنڈک چاند کی سی ہے۔۔۔۔۔ جس میں سورج کی سی سوزش اور تپش نہیں کہ اذیت دہ ثابت ہو جس کا حاصل یہ نکلا کہ مادی سورج نار ہے اور روحانی سورج نور۔ اس سے دونوں آفتابوں کی روشنی اور نورانیت کی نوعیتوں کا فرق واضح ہو گیا کہ ایک نار ہی ہے اور ایک نوری۔

ساتھ ہی ان دونوں آفتابوں کی اصلیت کا فرق بھی اسی سے کھل جاتا ہے اور وہ یہ کہ مادی سورج چونکہ ناریت لئے ہوئے ہے اور نار کا مخزن جہنم ہے چنانچہ اس کی ہر چیز آتشین اور ایذا دہ ہے۔ اس کے پانی کو حمیم (کھوٹا ہوا) کہا گیا۔ اس کے باتشندوں کے جھلے ہوئے چہروں کو کولہ سے تشبیہ دی گئی اور اس کی آگ کی انتہائی تیزی کی وجہ سے اس کے رنگ کو سیاہ بتلایا گیا۔ اس کی لپٹوں کی شدت و حرارت کی بنا پر خود آپس میں ان کا ایک دوسرے کو جلا لے رہنا اور ایذا دہ ہونا ظاہر کیا گیا۔ اس کے ملائکہ کو غضب مجسم ہونا ظاہر کیا گیا اور غضب جو آگ ہی کا ٹکڑا ہے۔ اس کے سانپ بچھوؤں کے زہر کی انتہائی حرارت ظاہر کی گئی۔ جو خود آتشیں حصہ ہے۔ عرض جہنم آگ ہے تو اس کی ہر چیز آگ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ

اس آگ سے سورج کو جہنم سے مناسبت ہو بلکہ حرارت و سوزش میں وہ جہنم کا ناسندہ ہو کہ جہنم کی گرمی اور آگ جذب کر کے دنیا پر پھینکتا ہو جیسے آتشی شیشہ سورج کی حرارت جذب کر کے کاغذ اور کپڑے کو پھونک دیتا ہے۔ جس سے اس ناری سورج کی اصل جہنم ثابت ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے کل شئی ریح الی اصلہ (ہر شے اپنی اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے) کے اصول پر قیامت کے دن جب حساب کتاب ہو چکے گا تو چاند سورج کے یہ عظیم الشان کرتے اور بھاری بھاری گول اجسام جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ گویا وہیں پہنچا دیئے جائیں گے۔ جہاں سے ان کا نشوونما اور وجود تھا۔

بخلاف روحانی آفتاب کے کہ وہ نارایت کے بجائے نورانیت کا پیکر ہے۔ جس میں روشنی کے ساتھ ٹھنڈک اور سلامتی ہے اور ظاہر ہے کہ نور و سلامتی کا مخزن جنت ہے۔ چنانچہ جنت کی ہر ہر چیز میں راحت و نورانیت ثابت ہے اس کے باشندوں کے چہروں کو چمک دمک سے تشبیہ دی گئی۔ اوپر کی جنتوں کے باشندوں کو چمکدار ستاروں کی صورت میں نظر پڑنے کی خبر دی گئی۔ جب وہ نیچے والوں کو نظر پڑیں۔ وہاں کے محلات اور بیٹھنے کے ممبروں کو نور سے بنا ہوا کہا گیا۔ وہاں کی عورتوں کی پنڈلیاں شفافی اور چمک میں مثل شیشہ کے بتائی گئیں۔ جن میں آراہ کی چیزیں نظر آجائیں۔ وہاں کے درو دیوار مثل شیشہ کے فرمائے گئے۔ جن سے اندر باہر کی چیزیں نظر پڑیں گی۔ وہاں کے پانی کو برف سے زیادہ براق اور ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ شیرا بتایا گیا۔ وہاں کی روشنی کو نور عرش کی روشنی کہا گیا۔ عرض جنت نور و سلامتی ہے تو اس کی ہر ہر چیز میں نور و سلامتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس نور و سلامتی کے سورج کو اس نورانی ٹھنڈک میں جس کی معنوی صورت رحمت و رافت ہے۔ جنت ہی سے مناسبت ہو۔ بلکہ یہ آفتاب اس کا ناسندہ ہو کہ وہاں سے نور و سلامتی جذب کرتا ہو اور دنیا پر پھینکتا ہو۔ چنانچہ آپ کے جسم مبارک جمال مبارک اور حقیقت پاک سب ہی میں نورانیت اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ بات کرتے وقت بنص حدیث آپ کے دانتوں سے نور چھتا ہوا نظر آتا۔ بینی مبارک (ناک) کا فور کی وجہ سے بلند محسوس ہونا

چہرہ مبارک کا چمک دمک میں سورج جیسا محسوس ہونا۔ نبص حدیث کان الشمس تجری فی وجہہ (گویا) آفتاب آپ کے چہرے میں گھوم رہا ہے) چودھویں رات کے چاند سے چہرہ مبارک کا مقابلہ کر کے صحابہ کا چہرے کے نور کو چاند پر فوقیت دینا اور حقیقت محمدی کو حدیث میں نور کہا جانا سب اسی کے علامات و آثار ہیں کہ یہ روحانی آفتاب ان انوار کے ہجوم کی وجہ سے اسی مخزن نور (جنت) سے مناسبت رکھتا ہے۔ نہ کہ جہنم سے۔ پس جیسے مادی سورج جہنم کے حق میں ایک بیٹری کی شان لئے ہوئے تھا۔ جو اس کی حرارت کو جذب کر کے دنیا پر پھینکتا تھا۔ ایسے ہی یہ روحانی سورج جنت و عرش کے حق میں بیٹری کی صورت ہو گا۔ جو ہمہ وقت اس کے نور کو جذب کر کے دنیا پر پھینک رہا ہو گا۔

شاید اس لئے کل شئی یرجع الی اصلہ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے اصول پر یہ آفتاب نبوت (حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم) ہمہ وقت جنت ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ اسی کی طرف بھٹکتے ہیں۔ اسی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اسی کا جغرافیہ اور تاریخ بیان فرماتے ہیں۔ اسی کی دعا مانگتے ہیں۔ اسی میں پہنچانے والے اعمال مانگتے ہیں اور کرتے ہیں۔

اس بنا پر قرآن حکیم نے مادی سورج کو سراج و مانج فرمایا۔ جو روشنی و گرمی کا مجموعہ ہے اور روحانی سورج کو سراج منیر فرمایا۔ جو روشنی و ٹھنڈک کا مجموعہ ہے۔ وہ اگر وہابیت سے اشیاء کو سوخت کرتا ہے تو یہ منیریت سے انہیں حد کمال کو پہنچاتا ہے۔ اُس کے سوز و تپش سے اگر مختلف اوقات میں اس سے میزاری پیدا ہوتی ہے تو اسکی نورانی ٹھنڈک سے ہمہ وقت عشق و محبت بڑھتا ہے۔ اُس میں اگر واقعیت کی شان ہے تو اس میں جاذبیت کی ہے۔ وہاں جلاؤ ہوتا ہے۔ تو وہاں بچھاؤ۔ وہاں دل و جان جلتے ہیں تو وہاں دل و جان کو زندگی ملتی ہے۔ اُس کے نیچے اگر بدن سیاہ پڑتا ہے تو اس کے زیر سایہ بدن منور ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن نے اگر مادی سورج سے اپنے روحانی سورج کو مخصوص صفات میں تشبیہ دی تو یہ اتمہ ہی وہابیت اور منیر کے اوصاف ذکر

فرما کر ان میں فرق بھی واضح کر دیا۔ آسمان کا سورج تو نار اللہ الموقدۃ سے تربیت یافتہ ہو کر ناری ہے اور یہ زمین کا سورج نورا السموات والارض سے تربیت یافتہ ہو کر نوری ہے۔ ایک جہنم سے والبتہ ہے اور ایک جنت وعرش سے تاکرا اس تشبیہ سے کسی کو ان دونوں آفتابوں میں یکسانی کا شبہ بھی نہ گزرے۔ چہ چائیکہ مادی سورج کی افضلیت کا اور سمجھنے والے سمجھ لیں کہ یہ فلکی سورج سورج تو ہے مگر اس ملکی سورج کے مقابلہ میں چراغ مردہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

چراغ مردہ کجا، نور آفتاب کجا،

تاہم پھر بھی اگر حضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام خاتمت اور شتون نبوة کو کسی مثال سے کھرا جاسکتا ہے تو وہ مثال صرف سورج ہی کی تھی۔ اس لئے باوجود اس فرق کے اُسے ہی اس تمثیل کے لئے اختیار بھی کیا گیا۔

یہ تمثیل آفتاب اور چراغ سے مرکب کیوں ہے؟

تاہم یہاں یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اگر حضور کو سورج ہی سے تشبیہ دینی مقصود تھی تو شمس کا لفظ چھوڑ کر سراج ہی کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ بظاہر تشبیہ کی سیدھی عبارت یہ تھی کہ وشمًا منیرًا (اور آپ چمکتے ہوئے سورج ہیں) نہ یہ کہ آپ کو سراجا منیر یعنی روشن چراغ کہہ کر پھر روشن چراغ سے سورج مراد لیا جائے۔ پس اس میں کیا مصلحت ہے۔ کہ تشبیہ دینے میں عنوان تو چراغ کا اختیار کیا جائے اور مراد اس سے سورج لیا جائیگا۔ جواباً عرض ہے کہ مقصود تو حضور کو آفتاب ہی سے تشبیہ دینا ہے تاکہ تمام مقامات نبوت پر سورج کے حتی مقامات سے پوری روشنی پڑ جائے لیکن عنوان چراغ کا اس لئے اختیار کیا گیا کہ چراغ میں ایک خاص وصف ہے جو سورج اور چاند میں نہیں اور وہ یہ ہے کہ سورج سے دوسرا سورج نہیں بن سکتا مگر ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہو سکتا ہے۔ پس سورج سے تو اس لئے تشبیہ دی کہ چمک دک اور دوسری خصوصیات میں آپ کی یکسانی واضح ہو جائے۔ جیسے سورج کو تمام روشن اجسام میں اپنی

ذات و صفات کے لحاظ سے یکتائی اور بے نظیری حاصل ہے مگر اس سورج کو چراغ کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ آپ کے کمالات تربیت و تاثیر سے آپ کی نمونہ سازی کا کمال بھی کمال جلتے کر آپ نے اپنے رنگ اور اپنے ڈھنگ کے لاکھوں نمونے تیار کر دیئے۔ جیسے ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ آپ کے مابعد کے تربیت یافتہ لوگ بنی تو نہیں بن سکتے کہ نبوت مکمل و مختتم ہو چکی تھی مگر انوار نبوت کے امین اور حامل ضرور بن گئے۔ جن کو بنی تو نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن انداز حیات و درجہ بدرجہ کا لنبی یعنی مانند نبی ضرور کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ خود حضور ہی نے ارشاد فرمایا۔

علماء امتی کا نبیاء میری امت کے علماء (ربانی) انبیاء بنی
بنی اسرائیل : اسرائیل کی مثل ہیں۔

چنانچہ انبیاء پر اگر وحی آئی تو ان ربانیوں کو الہام ہوا۔ اگر انبیاء کو غیبی امور کا مشاہدہ ہوا تو ان مقدسین کو کشف ہوا۔ اگر انبیاء کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہو تو ان بزرگوں کے ہاتھ پر کرامتوں کا ظہور ہوا۔ اگر انبیاء نے اپنے اپنے پر دشاہ خطوں اور منطوقوں کو علم و اخلا سے رنگ دیا تو ان کاملین میں سے بھی جو جہاں بیٹھ گیا۔ اس خطہ کو اصلاح و رشد سے بھر دیا اور اتقیا کی جماعتیں کی جماعتیں تیار کر دیں اور اگر انبیاء نے غیبی خبریں دس تو ان اولیاء نے کتنے ہی مخفی جہانوں کے پتے دیئے۔ غرض یہ اولیاء و اتقیاء اور ربانی افراد صحابہ سے لے کر تا ختم دنیا بنی تو نہیں ہوئے۔ مگر بہ تعمیل و تربیت نبوی مثل انبیاء ضرور کہلائے پس سورج روشن تو لاکھوں اشیا کو تیار کر دیتا ہے۔ مگر اپنے جیسا نمونہ تیار نہیں کر سکتا۔ لیکن حضور جہاں آفتاب ہیں کہ ان گنت دلوں کو آپ سے روشنی ملی۔ وہیں چراغ بھی ہیں کہ اپنے بعد لاکھوں نمونے تیار فرما دیئے۔ جو نبوت تک اگر نہیں پہنچ سکے تو کمالات نبوت کے امین ضرور بن گئے اور نبوت کی روشنی ان کے ہر قول و فعل سے پھنی اور نمایاں ہوئی۔

پس اس مرکب تشبیہ سے آپ کے تین وصف ثابت کرنے منظور تھے ایک

یہ کہ آپ اپنی ذات سے روشن تر ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ دوسروں کو روشن فرما رہے ہیں (یہ دو وصف تو دونوں میں مشترک تھے) اور تیسرے یہ کہ آپ اپنی ضیا، باری کے اپنے جیسے روشن ہونے بھی بنانے والے ہیں۔ یہی وہ وصف ہے، جو سورج میں نہیں۔ صرف چراغ میں پایا جاتا ہے، اس لئے اس وصف خاص کو تو چراغ کے لفظ سے واضح کیا گیا، جو سورج سے نہیں کھل سکتا اور بقیہ اوصاف نبوت کو سورج کے لفظ سے کھولا گیا، جو سراج کے لفظ سے نہیں کھل سکتے تھے، اس لئے سراج بولا گیا اور سورج مراد لیا گیا، یعنی لفظوں میں تو تشبیہ چراغ سے دی گئی اور معنوں میں تشبیہ سورج سے دی گئی تاکہ اس مرکب تشبیہ سے حضور کے تینوں اوصاف نبوت پر روشنی پڑ جائے۔

وجہ شبہ اور مقامات نبوت و سیرت

آفتاب میں نزاروں شائیں اور صفات ہیں۔ اگر ان کو ایک ایک کر کے جمع کیا جائے، جو ذہن میں خطوط کر رہی ہیں تو یہ مضمون ایک ضخیم جلد ہو جائے اور پھیل کر قابو میں نہ رہے، اس لئے صرف بنیادی شباہتیں اختیار کر کے ان سے بنیادی ہی مقامات سیرت و نبوت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سینکڑوں شباہتوں میں سے صرف چند بنیادی شباہتیں بطور مثال کے اختیار کی گئی ہیں۔ مقصود ذکر رسول کی برکت حاصل کرنا اور مقامات سیرت کو اس نقیض کے سلسلے سے قرآن سے نکلتا ہوا دکھلانا ہے، احاطہ صفات مقصود نہیں اور نہ وہ بات اپنے بس کی ہے۔

روحانی آفتاب کی ضرورت

اس شبہ سے ابتدائی طور پر جو بات واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ اگر آدمی کائنات کے لئے ایک جسمانی سورج کی ضرورت ہے اور بلاشبہ ہے تو معنوی اور روحانی کائنات کیلئے بھی ایسا روحانی سورج ناگزیر ہے، جیسے حق تعالیٰ نے اس جسمانی کائنات کے

کے لئے ایک مادی آفتاب بنایا۔ جس سے زمین و زمان روشن ہیں۔ ایسے ہی اس نے ایک روحانی آفتاب ذاتِ باہرکاتِ ہومی بھی بنایا۔ جس سے کون و مکان روشن ہیں۔ وہ اجسام کو منور کرتا ہے یہ ارواح کو، وہ صورتوں کو نمایاں کرتا ہے یہ حقائق کو۔ وہ طبیعتوں کو ابھارتا ہے یہ عقلوں اور فطرتوں کو، اس کی کارگزاری حیات میں ہے۔ اور اس کی معنویات میں جس سے حیات بھی بے مہرہ نہیں رہیں، غرض مادی عالم کی طرح روحانی عالم کے لئے بھی ایک آفتاب کا وجود ضروری ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ حیات اور جسمانیات جہاں بغیر حرارت کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کے حق میں حرارتِ عزیزہ ہی بمنزلہ روح ہے۔ اگر وہ نہ رہے تو یہ عالم ناسوت یا مادی عالم بھی نہ رہے۔ جمادات، نباتات اور جانداروں میں انسان سے لے کر ایک حقیر ترین کیڑے مکوڑے تک کی زندگی کا جزو اعظم حرارت ہے۔ مثلاً اگر بدن میں حرارت اور گرمی نہ ہو تو جسمانی اشیاء باقی نہیں رہ سکتیں۔ نہیں بلکہ اگر اس پوری دنیا اور اس کے اجزا میں سے حرارت کھینچ کر نکال لی جائے تو ساری کائنات برفانی ہو کر جم جائے، جماد محض رہ جائے اور اس میں نقل و حرکت کی سکت نہ رہے۔ جو زندگی کی ابتدائی علامت ہے۔ پس کائنات کے لئے حرارت بمنزلہ روح کے ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس گرمی اور گرمی روح کا سرچشمہ آفتاب کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں کہ اس سے سب کو حرارت کا فیض پہنچتا ہے۔ حتیٰ کہ خود حرارت کے جس قدر وسائل دنیا میں آگ پھیلا رہے ہیں۔ وہ بھی سب کے سب آفتاب ہی سے فیض پا کر آتیش بنے ہوئے ہیں۔ تا آنکہ خود آتش شعلہ بار بھی اپنی گرمی و تیزی میں اسی آتشی کرہ کی محتاج اور اس سے مستفید ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو چھماق سے آگ برآمد نہ ہو، اگر آفتاب نہ ہو تو سارے پتھر اور گوتھنڈے پڑ جائیں اور ان کے ٹکراؤ سے کبھی آگ کی چنگاریاں نہ نکل سکیں۔ اگر سارے آتش گیر مادے ہمہ وقت سمندر میں بھیگے ہوئے چھوڑ دیئے جائیں جنہیں آفتاب کی گرمی نہ چھو سکے تو وہ گل گل کر جھڑ جائیں اور ان کی رگڑ سے کبھی آگ نہ اُبھرے۔ سمندروں پر اگر سورج کی دھوپ نہ پڑے تو وہ برفانی پہاڑ بن جائیں۔ ان کے بارے

جاندار مر جائیں۔ ان کے سارے ماسون منقطع ہو جائیں اور عالم کو پانی کا بھی ایک قطرہ نہ مل سکے۔ اگر کھیتوں پر سورج اپنا نورانی سایہ اور آتشیں اثر نہ ڈالے تو ایک دانہ بھی نہیں پک سکتا اور دنیا دانہ دانہ سے محروم ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جائے۔ اگر سورج کی روشنی اور تاثیر گرمی سورج پر نہ پڑے تو اس میں بجلی باقی نہ رہے۔ جو آگ پانی کے حق میں روح بقا ہے۔ پھر خود یہ انسان جو اس کائنات کا چشم و چراغ ہے۔ اسی آفتاب کی حرارت ہی کی بدولت سطح زمین پر ٹکا ہوا ہے۔ اس میں سے حرارت عزیز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جب ہی وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مٹی پانی اور ہوا بھی اس میں بدستور موجود اور اس کی لاش میں بحالہ قائم ہیں۔ مگر اس کو زندہ انسان نہیں کہہ سکتے۔ پھر زندگی ہی نہیں۔ زندگی کے عوارض صحت، قوت، امنگ، حوصلہ، ہمت وغیرہ بھی اسی حرارت کے بل بوتے پر قائم ہیں۔ طلوع آفتاب کے وقت طبائع میں ابھار ہوتا ہے۔ جاں بلب مریض تک کی طبیعت میں جان محسوس ہونے لگتی ہے اور امنگ اور حیات تازہ دوڑتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن دن ڈھلنے اور بالخصوص غروب آفتاب کے بعد طبیعتوں میں پستی ٹھکن اور ماندگی محسوس ہونے لگتی ہے کہ آفتاب سے جب پورا بعد ہو جاتا ہے اور نور آفتاب منقطع ہو جانے سے ظلمت شب دنیا پر چھا جاتی ہے، تو یہی ٹھکے ماندے جاندار زندگی عارضی موت کا شکار ہو جاتے۔ پھر جوں ہی طلوع آفتاب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ تو یہی ان میں بعث بعد الموت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مردے خواب استراحت سے اٹھنے لگتے ہیں اور دنیا کے میدانوں میں حشر و نشر کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ غرض جماد، نبات، حیوان، انسان، عناصر اور مواد کی مادی زندگی حرارت غریزی پر موقوف ہے اور حرارت کا منبع آفتاب ہے۔ اس لئے تمام مادیات کی جسمانی زندگی آفتاب کے وجود کے تابع نکلتی ہے۔ اس لئے فطرت اللہ کا تقاضا ہوا کہ اس ناسوتی عالم کو ایک آفتاب دیا جائے۔ جو اس کی مادی زندگی کا کفیل ہو۔

ٹھیک اسی طرح باشعور کائنات کی روحانی زندگی اور روح کے احوال و مقامات کی بود و نمود بھی حرارت ایمانی اور گرمی عشقِ خداوندی سے قائم ہے۔ جس کا نام ایمان

سے۔ علم، اخلاق، معرفت، اعمال، مقامات، قلبی واردات اور وصول و قبول کی گرم بازار میں اسی ایمانی گرمی سے قائم ہے۔ جس حد تک ایمان اور گرمی عشق ہے۔ اسی حد تک دینی حیت، مذہبی غیرت، مجاہدہ و جہاد فی سبیل اللہ کا جوش و خروش ابھرتا ہے۔ اگر ایمان کی حرارت باقی نہ رہے تو یہ نام روحانی کمالات و مقامات ختم ہو کر انسان صرف جاد و نبات یا حیوان یا محض ایک انسانی میکل ہو کر رہ جائے۔ جس میں جان کا سوال نہیں۔ اس حرارت ایمانی کے جوش سے معاملات دنیا میں امن و امان، سلم و سلامتی مہر و وفا، ایثار و ہمدردی کے مظاہرے قائم ہیں۔ اگر یہ حرارت یہ اللہ اللہ کا جوش و خروش اور یہ اندونی عشق و محبت سے آتش شوق دلوں میں بھڑکی ہوئی نہ ہو تو نفس اور ہوائے نفس کی تخریبی کاروائیاں نفس اور آفاق کے سکون و اطمینان کو بھسم کر ڈالیں۔ مہر حال اسی محبت خداوندی کی آگ ہر ماسوا اللہ کو سوخت کر کے ماسوائی سے انسانوں کو بے نیاز بناتی ہے۔ جس سے نفسانی جھگڑے اور شہوانی تنازع ختم ہوتے ہیں اور دنیا امن چین کا سانس لینے کے قابل ہوتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس ایمانی حرارت اور گرمی عشق خداوندی کے سرچشمے انبیاء علیہم السلام ہیں اور خود ان کی ایمانی گرمی کا واحد سرچشمہ ذات بابرکات نبوی ہے۔ کیونکہ آپ خاتم النبوت ہیں۔ جس کے فیض سے انبیاء و ائم کو یہ روحانی حرارت عزیز ملی ہے۔ پس اور انبیاء اگر نجوم نبوت ہیں تو آپ آفتاب نبوت ہیں۔ اس لئے اگلوں اور پچھلوں کی ایمانی اور احسانی آب و تاب اور روشنی و گرمی کا سرچشمہ آفتاب نبوت ہے۔ جس سے پورے عالم روحانیت کی گرمی اور گرم بازار میں اور دوسرے نفظوں میں روحانی زندگی قائم ہے۔ اور بلکہ پورے عالم روحانیت کی گرمی اور گرم بازار میں اور روحانی زندگی آفتاب نبوت ہی سے ممکن و وابستہ تھی تو فطرت اللہ کا تقاضا یہ ہوا کہ مادی کائنات کی طرح وہ روحانی کائنات کو بھی ایک آفتاب، روحانی بخشنے، جو روحانی عالم کی زندگی کا کفیل ہو۔ پس اگر مادی کائنات کو اپنی بقا کے لئے ایک مادی آفتاب کی ضرورت تھی تو روحانی کائنات کو بھی اپنی بقا و حیات کے لئے ایک روحانی آفتاب تھی اور وہ ذات بابرکات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

داعیاً الحی اللہ باذنہ وبراہاً اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے
 منیراً ۛ
 غرض اس تشبیہ سے اولاً ضرورت نبوت اور ضرورت ختم نبوت ثابت ہوئی جو
 آفتاب نبوت ہی سے وابستہ تھی اور سراجا منیرا کا یہ پہلا مقام ہے جس سے
 سیرت نبوت کا ابتدائی مقام (ضرورت سیرت نبوت) نمایاں ہوا۔ وداعیاً الحی اللہ
 باذنہ و سراجا منیراً ۛ

فلک آفتاب

مگر جس طرح مادی آفتاب کے لئے ایک مدار اور ایک محور ضروری ہے جس پر
 وہ حرکت کرے اور وہ فلک ہے۔ ایسے ہی روحانی آفتاب کے لئے بھی ایک محور (جائے
 گردش ناگزیر ہے جس پر اس کی نقل و حرکت ہو، فرق ہوگا تو صرف یہ کہ مادی سورج کا
 فلک بھی مادی ہوگا جو حسی نگاہوں کے سامنے آسکے گا اور روحانی آفتاب کا فلک روحانی
 ہوگا جو دل کی نگاہ کے سامنے آئے گا اور سب جانتے ہیں کہ روحانیت کا سرچشمہ نبوت
 ہے۔ اس لئے اس روحانیت کے آفتاب کے فلک کو آسمان نبوت کہا جائے گا اور
 انبیاء علیہم السلام کو اس آسمان پر چکنے والے تارے جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں۔ اس لئے اس آفتاب روحانی کی نقل و حرکت اسی آسمان
 نبوت پر ہوگی۔ نبوت کے مقامات گویا اس آسمان کے بروج ہوں گے۔ جن میں آفتاب
 نبوت کی نقل و حرکت ہوگی اور ان بروج کے خاص خاص آثار ہوں گے۔ جو کائنات پر
 پڑتے ہوں گے۔ بہر حال آفتاب نبوت آسمان نبوت پر سے اور اس کا طلوع و غروب
 اور عروج و نزول اسی آسمان پر ہوتا ہے۔

شب تار اور سامان روشنی

سب جانتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے کی حالت یہی ہوتی کہ ابتداً شب

میں آسمان کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا رہتا ہے۔ زمین تاریک ہوتی ہے۔ رات کا وہی سب دیوانی بھیاںک شکل کے ساتھ پورمی دنیا پر مسلط ہوتا ہے۔ کام کاج تقریباً معطل رہتے ہیں اور ہر جاندار اپنے گھر اور اپنے ٹھکانے کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ لوگ کچھ روشنیوں کا بندوبست بھی کرتے ہیں اور کسی حد تک ابتداء شب میں کام بھی چلاتے ہیں۔ لیکن اول تو یہ محدود اور مصنوعی روشنیاں ہمہ گیر نہیں ہوتیں کہ ہر جگہ کام دیں یا ہر جگہ میسر آجائیں۔ شہروں میں اگر کچھ جگہ گاڑے ہوئے ہیں تو وہ بہت تاریک پڑتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں بھی کچھ ٹمٹماتے ہوئے دیئے چلتے نظر پڑ جاتے ہیں تو یہ ناممکن ہوتا ہوتا ہے کہ پورے جنگلات ان سے روشن ہو جائیں اور کھیت کیاری کا کام اس روشنی میں انجام پاتا رہے اور اگر محدود مقامات پر کچھ روشنی ہوتی بھی ہے تو وہ مکمل نہیں ہوتی کہ دل و دماغ کی ٹھکن اور ماندگی کی تاریکی کو دور کر دے اور اس میں امنگ اور حیات لڑکی وہی روح دوڑا دے۔ جو دن کی روشنی سے دوڑتی ہے۔ بہر حال کوئی بھی مصنوعی روشنی نہ تو مکمل ہوتی ہے۔ نہ ہمہ گیر کہ رات کی تاریکی اور اسکے طبعی اثرات کا پورا پورا مقابلہ کر جائے۔ اس طرح یہ شب دیکھو کہ اندھیریاں فوج در فوج پہنچ کر کائنات کے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہیں اور حسی تاریکی اور غفلت و نیند کی تاریکی چھائی رہتی ہے۔ جس سے لوگ معطل ہو کر چارپائیوں پر دراز ہو جاتے ہیں اور دنیا زندوں کا قبرستان بن جاتی ہے۔

مگر جب ظلماتی پردے انتہائی غلیظ ہو جاتے ہیں اور مصنوعی روشنیاں ان کے زائل کرنے میں بے اثر ثابت ہوتی ہیں تو حق تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ اور قدرت بالغہ سے رات کے مناسب حال خود روشنی کا بندوبست فرماتے ہیں اور تدریجی طور پر آسمان کی فضا میں ستارے نمودار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک نکلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک پیالے ستاروں پر ستارے ہجوم کر کے پورے آسمان کو گھیر لیتے ہیں۔ اور طلوع سیارات کے اس تسلسل سے پورا آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ جس سے شب تاریکی اندھیری کی وہ شدت باقی نہیں رہتی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، بلکہ ایک حد تک دنیا کی پوری فضا، شہروں کی ہو یا دیہات کی جنگلوں کی ہو یا دریاؤں کی یکسانی کے ساتھ

ہلکی ہلکی روشنی میں آجاتی ہے۔

نجومِ ہدایت کا طلوع

ٹھیک اسی طرح آسمانِ نبوت کے نیچے روحانیت کی زمین اور دلوں کے گوشے جب کہ جہل و ظلم کی تاریکیوں میں گھبرے ہوئے تھے اور اس ظلم و جہول انسان کو اس کی جبلت کی شہوانی تاریکیوں اور شبہات کی ظلمتوں نے گھیر رکھا تھا۔ نفسِ امارہ اور شیاطین کا اس کی خلقت پر پورا پورا تسلط تھا تو خود اسے بھی اپنی روشنی کی فکر تھی۔ اس نے ان ظلمتوں میں راہ طے کرنے کے لئے عقل کی قندیلوں سے کام کیا۔ فہم کی بجلی کے ققمے اپنے انفسی جہان میں روشن کئے۔ فلسفیت کی مصنوعی لالٹینوں سے کچھ کام چلایا۔ مگر عقل و فہم اور فلسفہ کے ٹٹاتے ہوئے چراغوں کی روشنی اول تو مکمل نہ تھی کہ دنیا کے ساتھ آخرت اور حیاتی زندگی کے ساتھ آخرت کی معنوی زندگی کی منزلیں بھی طے کرادیتی اور کسی حد تک یہ ممکن بھی ہوتا اور مخصوص نفوسِ سیر اس راستے سے کچھ قطع منازل بھی کرتے تو اس روشنی میں روحوں کی حیات اور عشقِ الہی کی گرمی نہ تھی۔ کہ وہ دلوں میں امنگ اور روحوں میں تڑپ بھی پیدا کر دیتی۔ عرضِ عقول کی روشنی کا بندہ فرمایا اور آسمانِ نبوت پر رنگ رنگ کے ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے۔ سب سے پہلا ستارا آدم علیہ السلام کا طلوع ہوا۔ پھر شیث آئے۔ پھر ادریس آئے۔ پھر نوح آئے۔ پھر ہود و صالح آئے۔ پھر ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ آئے۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام، یہاں تک کہ آسمانی ستاروں کی طرح آسمانِ نبوت پر پاپے نجومِ نبوت کا ورد و ظہور شروع ہوا۔

تھو اس سلنا دسلنا تتری (القرآن) پھر ہم نے پیارے رسول بھیجے۔

ان نجومِ نبوت کے انوار و برکات سے دلوں کی ظلمتیں چھٹنی شروع ہوئیں، اور دنیا نے انہیں دیکھ دیکھ کر اور ان کے مثالی نمونوں کو معیار بنا کر راہِ حق کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔

آسمانِ نبوت پر نجومِ ہدایت کا اجتماع

یہ آسمانِ نبوت پر پاپے طلوع ہونے والے ستارے چمکتے رہے۔ یعنی آدم و نوح
ابراہیم و موسیٰ، سلیمان و داؤد علیہم السلام سب اپنے اپنے وقت پر چمکتے اور اپنے اپنے دور
میں جہان والوں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا باعث ہوئے اور جو نبی بھی رخصت
ہوا وہ اپنے نورانی آثار چھوڑ کر گیا۔ جس پر آنے والے کی عمارت کھڑی ہوئی اور اس طرح
بعثتِ نبویٰ سے پانچ برس پہلے ایک وقت آیا کہ سارے ہی یہ روحانی ستارے
اپنے انوار کے پردے میں آسمانِ نبوت پر بیک وقت جمع ہو گئے اور ظلمات
بعضہا فوق بعض کے مقابلہ میں نورِ علیٰ نور کا ظہور ہو گیا۔

آسمانِ نبوت پر طلوعِ آفتاب کے فطری تقاضے

اور آسمانِ وزمین کی صورت یہ ہو گئی کہ آخر شب میں آسمان پر لاکھوں چھوٹے اور
بڑے ستارے روشن ہیں اور زمین پر کروڑوں چراغ اور مصنوعی روشنیوں کے لاکھوں
لمپ اور ہنڈے اور پھر برق جہانتا کے ہزار ہا ققمے جگمگائے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر
بھی شب تار اور اسکی تاریکی زائل نہیں ہوتی نہ رات ہی کا فور ہوتی اور نہ دن ہی نکلتا ہے گویا
ان ساری روشنیوں میں مل کر بھی یہ طاقت نہیں کہ رات کو دن بنا دیں اور طاقت کا بالکل
استیصال کر دیں۔ اس لئے ظلمتِ شب کے انتہا کو پہنچ جانے پر زمین تو زبانِ حال سے
یہ فریاد کرتی ہے کہ نورِ کامل سے اُس کی مدد کی جائے۔ جو ان تاریکیوں کے بادلوں کو چھٹا
دے اور ستاروں کا یہ ناتمام نورِ زبانِ حال سے یہ آواز بلند کرتا ہے کہ اس کی تکمیل کر دی
جائے تاکہ وہ ظلمتِ شب پر غالب آسکے اور روزِ روشن نمودار ہو جائے جس سے
تکمیل کر سکے۔

چنانچہ دنیا کی یہ پھیلی ہوئی ظلمت اور ان ستاروں کی یہ مجموعی روشنی کی خاموش فریاد
بلند ہوئی کہ ہمیں ایک ایسا کامل نور عطا کیا جائے جو رات کو دن بنا دے اور ناتمام انوار

کی تکمیل کر دے۔

آثارِ طلوع

تو عطا ئے خداوندی متوجہ ہوئی اور آدم علیہ السلام کے تقریباً سات ہزار برس کے بعد جبکہ آسمان نبوت اپنے سارے ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔

آسمانِ نبوت کی صبح صادق

آسمانِ نبوت پر روحانیت کے آفتاب جہاں تاب کی آمد آمد کے آثار نمایاں ہوئے اچانک پوچھی اور روحانیت کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ جس نے بشارت دی کہ عنقریب وہ منبع نور اور سرچشمہ ضیاء یعنی آفتابِ نبوت سامنے آیا چاہتا ہے۔ جس کے سب منتظر تھے اور جس کو نور اور ظلمت ایک زبان ہو کر مانگ رہے تھے۔ وہ آرہا ہے۔ جس کے آجانے کے بعد پھر کسی نور کی ضرورت نہ پڑے گی۔ کیونکہ آفتاب کے بعد کوئی دوسرا آفتاب طلوع نہیں کرتا۔ یہ آفتابِ نبوت کی خوشخبری کی تھی جس نے طلوع آفتاب کی خوشخبری دی؟

یہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات بابرکات تھی۔ جنہوں نے اپنے آنے کا حقیقی مقصد ہی آفتابِ نبوت کے طلوع کی بشارت بتلایا اور اعلان کیا کہ

واذ قال عیسیٰ بن مریم یٰنبی

اسرائیل انی رسول اللہ الیکم

مصدقاً لِمَا بین یدی من

التورٰت و مبشرًا برسول یناتی

من بعدی اسمہ احمد

اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے اے نبی اسرائیل میں اللہ کا رسول ہوں۔ تمہاری طرف تصدیق کنندہ ہوں۔ سامنے کی تورات کا اور بشارت دہندہ ہوں، اس رسول کا جو میرے بعد آئیں گے۔ نام ان کا احمد ہے۔

پس جیسے آفتاب کے طلوع کی بشارت صبح صادق دیتی ہے، ایسے ہی صبح علیہ السلام کاسب سے بڑا مشن حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوردہی کی بشارت دیتا تھا۔ اس لئے وہ دائرہ نبوت میں صبح صادق کی مانند ہیں۔

ہاں مگر جیسا کہ بارہ گھنٹہ کے دن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ کی صبح صادق ہوتی ہے کہ جتنا بڑا دن ہوا اتنی ہی بڑی صبح صادق ہوتی ہے۔ سو دائرہ ختم نبوت کے اس عظیم الشان دن کے لئے جس کا طویل بعثت نبوی سے قیامت کی صبح تک ہے۔ صبح صادق بھی اتنی ہی لمبی ہوئی چاہیے تھی۔ جتنا بڑا یہ دن تھا تو یہ صبح صادق حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ہے۔ جن کا دور نبوت اور بالفاظ دیگر بشارت کا زمانہ جن کے اختتام پر آفتاب نبوت طلوع ہوا۔ تقریباً پونے چھ سو برس کی مدت کا تھا۔

یہ صبح صادق بھی آفتاب ہی کا اثر تھی

یہاں سے یہ نکتہ بھی باآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ صبح صادق کا نور کوئی مستقل نور نہیں ہوتا، بلکہ وہی آفتاب کا چاندنا ہوتا ہے۔ جو اس نور کی ایک ابتدائی جھلک ہوتی ہے جس میں آثار وہی ہوتے ہیں۔ جو نور آفتاب میں ہوتے ہیں چنانچہ اس کے نور دار ہونے ہی ستارے سب ماند پڑ جاتے ہیں اور طلوع صبح صادق کے کچھ دیر بعد کوئی ستارہ نظر نہیں آتا ایسے ہی حضرت مسیح صادق علیہ السلام بھی نور محمدی ہی کی ایک جھلک تھے، اور آپ سے بہت سی صفات کمال میں کامل مشابہت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضور کو اگر رحمت عالمین اور رحمت مہدایہ فرمایا گیا کہ

وما ارسلناک الا
مرحمتاً للعالمین

ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے
صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تو مسیح علیہ السلام کو بھی رحمت کہا گیا۔
ولنجعلہ ایتۃ للناس ورحمتہ
منا وکان امراً مقضیاً

اور اس طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ
ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی

بنادیں اور باعثِ رحمت بنائیں اور یہ ایک
طے شدہ بات ہے۔

اگر حضور کو عبدِ کامل فرمایا گیا یعنی خاص صفت سے مقید کر کے ذکر نہیں کیا گیا
جیسے عبدِ شکور یا عبدِ صبور وغیرہ بلکہ عبدِ مطلق کہا گیا جس کے معنی کمالِ عبدیت کے
ہیں نیز حق تعالیٰ نے خود ہی آپ کی عبدیت کا اعلان کیا جو خود ہی آپ کی کمالِ عبدیت
کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

سبحان الذی امری بعدہ وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندے کو
یلاً من المسجد الحرام الی
المسجد الاقصیٰ : شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد
اقصیٰ تک لے گیا۔

تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی اسی طرح عبدِ مطلق کے خطاب سے نوازا گیا مگر لفظ
عبدِ خود ان کی بھی زبان سے کھلوا یا گیا کہ قوم انہیں معبود رکھنے والی تھی۔ فرمایا۔

انی عبد اللہ اتانی الکتاب میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو کتاب
نبیاً الخ : دی اور اس نے مجھ کو نبی بنایا۔

اگر حضور کو خاتمت سے سرفراز کیا گیا کہ آپ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین :- تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی ایک نوع
کی خاتمت دی گئی کہ وہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ پس حضور خاتم مطلق ہیں اور حضرت
عیسیٰ علیہ السلام خاتم اسرائیلیت ہیں۔ قدر مشترک دونوں میں وصفِ خاتمت ہے۔
اگر حضور کی امت کو بوجہ آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے امتِ رحمت بنایا
گیا اور امتِ مرحومہ کہا گیا کہ رحماء بینہم : (آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے
والے اور بعض حدیث ہینون لینون (نرم مزاج والے، نرم اخلاق والے)

تو امتِ مسیحی کو بھی یہی وصف عطا ہوا۔

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوا اور جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا ہم
سرافۃ ورحمۃ نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم

پیدا کیا۔

اگر آپ کی امت کو عالمی حکومت سے نوازا گیا کہ ابتداءً بھی مسلمان پورے عالم پر چھا گئے اور مشرق سے مغرب تک ان کی سطوت و صولت کا ڈنکا بجا اور انتہاء بھی پورے عالم پر ان کے چھا جانے کی خبریں دی گئی ہیں کہ

هو الذی ارسل رسولہ
بالهدیٰ و دین الحق لیظہرہ
علی الدین کلہ
وہ اللہ ایسا ہے، جس نے اپنے رسول کو
ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے
تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اور حدیث نبوی میں ہے کہ

ان اللہ نزل فی الارض
مشارقہا و مغاربہا و سبلغ
ملک امتیٰ ما نزل فی
لی منہا ۛ

حق تعالیٰ نے میرے لئے زمین کے
مشرق اور مغرب کو اکٹھا کر دیا ہے اور میری
امت کی حکومت وہیں تک پہنچے گی۔
جہاں تک زمین کو میرے اکٹھا کیا گیا ہے۔

تو حضرت مسیح کی امت کے ملک کو بھی امت مسلمہ کے دوش بدوش دوامی اور
عالمی رکھا گیا اور انہیں فرمایا گیا۔

والرود ذوات القرون اذا هلك
قرن خلفہ قرن الحرب بیننا
وینہم سجال ینالوننا
ونال منہ ۛ

اور (حکومت) صدیوں بہنے والی ہے،
صدیوں پر صدیاں گزریں گی اور ہماری ان
کی جنگ قائم رہے گی کبھی وہ ہم پر غالب
رہیں اور کبھی ہم ان پر۔

یعنی یہ امت غلبہ و مغلوبیت کے ساتھ امت مسلمہ کے دوش بدوش چلتی رہے
گی اور۔۔۔۔۔ انتہائی عروج و اقتدار اور پورے عالم میں غلبہ کی خبر ظہور مہدی کے قریب
زمانہ کے لئے دی گئی ہے۔ جیسا کہ آج یہ غلبہ مشاہدہ میں آ رہا ہے اور مسلمانوں پر ایک
ہزار برس گزرنے کے بعد ہی سے نصارائے کے غلبہ و اقتدار کی تہید پڑ چکی تھی جو
آج پورے عروج پر ہے۔

اگر آپ کو جسدِ عنصری کے ساتھ معراج کرائی گئی تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی جسدِ عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں چرخِ چہارم تک پہنچایا گیا۔ جو ان کا مقام تھا اور وہیں تھام دیا گیا اور حضور کو ساتوں آسمانوں سے گزار کر سدۃ المنتہی (مقامِ جبرائیل) اور سدۃ سے گزار کر جنتوں تک اور جنتوں سے گزار کر مستوئے (دفترِ قضا و قدر) تک اور وہاں سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا گیا اور قرب کا انتہائی درجہ عطا ہوا۔

اگر حضور کو آپ کے وطن سے ہجرت کرائی گئی تاکہ آپ قوت و شوکت کے ساتھ اپنے وطن کی طرف لوٹیں اور پھر نہ صرف وطن تک محدود رہیں بلکہ پورے عالم کے خزانوں کی کنجیاں آپ کو اور آپ کی امت کو سپرد کی جائیں اور پورے عالم میں آپ کا دین پھیل جانے کی داغ بیل پڑ جائے تو حضرت مسیح کو بھی وطنِ دنیا سے وطنِ آسمان کی طرف ہجرت کرائی گئی تاکہ دورِ آخر میں قوت و شوکت کے ساتھ اپنے ملکِ شام کی طرف لوٹیں اور مسجدِ اقصیٰ میں اتریں جو ان کا مولد اور منشا تھا اور اب نہ صرف اس خطہ ہی تک محدود رہ جائیں بلکہ پورے عالم میں ان کا دورِ حکمرانی قائم ہو جائے اور وہ بحیثیت مجددِ اسلام، اسلام کو سارے عالم پر غالب و حکمران بنا دیں۔ فرق اتنا ہے کہ مسیح علیہ السلام وہاں ہزاروں برس گزار کر وہ قوت لے کر آئیں گے اور عالم پر غلبہ پاسکیں اور حضور شبِ معراج میں چند لمحوں ہی میں یہ ساری عروجی قوتیں لے کر واپس ہوئے اور اپنے وطن ملک کو شوکت کے ساتھ لوٹے اور فتح مکہ سے فتوحات اور عالمگیر عروج و اقتدار کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اگر حضور کے اہل وطن (اہلِ حجاز) کے لئے جزیہ نہیں رکھا گیا۔ (کہ وہ یہ خاص قسم کا ٹیکس ادا کر کے اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے اسلام کی شوکت کے نیچے زندگی گزاریں) بلکہ ان کے حق میں یا اسلام تھا یا قتل کیونکہ وہ نبی اور نبی کے دین کو پوری طرح جاننے کے باوجود نبی کو ان کے وطن سے نکلنے والے تھے اور قومی تعصب و عناد کی وجہ سے نہیں پاتے تھے کہ نبی اپنے دین کے ساتھ اپنے وطن میں بلد

وطن سے باہر دنیا کے کسی خطہ میں بھی باقی رہ سکیں۔ اس لئے ان کی جزا اس کے سوا دوسری ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ انہیں بھی ان کے کفر کے ساتھ کسی گوشہ میں پناہ نہ ملے اور وہ اپنے باطل مذہب کے ساتھ دنیائے اسلام میں باقی نہ رہیں۔ رہیں تو مسلم بن کے ورنہ قتل کے گھاٹ اتر جائیں، تو حضرت مسیح علیہ السلام کے دورِ آخر (بعد نزول) میں بھی قوموں اور بالخصوص یہود کے لئے جزیرہ باقی نہ رہے گا یا قبول اسلام ہو گا یا قتل کیونکہ یہود نے باوجود اہل خاندان (بنی اسرائیل) ہونے اور باوجود سب سے زیادہ مسیح پاک کی صداقت کے نشانات دیکھ لینے کے ازراہ تعصب و عناد ایک منٹ کے لئے گوارا نہیں کیا کہ حضرت مسیح اپنے دین کے ساتھ دنیا میں باقی رہ سکیں۔ انہیں پھانسی دینے کے سامان کئے گئے اور اپنی دانست میں دیدی بھی گئی گو وہ با امر الہی ان کے شدید کولگ گئی تو حق تعالیٰ نے عزت کے ساتھ انہیں آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی اور نزول مسیح کے بعد ہی جب کہ اس وقت کی دنیا وہی متقابل گروہوں میں منقسم ہو گی یا نزول حامیان مسیح ہوں گے یعنی مسلمان اور اسلام لاتے ہوئے نصاریٰ یا رفقاً و مجال ہوں گے۔ جن میں اکثر و بیشتر یہودی ہوں گے تو یہ وجالی یہود اور خود و مجال ایک منٹ کے لئے برداشت نہ کریں گے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کی جزا یہی ہو گی اور یہی ہوتی بھی چاہیے تھی کہ انہیں بھی دنیا کے کسی گوشہ میں دجل و فساد کے ساتھ پناہ نہ دی جائے کہ وہ اس شدید کفر و عناد کی گندگی کے ساتھ دنیا کو آلودہ کریں بلکہ یا اسلام لائیں یا قتل ہو جائیں۔

پھر حال حضرت مسیح علیہ السلام کو حضرت خاتم المرسلین علیہ السلام سے کمالِ درجہ کی مناسبت اور مشابہت حاصل ہے جس کا منشا اولاً قرب عہد ہے کہ وہ حضور سے بلحاظ زمانہ کے سارے انبیاء سے قریب نہیں۔ ان کے اور حضور کے درمیان کوئی اور نبی نہیں اور ظاہر ہے کہ قرب زمانی سے مناسبت اور گونہ مشابہت کا پیدا ہو جانا امر طبعی ہے۔

ثانیاً خلقی طور پر قرب صورتی بھی ہے جس سے ان مذکورہ مشابہتوں کا دروازہ

کھلا کیونکہ آپ شبیہ محمدی کی اولاد ہیں۔ چنانچہ تبصریح قرآن جبرائیل علیہ السلام نے کامل
 الخلقۃ اور بالفاظ قرآن بشر سوی کی صورت میں نمایاں ہو کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک
 ماری جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو اس وقت حضرت جبرائیل صورت محمدی میں تھے
 (جیسا کہ روح المعانی میں اس کے بارے میں بعض آثار و روایات منقول ہیں) اور ہر صورت
 اپنے مناسب ہی حقیقت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے یہ صورت محمدی کمالات محمدی
 کی نوعیت کی متقاضی تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت جبرائیل کا چولہ بنی ہوئی تھی اور انہوں نے
 گویا اس صورت میں حقیقت محمدی کی نوعیت کو لے کر مریم پاک کے گریبان میں
 پھونک ماری۔ جس سے مسیح علیہ السلام کا مال کے پیٹ میں وجود ہوا۔ جس کے یہ معنی
 ہوئے کہ گویا مسیح علیہ السلام کی حقیقت میں بواسطہ شبیہ محمدی خود حقیقت محمدیہ کی
 نوعیت شامل تھی۔ اس لئے مسیح علیہ السلام کے کمالات و مقامات اور شئون و احوال میں
 بھی وہی نوعیت گھر کر گئی جو کمالات محمدی کی تھی جس سے ان کے کمالات، کمالات
 محمدی کے مشابہ ہو گئے اور وہ ظاہری مشابہتیں اور مناسبتیں نمایاں ہوئیں۔ جنکے
 کچھ نمونے ابھی پیش کئے گئے۔ انہی چند در چند مناسبتوں اور مشابہتوں کی وجہ سے
 انہیں ابتداء میں آفتاب نبوت کی خوشخبری دینے یا بالفاظ دیگر اس آفتاب کی صبح
 صادق بننے کے لئے چنا گیا کہ صبح صادق کی روشنی بعینہ آفتاب ہی کی روشنی ہوتی ہے۔
 جو اس کے طلوع سے تھوڑا عرصہ قبل بطور مقدمہ الجیش کے نمودار ہوتی ہے اور طلوع کی
 خبر دیتی ہے۔ گویا صبح صادق آفتاب کی اولاد ہوتی ہے اور اس کا وجود آفتاب ہی سے
 ہوتا ہے۔ گو ظہور اس سے پہلے نظر آتا ہے۔ جو روحانیات میں ممکن ہے۔ یعنی
 جسمانی ولادت میں، گو باپ کے بعد بیٹے کا ظہور ہوتا ہے، لیکن روحانیات میں یہ قبل
 و بعد کا جھگڑا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت خاتم الانبیاء کے فیض سے سارے انبیاء
 مستفید ہیں تو بمنزلہ روحانی فروع کے ہیں۔ دراصل ایک یہ فروع مقدم ہیں اور اصل کا ظہور
 اور ان کے بعد میں سے۔ لیکن پھر بھی ان کی فروغیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پس
 مسیح علیہ السلام ہی مسود کی روحانی ذریت میں قریب ترین اور ایشہ ترین ذریت ہیں جو باپ

کی تبشیر (بشارت دینے) کے لئے باپ سے قبل نمودار ہوئے اور ان کا وجود حضور کے وجود کا ثمرہ ہے اور پھر جیسے ابتداء میں حضرت یسح علیہ السلام کو بطور صبح صادق یا مبشر کے لایا گیا۔ جو دن کی ابتدائی ساعتیں ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کے غروب کے بعد جو صدیوں کی لمبی رات آئی۔ جس میں خلفاء مجددین اور مجتہدین نے ستاروں کی طرح دین کی روشنی باقی رکھی۔ اس کے آخر میں دین کی آخری تجدید اور اشاعت دین کی انتہائی تکمیل کے لئے بھی حضرت یسح علیہ السلام ہی کو رکھا گیا۔ کیونکہ مہینہ کے ختم پر آخر کی راتوں میں چاند سب سے اخیر ہی میں طلوع ہوا کرتا ہے اور یہ روشنی بھی بالواسطہ سورج ہی کی روشنی ہوتی ہے۔ غرض ابتداء اور انتہا دونوں کے لئے حضرت یسح کو رکھا گیا اور دونوں صورتوں میں ان کی نورانیت اور نور بخشی آفتاب نبوت ہی کے آثار ثابت ہوتے ہیں۔ پس خاتم النبیین نے اپنی امت میں اگر ہزاروں نبیوں سے کام نہیں لیا تو ایک ہی ایسے نبی سے کام لے لیا۔ جو خاتم اسرائیلیت ہونے کی وجہ سے ساری اسرائیلی قوتوں کا جامع اور اپنی روحانیت کی خصوصیات میں سب سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان کا لقب ہی روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھا۔ گویا دین محمدی کی تجدید دائرہ ولایت اور دائرہ نبوت دونوں سے کرائی گئی۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ ولایت ہو یا نبوت سب میں نورانیت صرف آفتاب ہی سے آئی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ اپنی خدمت دونوں دائروں سے لینے کا حقدار ہے۔

بہر حال یسح علیہ السلام اپنے اول و آخر کے لحاظ سے جب کہ آفتاب نبوت کے آثار سے متاثر اور آپ کی صورت و سیرت سے قریب تر اور اشرہ تر تھے گویا نور مسیحی درحقیقت نور محمدی ہی تھا۔ تو ان کامل مناسبتوں کے سبب انہی کو آفتاب نبوت کے حق میں صبح صادق مبشر اور منیر بنایا جاسکتا تھا کہ صبح صادق درحقیقت آفتاب ہی کے نور کی ایک جھلکی ہوتی ہے۔ آفتاب سے الگ کہیں اس کی روشنی نہیں آتی اور انہی کو اسلام کے دورِ آخر میں اس کے تحفظ کے لئے بھی چنا گیا۔ جس طرح انہی کو اس یوم نبوت کی صبح صادق بنایا گیا تھا کہ آفتاب کے حق میں وہی سب سے بڑی بشارت، دہندہ ہوتی

ہے اور انہی کو اس آفتاب کے حق میں شفق بنایا گیا کہ غروب آفتاب کے بعد وہی آفتاب کا کام کر جانے کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں حضرت مسیح کے بارے میں بشارت دہندہ نبوی ہونے کی شہادت دی گئی جو صبح صادق کا کام ہے اور فرمایا گیا۔

و مبشرًا برسول یأتی من
 بعدی اسمہ احمد - اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے
 میں جن کا نام احمد ہوگا۔ میں ان کی
 بشارت دینے والا ہوں۔

تو انہیں سے آخری تجدید کا کام لیا گیا کہ غروب کے بعد شفق ہی نور آفتاب کے آثار باقیہ میں سے ہوتی ہے۔ جو اس کی روشنی پر دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث نبوی میں انہی کو اسلام کی تجدید کی آخری روشنی کہا گیا۔ ارشاد نبوی ہے۔

کیف تمهلك امتہ انا اولہا
 والمہدی وسطہا والمسیح
 آخرہا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)
 وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کے
 اول میں میں ہوں بیچ میں حضرت مہدی اور
 آخر میں حضرت عیسیٰ ہیں۔

صبح صادق کے وقت کا عالمگیر اندھیرا

میرا حال پوچھٹی اور صبح صادق نمودار ہوئی۔ حضرت مسیح نے صبح صادق بن کر آفتاب نبوت کے طلوع کی خبر دی اور طلوع آفتاب سے قبل دھیمی دھیمی روشنی نمایاں ہو گئی جو درحقیقت آفتاب ہی کی روشنی تھی۔ اسی لئے شبِ تاریختم ہو گئی۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ طلوع صبح صادق کے وقت جہاں چاند کے چمکتے رہنے کا سماں سامنے آتا ہے وہیں یہ منظر بھی لگتا ہوں کہ سامنے ہوتا ہے کہ عامۃً دنیا کے انسان اُس وقت نیند میں مست ہوتے ہیں۔ نیند کے نچوڑ کا اتہائی وقت ہوتا ہے اور ہر کس فاکس ٹوم میں غرق اور گہری نیند کا متوالہ بنا رہتا ہے گویا اس وقت خصوصیت سے نیند کا دماغوں پر پورا غلبہ و تسلط ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے طلوع آفتاب کے بعد بھی نہیں جاگتے بلکہ سورج

جب کافی بلند ہو جاتا ہے اور اس کی دھوپ کی تیزی ان پر پڑھنے لگتی ہے تب ان کی آنکھ کھلتی ہے۔ پس ادھر تو صبح صادق ہوتے ہی ستارے جھلکانے لگتے اور ان کی روشنیاں غائب سی محسوس ہونے لگتی ہیں کیونکہ صبح کا چاند نائیز ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ادھر سونے والے عموماً اپنی نیند میں مست اور محو ہوتے ہیں اس لئے باہر تو چاندنا ہوتا رہتا ہے اور اندر اندھیرا غلیظ ہوتا رہتا ہے۔ جب تک کہ آفتاب طلوع نہ ہو جائے یعنی اس صبح سے فائدہ وہی حاصل کرتا رہتا ہے جو بیدار ہوتا ہے اور وہ سولے مخصوص افراد کے جو صبح صادق کے وقت فوراً ہی جاگ اٹھنے کا جذبہ لے کر سوتے ہوں، عام انسان نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ درمیانی حصہ جو نہ رات ہے نہ دن حسانورائیت کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور عام انسانوں کے اندرونی احوال کی ظلمت و تاریکی کی طرف چلتا رہتا ہے۔ پس اس زمانہ صبح صادق میں جسے زمانہ فترت کہنا چاہیے ادھر تو صبح صادق کے آثار نمایاں ہوتے اور روشنی بڑھنی شروع ہوتی چنانچہ مخصوص لوگوں کے دلوں کا رخ توجید اور انوار دیانت کی طرف ہو چلا۔ لیکن عامہ خلایق کا یہی زمانہ زیادہ غفلت اورستی خواب کا ثابت ہوا اور اس وقت کی دنیا پر ضلالت و گمراہی کے جوبادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ وہ اور غلیظ ہو گئے۔ چنانچہ مکہ جو نواف عالم تھا۔ اس کے اندر اور باہر چہار طرف پوری دنیا کے دلوں پر انواع و اقسام کی تاریکیوں کی نیند مسلط تھی اور سب خوابِ قساوت و غفلت میں مست تھے۔

جزیرہ عرب کے ایک سمت خلیج فارس تھا جس کے کنارے ایران و فارس کی مملکتیں تھیں۔ جہاں ایرانیوں کی جہانبانی قائم تھی۔ اکاسرہ فارس سریرا آرا تھے۔ وہاں شرک و کفر کی تاویل و توجیہ سے نہیں بلکہ کھلے بندوں دو خداؤں کی خدائی کا ڈنکا بجایا جا رہا تھا۔ ان کے نزدیک جہانوں کے نظام کے لئے ایک خدا کافی نہ تھا بلکہ برابر کے دو خدا ابہرمن اور یزواں خدائی کر رہے تھے۔

عرب کی دوسری سمت بحیرہ روم تھا جس کے کنارے مغربی دو تفل کے پرچم لہرا رہے تھے۔ قیصر کی بادشاہی کا سکہ رواں تھا۔ یہاں عیسائیت نے مذہب کے

نام سے تین خداؤں کی پوجا کا اعلان کیا ہوا تھا۔ یہ فارس کی نسبت بندگی کے معاملہ میں ترقی یافتہ تھے۔ جنہوں نے دو خداؤں پر قناعت کافی نہ سمجھتے ہوئے ان میں ایک کا اضافہ اور ضروری سمجھا۔ ایک خدا ایک اکلوتا بیٹا اور ایک اس کی بیوی یا بعض کے نزدیک روح القدس۔ یہاں خدائی کے تصرفات ان تین کے سپرد تھے۔

تیسری سمت بحر ہند تھا۔ جس کے کنارے ہندوستان کا بڑا عظیم اور دوسرا مشرقی ممالک واقع ہیں۔ یہ سرزمین پوجا کے سلسلہ میں ان دونوں سمتوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ جسے تین خداؤں پر بھی قناعت نہ تھی۔ بلکہ ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچا دی گئی تھی۔ یہ ملک بت پرستی کا مخزن بنا ہوا تھا اور بت کے مفہوم میں صرف مورتی ہی شامل نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے پتھر، دریاؤں کا پانی، درختوں کی شاخیں، جانوروں کے سر، انسانی اعضاء اور صنعت و حرفت کے آلات حتیٰ کہ کھانے پینے کی چیزیں سب کے سب معبود اور لائق پرستش تھے اور معبودوں کی تعداد عابدوں سے بدرجہا زائد تھی اور اس دور کی اس علم گراہی کو خود ہندو زعماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ پنڈت دیانند سرسوتی نے تحریر فرمایا ہے کہ ویدوں کا علم پانچ ہزار برس سے کم ہو چکا تھا جسے انہوں نے زندہ کیا اور ظاہر ہے کہ حضور کی بعثت سے قبل چند صدی کا دور جو زمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔ اس پانچ ہزار سال کے اندر ہی اندر ہے۔ اس لئے آپ کی بعثت سے قبل ہندوستانی زعماء کے خیال میں بھی ہندوستان کی یہ عام گراہی کا دور تھا۔

عرب کی چوتھی جانب سمندر کی موجوں سے ہٹی ہوئی اور خشکی سے ملی ہوئی تھی جس میں مصر و سوڈان اور افریقہ کی آبائیاں تھیں۔ انہوں نے اس بارہ میں پچھلی تین سمتوں سے بھی زیادہ پیش قدمی کی تھی۔ وہاں نہ ثنویہ تھی نہ وثنیہ، نہ تثلیث تھی نہ تکثیر، وہاں نہ چند خداؤں کا جھگڑا تھا نہ نفس خدائی کا۔ بلکہ سرے سے ہی اس راہ سے الگ ہو کر ان کے یہاں فسق و فجور، بد عملی و سیہ کاری اور شہواتِ نفس کی مسموم آندھیاں چل رہی تھیں۔ گویا ہر شخص خدا بنا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی شہوات و خواہشات میں آزاد تھا۔ جس کو قرآن حکیم نے فرمایا۔ سَأْتِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ۝

پھر حال عرب کے چہار طرف بحر و بر میں ظلمتوں کی یہ بہتات شب تاریک
 ہم موج اور دیانے ناپید کنار کا منظر پیش کر رہی تھی یہ تو ذات خداوندی کی حد تک
 تھا۔ رہیں صفاتِ خداوندی سو یہی کیفیت اس وقت کی دنیا نے ان کے ساتھ بھی کر
 رکھی تھی۔ بعض نے خالق کی صفات خاصہ مخلوق میں مان کر مخلوق کو خالق کے درجہ
 میں پہنچا دیا تھا۔ جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا پکار کر کہا تھا اور
 انہیں اللہ مجسّم کہا رکھا تھا اور بعض نے مخلوق کی صفات نقص و عیب خالق
 میں مان رکھی تھیں۔ جیسے اس کا بیمار ہونا، اس کشتی میں حضرت یعقوب کے ہاتھوں
 پھنچ جانا وغیرہ یہ یہود تھے۔ بعض نے خالق کو صفات سے بالکل ہی معطل قرار دے
 رکھا تھا۔ جیسے فلاسفہ اور بعض نے خالق و مخلوق کی صفات سے بالکل ایک دوسرے
 کے مشابہ بنا رکھی تھیں۔ جیسے مجسمہ اور مشبہ بعض نے اوتار کا عقیدہ مان کر خدا کو مخلوق
 میں حلول شدہ مان رکھا تھا۔ گویا مخلوق ایک طرف تھی جس میں معاذ اللہ خالق اترتا ہوا تھا،
 اور بعض نے اس کے برعکس خالق کو طرف قرار دے کر مخلوق کو اس میں اس طرح سمایا
 ہوا مان رکھا تھا۔ جیسے گولہ کے پیٹ میں بھنگے سمائے ہوئے ہیں۔ یہی معاملہ نبوت
 کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ کسی نے نبوت کو اس حد تک مافوق البشریت سمجھ رکھا تھا کہ
 بشر کا رسول ہونا ہی ممکن نہ تھا۔ جو کھانا پیتا ہو۔ ما لہذا الرسول یا کل الطعام و یبشی
 فی الاسواق؛ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے،
 اور کسی طبقہ نے نبوت کو اس قدر ہلکی اور عامیانا چیز جان رکھا تھا کہ وہ ہر فرد بشر کو
 مل سکتی ہے۔ بل یرید کل امر منہم ان یعرف صحفا منشرة؛ کسی نے انبیاء کو
 مجسم خدا کہہ کر ان کی تشزیہ میں مبالغہ آرائی کر رکھی تھی کہ کسی نے انبیاء کی طرف ایسے ایسے
 کینہ عیوب منسوب کر رکھے تھے کہ ان کا ایک صحیح انسان سمجھا جانا بھی مشکل بنا دیا تھا۔
 غرض الوہیت کی لائن تشبیہ مجسم تعطیل تجلیس وغیرہ کوئی نقص و عیب ایسا نہ تھا جس
 سے خدا کی تشزیہ کو مخلوق نے برباد نہ کر رکھا ہو اور نبوت کی لائن پر کوئی افراط و تفریط باقی
 نہ چھوڑی تھی جو انبیاء میں نہ مان رکھی ہو۔ یہی تمام وہ معنوی ظلمات اور تاریکیاں تھیں جو بعضہا

فوق بعض ہو کر پوری دنیا کو تاریک بنائے ہوئے تھیں جس سے اس وقت کی ساری دنیا خدا کی نگاہ میں ----- مبعوض بن چکی تھی۔

ان الله نظر الحی قلوب بنی
 اللہ نے بنی آدم کے قلوب کی طرف
 آدم نعمت عربہ و عجب الخ
 نظر کی تو عرب اور عجم سب کو غصہ دیکھا۔
 مگر بہر حال یہ جس قدر ممالک بھی تھے، وہ کسی ایک نوع کی گمراہی پر قائم نہ تھے،
 اگر ہندوستان میں شرک تھا تو وہاں تہلیت نہ تھی، روم میں تہلیت تھی تو وہاں تکثیر نہ تھی کہ
 کروڑوں معبود ہوں، اگر ایران میں تنہویت کا زور تھا تو وہاں اقداریت نہ تھی اور اگر ہند
 میں وثنیت تھی تو وہاں دوسری نوع کی کوئی اور گمراہی نہ تھی، اگر مصر میں دہریت اور عیش
 پرستی تھی تو بس وہی تھی، وہاں مذہبی رنگ کی رسوم نہ تھیں، لیکن خدا کی یہ مقدس سر زمین مکہ
 مگر اس وقت ہمہ نوع گمراہیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، وہاں دہریت شرک فسق و مجور انکارِ
 نبوت اور انکارِ صفاتِ نبوت وغیرہ ساری ہی انواع کی گمراہیاں جگہ بنائے ہوئے
 تھیں، اس لیے جہاں صبح صادق نور برسا رہی تھی، وہیں دلوں کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا
 چھایا ہوا تھا اور ضلالت کی تاریک رات کا جو عمل دنیا میں جاری تھا، وہ بھی انتہا کو
 پہنچ چکا تھا اس لیے طلوع آفتاب کا وقت آگیا اور اس آفتابِ نبوت کی صبح
 صادق بہ صورتِ مسیح علیہ السلام نمایاں ہو گئی۔

طلوع شفق

لیکن جب صبح صادق نے اپنی زبانی مسافت پوری کر لی اور یہ ہزاروں برس کے
 لمبے دن کی لمبی صبح صادق زائد از پانچ سو سال کے عرصہ میں پوزی ہو گئی تو صبح صادق
 کے آخریں طلوع آفتاب سے قبل شفق نمودار ہوتی ہے اور آسمان اک دم سرخی مائل
 نور سے اس قدر سرخ ہو جاتا ہے کہ گویا اس کے کنارے آگ سے دھک لے رہے
 ہیں۔ یہ طلوع شفق طلوع آفتاب کی بالکل قریبی علامتیں ہوتی ہیں جس سے وہ اندھیرا بھی
 ختم ہو جاتا ہے۔ جو صبح صادق کے وقت زمین پر چھایا رہتا ہے یہ روشنی بھی آفتاب

ہی کی ہوتی ہے کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی۔ جیسا کہ صبح صادق بھی اسی کی روشنی تھی۔ فرق صرف قرب و بعد کا ہوتا ہے کہ شفق کا نور بلا واسطہ خود آفتاب ہی کے ساتھ چلتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کی صبح صادق کے بعد بعثت سے قبل اس آفتاب کی شفق نمودار ہوئی یعنی آفتاب نبوت کے قریبی آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے یہی وہ ارماسات تھے جو ولادت باسعادت سے قبل دنیا کے سامنے آئے۔ بجزہ ساویہ خشک ہو گیا۔ کسریٰ کے محل کے چودہ کنگرے گر پڑے۔ آتش کدہ ایران جو صدیوں سے مسلسل روشن چلا آ رہا تھا، اک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وغیرہ۔ یہ گویا آفتاب نبوت کی شفق کا ظہور تھا۔ جس سے آفاق روشن ہو گئے اور دنیا کو اندازہ ہو گیا کہ طلوع ہونے والا ستارہ کونسی چھوٹا موٹا یا معمولی ستارہ نہیں بلکہ کونی عظیم ترین سیارہ مطلع کو زینت بخشنے والا ہے جو اب تک نمودار نہیں ہوا تھا۔ پس طلوع صبح صادق سے تو رات ختم ہوئی تھی اور شفق کے طلوع سے وہ مخلوط تاریکی ختم ہو کر دن کی خالص روشنی کا آغاز ہو گیا۔ جس سے آسمان کے کنارے و زمین کے سارے اطراف سورج کی ابتدائی چمک و دمک سے چمک اٹھے۔ دلوں میں توحید اور دیانت کی استعداد بھرنی شروع ہوئی اور اطراف و اکناف میں ایسے لوگ ابھرنے لگے جو بت پرستی سے نفور ہو کر توحید کے نام لیوا ہو گئے اور اب وقت آ گیا کہ آفتاب نبوت طلوع ہو کر ان سب چمکیلی استعدادوں کو ابھار کر قلوب کی زمینوں کو بقعہ نور بنائے۔ گویا یہ نور انیتین طلوع کے آخری آثار اور طلوع کے طلب گار ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلمتوں کی انتہا اور نور کی ابتدا اور نامی کی ان پکاروں پر بخشش خداوندی جوش میں آئی اور ان پیالے طلبوں کے انتہا کو پہنچ جانے پر تکمیل نور کے حل کا سامان عطا فرمایا۔ اولاً پوچھتی صبح صادق کے آثار نمایاں ہوئے جو طلوع آفتاب کی بشارت تھے صبح صادق نے یعنی حضرت مسیح نے اعلان کیا کہ جس نور کو زمین کی تاریکی اور ستاروں کی روشنی مانگ رہی تھی وہ شہنشاہ نور عنقریب آنے والا ہے۔ اس کے بعد طلوع شفق ہوا اور ارماسات نمایاں ہوئے اور طلوع قریب ہو گیا۔ ابھی یہ سرچشمہ نور (آفتاب) سامنے

بھی نہیں آیا تھا۔ صرف پوہی پھٹی تھی، شفق ہی ابھری تھی کہ ظلمتِ شب نے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ستارے اک دم ماند ہو کر منہ چھپانے لگے۔ گو وہ محسوس نہیں ہوئے مگر ان کی چھوٹی چھوٹی نورانی ہستیاں نورِ عظیم کے دریا میں غرق ہو کر منظرِ عام پر نہیں رہیں یہاں تک کہ ان بشارتوں کے کچھ ہی عرصہ کے بعد آسمان کے چہرہ پر دکھتا ہوا ایک ایسا نور کامل نمودار ہوا کہ اس کے بعد شبِ ربانی کے لئے کسی نور کی حاجت باقی نہیں رہی۔ اس لئے ستارے انوار اپنا منہ ڈھانپ گئے اور سامنے سے ہٹ گئے۔ یعنی آفتاب عالمیاب طلوع ہوا اور اپنی لمبی لمبی شعاعوں اور کرنوں سے دنیا کے کھلے اور چھپے ہوئے حصوں تک اس نے منور کر دیا۔

ہر طرف اسی سرخیشہ نورِ آفتاب کی نورانی چادریں آفاق پر اس طرح چھا گئیں کہ ظلمت کا کہیں ڈھونڈنے سے بھی اثر باقی نہیں رہا۔ پس جو کام کروڑوں اور اربوں کھربوں ستارے مل کر بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ تھا آفتاب اور نہ آفتاب کی ذات بلکہ اس سے پھیلنے والی روشنی نے کر دیا اور تدریجی رفتار سے دنیا کی روشنی آفتاب نکلتے ہی مکمل ہو گئی جس کا سامان رفتہ رفتہ ابتداءً شب سے ہی کیا جا رہا تھا۔

روشن مطلع اور روشنی کے درجات

لیکن جس طرح طلوع ہوتے ہی سورج سب سے پہلے اپنی کرنیں نقطہ طلوع پر ڈالتا ہے۔ پھر عین مقام طلوع کو روشن کرتا ہے۔ پھر ذرا اور بلند ہو کر پورے مطلع کو روشن کر دیتا ہے اور پھر جہل جہل اونچا ہوتا ہے۔ دوں دوں روشنی کی تیزی مطلع کے چہار جانب آفاقِ عالم میں پھیلتی دکھائی دینے لگتی ہے جو مطلع کسی مرکزی حصے میں ہو جس سے روشنی چہار جانب پھیل سکے اور آخر کار پورے عالم کے کونے کونے میں روشنی پہنچ جاتی ہے۔ اندھیرے کمرے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

نقطہ طلوع

ایسے ہی آفتابِ نبوت نے طلوع ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے نقطہ طلوع کو روشن کیا جو آپ کا گھرانہ تھا اور گھرانہ حرم خانہ بنتا ہے تو اولاً محرمِ نبوی ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نور ایمان سے منور ہوئیں جس کے معنی پورے گھر کے روشن ہو جانے کے ہیں اور قوا انفسکم و اہلیکم فامراً (بچاؤ اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آغ سے) کا ظہور ہوا۔

مقام طلوع

پھر نبوت کا آفتاب اور اونچا ہوا تو مقام طلوع پر کرنیں پڑیں اور وہ روشن ہو گیا۔ یہ آپ کا قبیلہ تھا جس میں آپ کا ظہور ہوا اور یہ وانذر عشیرتک الاقرین (اور ڈراؤ اپنے قریبی رشتہ داروں کو) کا ظہور تھا اور پھر آفتابِ نبوت اور اونچا ہوا۔ یہاں تک کہ پورا طلوع ہو گیا تو مطلع کے ماحول پر روشنی پڑی اور یہ مکہ کا مقدس شہر اور اس کا ماحول تھا جس کے لتذرام القرىٰ ومن حولہا (تاکہ تم ڈراؤ مکہ اور اس کے ارد گرد کو) کا ظہور ہوا اور جب کہ اس آفتابِ جہانتاب کی روشنی گھر اور شہر و قبیلہ تک محدود رکھنی نہ تھی، بلکہ جہانوں کے کونے کونے میں پھیلانی تھی۔

مرکز دائرہ طلوع

تو جس طرح مادی سورج کا مطلع مشرقی افق کا بلند ترین حصہ دکھا گیا ہے تاکہ وہاں سے اس کی روشنی پورے عالم میں پھیل سکے۔ اسی طرح آفتابِ نبوت کے لئے مرکز طلوع کعبہ مقدسہ کو تجویز کیا گیا جو نافِ عالم اور وسط زمین تھا اور اسے دنیا کی اور ہر چہار سمت سے نسبت مساوی تھی۔ جیسا کہ مرکز کو اپنے دائرہ سے ہوتی ہے تاکہ اس کی کرنیں اگر ایک طرف بحیرہ روم کے کناروں سے ٹکرائیں جس سے اس کی روشنی مغرب

کی وادیوں میں پھیلے تو دوسری طرف بحر ہند کی لہروں سے جا لیں جس سے مشرقی ممالک ہند و سندھ، ایران و خراسان اور چین و جاپان روشن ہو جائیں اور اگر ایک سمت خلیج فارس کے ساحلوں پر اپنا نورانی سایہ ڈالیں جس سے شمال کے علاقے منور ہوں تو دوسری طرف خشکی میں براعظم مصر و سوڈان کے علاقے چمک اٹھیں۔ ایسے اس آفتاب کو افق مکہ سے بلند کیا گیا اور آپ نے اس ناف عالم سے آواز دی تو آپ کی صدائے ایمان جگہ جگہ پھیلی۔ سلاطین عالم اور اقوام و ملل کو آوازہ حق سے روشناس کیا۔ اور اس طرح لیکون للعالمین نذیراً: (تاکہ وہ ہمارا پیغمبر) جہانوں کے لئے ڈرانے والا ہو) کا ظہور ہوا۔ پس جیسے مادی آفتاب کے عروج اور چڑھنا میں روشنی کے درجات متفاوت ہوتے ہیں جو آفتاب کے تدریجی طلوع و عروج سے نمایاں ہوتے ہیں ایسے ہی آفتاب نبوت میں بھی علمی نور پھیلانے کے درجات متفاوت ہوئے جو اس نورانی آفتاب کے تدریجی ظہور کی صورتوں سے منظر عام پر آگئے اور آفتاب کا طلوع بالکل نزدیک آگیا۔

آفتاب نبوت اور نجوم ہدایت نور میں جزوی اور کلی کا فرق

پھر جس طرح ستاروں کی روشنی جزوی ہونے کی وجہ سے ایسی عمومی اور کلی رنگ کی نہیں ہوتی جو پھیلتی ہوئی چلے اور نہ ایسی تیز ہی ہوتی ہے کہ اس کا نورانی سایہ دھوے اور چاندنی کی طرح پھیل کر تمام اوجھل اور مخفی گوشوں کو بھی نمایاں کر دے۔ اسی طرح سابقہ نبوتوں یعنی شراعیہ سابقہ کی روشنی جزئیاتی اور مقامی رنگ کی تھی جس سے ان میں کوئی ایسا پھیلاؤ نہیں تھا کہ دنیا کی تمام قوموں کو ان کی متفرق نفسیات کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتیں یا زندگی کے تمام مخفی سے مخفی گوشے پر وہ چھا جاتے اور نہ ہی ان کے احکام ایسی جامع علتوں اور اصول پر مشتمل نظر آتے ہیں جس سے احکام میں اشعاب اور شاخ در شاخ ہونے کی صورتیں نمایاں ہوں۔ کیونکہ پھیلاؤ اور احاطہ کی شان اصول و عمل ہی میں ہو سکتی ہے۔ جزئیات محض میں نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک اصول کلی سامنے ہے تو

اس سے ہزار ماجزیات نکل کر پھیل سکتی ہیں اگر ایک قاعدہ کلیہ معلوم ہے تو ہزار یا احکام کا اس سے فیصلہ ہو سکتا ہے اور دین شاخ در شاخ ہو کر ایک ہمہ گیر قانون کی شکل میں آجاتا ہے۔ اگر مسئلہ جزوی بھی ہو مگر کسی علت پر مشتمل ہو جو اس حکم جزئی کا منشا ہے تو اس جزئی کی یہ اصولی علت بھی اس سے ہزار ماجزیات کے نکل آنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا جزئی حکم میں علت کلی تو نظر نہ آئے مگر خود حکم چند جامع اور مشترک قسم کے اوصاف پر مشتمل ہو تو اوصاف کی یہ عمومیت ہی بمنزلہ علت کلی کے بن کر جہاں جہاں بھی پائی جائے گی۔ وہیں وہیں اس حکم کو بھی منتقل کرتی رہے گی اور اس طرح نین کے کتنے ہی مجل اور مخفی حصے نمایاں ہو کر دین کو مفصل اور ہمہ گیر بنا دیں گے۔ بہر حال ادیان میں ہمہ گیری بغیر اصولیت کلیت اور جامعیت کے ممکن نہیں، محض جزئیت اور وہ بھی رسوائی کشان کی جزئیت سے دین میں وسعت پیدا ہونے کی بجائے اس میں محدودیت تنگی اور رجعت پسندی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شرائع سابقہ میں (جس ہیئت سے آج وہ ہمارے سامنے ہیں)۔
 جبکہ جزئیت کا غلبہ ہے اور احکام اصولی ہونے کے بجائے شخصیات رسوم کے رنگ کے ہیں جن کی پیروی محض شخصیتوں کی نسبت سے کی جاتی ہے۔ نہ کہ کسی اصولی حجت سے تو وہاں کسی اشعاب یا شاخ در شاخ ہو کر دین کے پھیلنے اور ہمہ گیر بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ محض جزئی سے جزئی پیدا نہیں ہوتی، جب تک کہ جزئی کسی علت کلی یا وصف عمومی پر مبنی نہ ہو۔ اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی جزئیاتی شرائع میں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے نئے نئے احکام نکالنے کی کوئی راہ ہی نہیں کہ دین بڑھے اور شاخ در شاخ ہو کر قوم بہ قوم چلے جبکہ ان کے احکام و مسائل میں علل کلیہ اور بنیادی حقائق کا وجود ہی نہیں، جو ان میں پھیلاؤ پیدا کرے۔ اسی لئے یہ شریعتیں نہ ہر دور میں چل سکتی ہیں نہ ہر دور کے وقتی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں اور اسی لئے ایسی شریعتیں ہر اگلی شریعت کے سامنے فسح و ترمیم کے مقام پر رہتی آئی ہیں اور منسوخ ہوتی رہی ہیں۔

ہاں اس تسخ و ترمیم سے محفوظ اگر ہو سکتی ہے تو صرف وہی شریعت جو خالص اصول

کلیہ اور جامع دستور زندگی کی بنیادوں پر قائم ہو اس میں بعض وقت یا کسی موجودہ قوم ہی کے مزاج کی رعایت نہ ہو، بلکہ انسانی فطرت اصل سمجھی گئی ہو، جو سارے انسانوں اور سارے اقوام میں قدر مشترک ہے تاکہ اس کے مشترک اور عمومی اصول سے دنیا کی ہر قوم اور ہر قوم کا ہر قرن اور ہر دور فائدہ اٹھاسکے اور تمام نئے نئے حوادث کے نئے نئے احکام کی بنیادیں اس میں پہلے ہی سے رکھی ہوئی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا نور سورج کے نور کی طرح عام ہو ستاروں کے نور کی طرح خاص اور محدود معین نہ ہو۔

سو اسلام کی آخری شریعت میں اصول و کلیت کے غلبہ کی وجہ سے یہی شان پائی جاتی ہے کہ وہ ترقی پذیر اور اصلی احکام کے ساتھ فرعی احکام کی ساری بنیادیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ فرعی احکام اصولی علتوں اور جامع حقائق سے پیدا ہوتے ہیں، سو اس کے ہر ہر جزئی حکم میں بھی کلی علتیں مخفی ہیں۔ ہر حکم کا ایک مناسبت ایک کلی بنیاد ہے جس پر وہ حکم وائر ہے۔ پھر کلیات اور اصول بھی کئی رنگ کے ہیں جن میں اساسی اصول الگ ہیں اور تفریعی اصول الگ۔ پھر اس کی تعبیرات اور اسلوب بیان الگ جامع اور فطرت کلیہ کا رنگ لئے ہوئے ہے کہ خود اس سے بھی احکام پیدا ہوتے ہیں۔ معانی الگ جامع اور عمومیت کے رنگ سے بھرے ہوئے ہیں اور ایک ایک حکم اپنی نوع کے تمام احوال اور تمام جانہوں اور پہلوؤں پر مشتمل ہے اور جو نسا پہلو وقت کے تقاضے سے قابل ترجیح ہو، اس کے سامنے کر دینے کی عبارت حکم میں صلاحیت رکھی ہوتی ہے۔ ایسے ایک آیت اور ایک روایت اس درجہ اپنے حکم کے نشیب و فراز، اوپنچ اور گرد و پیش کے طلبی احوال کی لچک لئے ہوئے ہے کہ وہ ہر دور میں زندگی کے ہر ہر موڑ اور وقت کے ہر تقاضے پر حاوی اور اس کے لئے رہنمائی کی قوت رکھتی ہے۔ یہ اصول شخصیتوں کو بنائے رہتے ہیں اور ان سے مختلف رنگ کے عملی اُسوے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ جو اصول کی روشنی سے ماہر نہیں ہوتے۔ پس اور جگہ وہ اُسوے ہیں جن کی بنیاد اشخاص میں اور یہاں وہ اُسوے ہیں جن کی بنیاد اصول ہیں اور شخصیتوں سے ان کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔ اس لئے اس دین کی چھتیں چار قرار دی گئیں۔ جن میں سے دو تشریحی ہیں جن

شریعت بنتی ہے اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں اور دو تفسیری ہیں۔ جن سے شریعت کھلتی ہے اور اس میں بسط و انبساط کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ اجماع و قیاس میں ظاہر ہے کہ قیاس و انبساط اپنا کام نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ خود دین کے احکام و مسائل میں کلیاتی علتیں رکھی ہوئی نہ ہوں۔ جن کی اصولیت سے فروع پیدا کی جائیں اور دین بسط کے ساتھ پھیل نہیں سکتا۔ جب تک کہ خود اس میں پھیل پڑنے کی صلاحیتیں نہ ہوں۔ لیکن جب کہ آفتاب نبوت کے دھوپ کی طرح پھیلتے ہوئے دین میں پھیلنے کی استعدادیں تھیں اور جزئیات کے ساتھ اس میں اصول کلیہ بھی ہر باب کے الگ الگ موجود تھے تو اجتہادی قوتوں نے دین کے اصول کلیہ میں سے جزئیات کو کھینچ نکالا اور جزئیات کو جزئیات پر کسی علت جامعہ کے اشتراک سے قیاس کر کے ایک جزئی کا حکم دوسری جزئی میں منتقل کیا اور پھر ایک باب کی ہیئت سے جزئیات کا تتبع کر کے کلیات اصول پیدا کئے۔ جن سے پھر ہزاروں نئی جزئیات کا فیصلہ ہوا۔ جس سے اس دین میں تفصیل کا باب کھلا اور یہ دین دنیا کی ہر قوم کے مزاج کے مناسب حال احکام اور انداز تربیت کا جامع ثابت ہوا۔

اگر دین میں اصولیت و ہمہ گیری اور اس کے اصول میں فروع کی تفریح کی یہ صلاحیت نہ ہوتی یعنی یہ دین بھی اور ادیان کی طرح جزوی رنگ کا ہوتا جس میں رسوم محض ہوتیں۔ حقائق عامہ نہ ہوتیں تو اجتہاد و استنباط کی قوتوں کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ جیسا کہ ادیان سابقہ میں نہیں ہوئی اور وہ محدود ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئے۔ پھر نہ ہی اس دین میں دین کے اصول کلیہ میں سے نکلی ہوئی ان تفصیلات کا کوئی تصور ہوتا۔ جن سے دین شاخ در شاخ ہو کر دنیا کی ہر قوم کے درد کا درماں بن سکتا اور اس میں تا قیام قیامت بقار و ابدیت کی شان پیدا ہوتی لیکن جبکہ دین کی جامعیت اور ہمہ گیری کا نقشہ وہ ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو اسی کا طبعی تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا اور ہوا کہ اس امت کے قلب و دماغ میں اس جامع دین کی تربیت سے اجتہادی قوتیں اور استنباطی طاقتیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے ان اصول اور کلیاتی علتوں سے بتقاضا وقت فروع نکالیں اور نکالنے کے اصول بھی اسی جامع شئون سے وضع کئے جس سے مختلف رنگ کے فقہ پیدا ہو کر مذاہب اجتہاد نمایاں ہوئے اور بالفاظ دیگر تفریح

اصلیہ میں سے شرائع وضعیہ نکلیں جن سے دنیا کے مختلف الاوان طبقات کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق دین پر عمل کرنے کی راہیں نظر آگئیں اور اس طرح یہ دین اپنی مختلف شانوں کے ساتھ قوم بہ قوم ملک بہ ملک اور زمانہ بہ زمانہ پھیل کر عالمگیری کے ساتھ چلا اور بڑھلا گویا جس طرح دنیا کی اقوام کے مزاج مختلف جذبات الگ اور رجحان و میلانات جدا جدا تھے۔ کوئی قوم نرم خوب ہے اور کوئی تند خوب۔ کوئی وسعت پسند ہے اور کوئی ضیق پسند کوئی ترقی پسند ہے۔ کوئی رجعت پسند۔ کوئی انفرادیت دوست ہے اور کوئی اجتماعیت پسند۔ کوئی دیانت مزاج ہے اور کوئی سیاست کیش اور پھر جیسے حق تعالیٰ نے اقوام عالم کے ان مختلف طبعی اور فطری جذبات کی تسکین کے لئے خود دین کے احکام و اصول میں نرمی و گرمی، انفرادیت و اجتماعیت، خلوت و جلوت، وسعت و محدودیت، دیانت و سیاست، درویشی و شاہی عقل و نقل، حکم و حکمت اور زہد و توسع وغیرہ کے سارے ہی مختلف رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تاکہ دنیا کی کسی قوم کے کسی بھی ذوق کا کوئی تقاضا ایسا نہ رہے جسے یہ عالمگیر دین پورا نہ کر سکے تو ایسے ہی اس کی فیاض قدرت نے امت میں مجتہدین بھی ایسے مختلف المزاج، مختلف المذاق اور مختلف الاوان پیدا فرمائے جن کے مذاق الگ الگ مزاجوں کا رنگ جدا جدا اور دیانت و حق پرستی کی قدر مشترک کے ساتھ ذوق الگ الگ ہوئے بعض کے مزاج میں احتیاط کا غلبہ ہے جو دین کی عبارت و تعبیر سے ایک پنج ادھر ادھر ہونا نہیں چاہتے اور بعض میں توسع اور ہمہ گیری کا غلبہ ہے جو دین کی روایت سے اس کی روایت میں گھسن کر اس سے عالمگیر رنگ کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ بعض میں فرد کی اصلاح کو اصل رکھنے کا جوش ہے اور بعض میں جماعتی نظام کو بھی برپا رکھنے کا جذبہ ہے۔ بعض پر نفس دین کی تنقح اور اس کی استواری کا جوش غالب ہے اور بعض میں اس کی ساتھ نظم دین اور نظام ملت کی استواری کی اہمیت بھی جاگزیں ہے۔ بعض میں دینی معیار سے طبقاتی نظام کی برقراری کے دواعی غالب ہیں اور بعض میں نظام ملکی اور ہمہ گیر تنظیم کے جذبات کارفرما ہیں۔ بعض مسائل تک محدود رہنا چاہتے ہیں اور بعض مصالح مرسلہ کو بھی نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔ بعض قرب و اقرباات کے رنگ سے چلتے ہیں اور بعض

رفق دار اتفاقات کو بھی ساتھ ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

غرض رب العرش نے جتنے رنگ، دین میں جمع کئے۔ اتنے ہی ذوق دانا یا اپنے دین میں بھی پیدا کر دیئے تاکہ ہر ایک ذوق کا حکیم اور مجتہد اپنے اپنے مکتب فکر کے مطابق دین کے مطمح نظر کو سمجھے اور جب امت میں سے اس ذوق کے خاص طبقات اس توافق رنگ کی وجہ سے اس کی طرف بھکیں تو وہ اسی رنگ میں اپنے ماننے والوں کو تربیت دے تاکہ ہر طبقہ کے فطری جذبات کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی کا سامان اہل دین کی وساطت سے دین ہی میں سے مہیا ہوتا رہے۔ غرض اقوام عالم میں سے جس قوم پر جس قوم کے طبعی یا عقلی یا ذوقی رجحانات کا غلبہ ہو، وہ اسی ذوق کے مجتہد و امام کا دامن سنبھال کر اپنے لئے دنیوی و آخروی نجات کا سامان مہیا پہنچاتا رہے اور دنیا کے کسی طبقہ کو بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مثلاً وہ فطرتاً فلال پہلو کو معقول سمجھتا ہے۔ مگر وہ دین کے اصول و فروع میں موجود ہی نہیں۔ یا ہے تو خفی اور لپٹا ہوا ہے۔ جسے کوئی مفکر کھول نہیں سکا۔ اس لئے وہ اس دین کو ناقص سمجھ کر اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک فرد اور طبقہ کو اس کی روحانی دوا اور غذا اس جامع دین میں باسانی میسر آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جامعیت کا یہ رنگ آفتاب نبوت ہی کی شریعت میں ہو سکتا تھا۔ نہ کہ عام نجوم ہدایت کی محدود شرائع میں۔ وجہ آفتاب ہی کی مثال سے واضح ہے کہ آفتاب بلاشبہ ایک ہے اور اس سے چھوٹے والی دھوپ بھی ایک ہی ہے۔ جسا رنگ بھی ایک ہی ہے۔ جو ہر ذرو دیوار پر پڑتا ہے۔ لیکن جب کہ وہ پھیلنے والی ہے اور پھیل کر ہر ذرو دیوار اور روزن و سوراخ میں پہنچ جانے والی دھوپ ہے تو اُسے جس رنگ کے آئینہ سے نمایاں کیا جائے گا۔ وہ اسی رنگ میں نمایاں نظر آئے گی۔ جو درحقیقت آئینہ کے طرف کا رنگ ہوگا۔ دھوپ کا نہیں۔ مگر پھر بھی وہ دھوپ سورج ہی کی کہلائے گی۔ خواہ اس کا رنگ کچھ بھی ہو اور آفتاب ہی کی روشنی شمار ہوگی۔ خواہ وہ کسی بھی رنگ میں نمایاں ہو۔ تاہم اُسے مختلف رنگ کے آئینوں سے اس لئے نمایاں کیا جاتا ہے کہ دھوپ لینے والے طبقہ کی آنکھوں کو اسی رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک طبقہ کی مینائی گزور ہے جسے سورج کی بلا واسطہ روشنی خیرہ بنا دیتی ہے تو اُسے لامحالہ بزرنگ کے آئینہ سے دھوپ دیکھنے کی ضرورت پڑیگی۔ جس سے اس روشنی کا تحمل کر سکے۔ ایسے ہی اور رنگوں کو بھی قیاس کر لیا جائے۔ اندر میں صورت اُسے خیرگی کا عذر کر کے دھوپ سے بھاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ بزرنگ کا آئینہ تلاش کر کے اس کے پردے میں سے دھوپ لینے کی ضرورت ہے۔ پس دھوپ تو ایک ہی ہے مگر آئینوں کے رنگوں کی وجہ سے اس میں شدت و خفت اور تحمل یا برداشت اور عدم برداشت کا فرق پڑ جاتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دھوپ پھینکنے اور آئینوں کے پردوں سے اُسے رنگ بزرنگ انداز میں پھیلانے کی صلاحیت آفتاب ہی میں ہے ستاروں میں نہیں، کیونکہ ستاروں میں پھیلتی ہوئی روشنی ہی نہیں جو آئینوں کے راستے سے مختلف رنگوں میں نمایاں ہو۔ آپ رات کے وقت ستاروں کو کتنے ہی آئینے دکھلائیں یا تو ان کی روشنی آئینہ میں نمایاں ہی نہ ہوگی اور کچھ ہوگی تو پھیلتی ہوئی نہ ہوگی جو آئینوں کے واسطے سے کوٹھول اور کروں میں پہنچائی جاسکے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ستارے خود تو آئینہ میں نمایاں ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی کوئی پھیلتی ہوئی شعاع جیسے آئینوں سے واسطے بغیر بھی نہیں پھیلتی تھی۔ ایسے ہی براستہ آئینہ بھی نہیں پھیل سکے گی کہ وہاں پھیلتی ہوئی شعاع یا چاندنی ہے ہی نہیں جسے بلا واسطہ یا بالواسطہ پھیلایا جاسکے۔

اس تمثیل سے واضح ہے کہ آفتاب نبوت سے قبل کی راتوں میں جب کہ نجوم بدایت اپنی اپنی جگہ نمایاں تھے تو ان کی روشنی یعنی شرعی ہدایتیں جزئیاتی تھیں جو ان کی شخصیاتی خصوصیات سے وابستہ تھیں۔ ہمہ گیر اصول اور جامع علل و کلیات پر مبنی نہ تھیں۔ جنہیں پھیلنے والی روشنی سے تعبیر کیا جاسکے اور وہ عالم کے ایک ایک کونے میں پہنچے اور بعد تک پہنچتی رہے، اس لئے ان اصول میں تفقہ و اجتہاد کی شان بھی نہ تھی اور مجتہدین کا وجود بھی نہ تھا کہ وہ شریعت ان کی روشنی میں شاخ در شاخ ہو کر آگے چلتی اور مردوام حاصل کرتی۔ بالفاظ دیگر امام سابقہ میں شرائع اصلیہ۔ تو تھیں مگر شرائع وضعیہ نہ تھیں۔ ان میں احکام ضرور تھے۔ مگر ہمہ گیر عقل و

اسرار کا وجود نہ تھا۔ پس ان میں ذوق واحد تھا۔ دنیا کی مختلف قوموں کے مزاج اور امتوں کے رنگ برنگ ذوقوں کا اجتماع نہ تھا۔ اس لئے ایک ہی طبقہ اپنے مناسب مزاج اس شریعت کو قبول کرتا تھا اور اس کے ذریعہ نجات حاصل کر لیتا تھا اور وہ درحقیقت اسی کیلئے مخصوص طور پر آسمان سے اترتی بھی تھی۔ دوسرے طبقات کے لئے دوسری شریعت اور دوسری پیغمبری درکار ہوتی تھی۔ پس دین قومی اور وطنی ہوتا تھا۔ عالمگیر اور ابدی نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ نجوم ہدایت کا دین تھا جو مخصوص اور محدود روشنی لے کر آئے تھے۔ آفتاب ہدایت کا دین نہ تھا جس کی روشنی عالمگیر ہوتی ہے۔

کان البنی یبعث الی قومہا
 پہلے نبی اپنی اپنی قوموں کی طرف خاص کر کے
 خاصۃً ویبعث الی الناس
 بھیجے جاتے تھے (کہ وہ ہدایت کے
 تارے تھے) اور میں ساری دنیا کے
 کافۃً

انسانوں کے لئے (بلا تفریق قوم و وطن)
 بھیجا گیا ہوں (کہ آفتاب نبوت ہوں)

اس لئے اگر کسی پہلے نبی کی شریعت غیر قوموں کے لئے ناقابل تحمل ہوئی تھی تو وہ ان کے لئے بھیجی بھی نہ جاتی تھی اور نہ ہی دوسری قومیں اس کی مکلف ہوتی تھیں۔ انہیں صورت ان شریعتوں کو مختلف المزاج قوموں اور طبقات کے لئے مختلف الاطلاق بنانے کی ضرورت نہ تھی کہ انہیں مختلف الذوق مجتہدوں کے رنگ برنگ آئینے لاکران کی روشنیوں کو ہلکایاتیز کر کے نمایاں کیا جائے اور خواہ مخواہ ہر امت کے لئے قابل قبول بنایا جائے۔ مگر آفتاب نبوت کی روشنی یعنی اسلامی شریعت دھوپ کی طرح ہمہ گیر اور عمومی و اصولی ہونے کی وجہ سے دنیا کے ہر طبقہ اور ہر قوم کے لئے پیغام تھی اور طبقات کی قوت برداشت اور مزاج الگ الگ تھے۔ اس لئے اس کی پھیلتی ہوئی ہمہ گیر روشنی کو مختلف مزاجوں کے موافق بنانے کے لئے مختلف رنگوں کے آئینوں یعنی رنگ برنگ آئمہ مجتہدین مجددین اور علمائے مفکرین کی ذات تھی جو اپنے مختلف الذوق دلوں میں اس شریعت کے اصولی علم کو جذب کر کے اپنی اپنی مخصوص قوت اجتہاد اور اپنے خاص مکتب فکر سے اسے نمایاں کریں تاکہ دنیا کا ہر

طبقاتی ذہنیت اور اپنے مذاق و مزاج کے مناسب حال امام کا انتخاب کر کے اس کے۔۔۔۔۔ مکتب فکر کے دائرہ میں دین کو سمجھے اور وسیلہ نجات بنائے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ دین میں میرے فلاں فطری مذاق کا کوئی سامان موجود نہیں تو میں اس دین کا مکلف نہیں ہوں۔

آفتاب اور ستاروں کے نور میں جزوی اور کلی کا فرق

لیکن آسمان نبوت کے ان ستاروں کی روشنیاں خود ان کی ذوات یا ذوات سے سرزد ہونے والی ذاتی علامتوں تک ہی محدود تھیں یعنی وہ خود بذاتہ ہدایت کے روشن منارے تھے جنہیں دیکھ کر دین کا راستہ ملتا تھا۔ ان کی شریعت صرف ان کا عملی اسوہ ہوتا تھا جسے دیکھ دیکھ کر اس کی پیروی کی جاتی تھی۔ لیکن ان سے پھیلنے والی روشنی دھوپ یا چاندنی کی طرح نہ تھی کہ ان سے غائب رہنے والے دنیا کے سب لوگ بھی جو ان کی شریعت کے مخاطب نہ تھے۔ ان کی ذوات سے وہی فائدہ اٹھا سکتے جو سامنے رہنے والے اٹھاتے تھے کیونکہ پھیلاؤ کی یہ صورت کہ حاضر و غائب یکساں ہدایت بخش ہو۔ اصول و قوانین کے علم کی ہوتی ہے، نہ کہ محض نمونہ عمل کی عمل عامل کی ذات کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس لئے جو ذات کو دیکھ رہا ہے۔ وہ عمل کو بھی دیکھ رہا ہے ذات نگاہ سے اوجھل ہوئی تو اس کا عمل بھی سامنے سے غائب ہو گیا۔ لیکن علم و اصول ہی وہ چاندنی ہے جو ذات سے نکل کر ذات کے بعد تک چلتی رہتی ہے کیونکہ علم عالم کے اٹھ جانے سے نہیں اٹھتا، بلکہ بدستور اس کی روشنی قائم رہتی ہے اور علم میں بھی جبکہ امور کلیہ قواعد عامہ اور اصول کلی کی روشنی بھی سمائی ہوئی ہو تو وہ علم قرون و دہوراؤ زمانوں کی قید سے آزاد ہوتا اور اب تک روشنی پہنچاتا رہتا ہے۔

پس انبیائے سابقین کی شریعتوں میں غلبہ عملی رسوم اور نمونوں کا ہوتا تھا۔ علم کا نہیں۔ وہی نمونے ان کی آسمانی کتابوں میں منضبط کر کے اقرار کر دیئے جاتے تھے اور ان نمونوں سے متعلق جتنے علم کی ضرورت ہوتی تھی وہ نوشتوں اور یادداشتوں کے ذریعہ

دیا جاتا تھا۔ گویا عمل سے علم ہوتا تھا۔ علم سے عمل نہ تھا۔ شریعتیں علم کی گہرائیوں اور احکام کی جامع علتوں پر مشتمل نہ ہوتی تھیں کہ احکام علمی علتوں پر مبنی ہو اور اعمال کو نشوونما دینوالے ان کے مخفی علل و اسرار اور حقائق و معارف ہوں۔ جن کے عموم سے دین عام و وسیع الاحکام اور پائیدار ہو کر ہر دور کے تقاضوں کو ان اصول کلیہ کی وسعتوں کی روشنی میں پورا کرتا چلا جائے۔ تا آنکہ بعد والوں کے لئے بھی وہ ان اصولی علوم و کلیات کے ذریعہ اسی طرح ہدایت بخش ثابت ہو، جس طرح حاضر الوقت افراد و اقوام کے لئے تھا۔ اس لئے دین کی صورت یہ ہوتی تھی کہ انبیاء اور ان کے خلفاء کی موجودگی میں جب تک یہ عملی نمونے بحالہ قابلہ قائم رہتے تھے، دین باقی رہتا تھا اور جو نہی شخصیتیں اٹھ جائیں۔ وہ بے روح ہو کر ختم ہو جاتا تھا۔ کیونکہ وارد مدار دین کی شخصیتوں اور ان کے محسوس نمونہ مائے عمل پر تھا۔ پس عمل کی روح شخصیتوں کا وجود تھا جو پائیدار نہیں ہوتیں نہ کہ علمی اصول حقائق عامہ اور قواعد کلیہ پر جو دوامی ہوتے ہیں۔ اس لئے دین کا نقشہ بالآخر بگڑ کر دوسرے دین کے لئے جگہ خالی کر دیتا تھا اور اس سے بنی ہوئی قوم ختم ہو جاتی تھی۔ حدیث ذیل سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول الله	ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول
صلی الله علیه وسلم ما من نبی	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی نبی
بعثه الله فی امتہ قبلی الا کان	جسے اللہ نے اس کی امت کی اصلاح کے
لہ فی امتہ حواریون واصحاب	لئے بھیجا ہو، ایسا ضرور ہوا ہے کہ اس کی
یاخذون بسنة ویقتدون بامرہ	امت میں اس کے حواری اور دوست
ثم انہا تخلف من بعدہم خلف	ہوتے تھے جو اس کی سنت کو اختیار کرتے
یقولون ما لا یفعلون ویفعلون	تھے اور اس کی بات کی پیروی کرتے تھے
ما لا یؤمرون الی اخر الحدیث	مگر آخر کار ان کے بعد ایسے خلف پیدا ہو
(مشکوٰۃ باب الامتناع بالسنتہ)	جاتے تھے جو دعویٰ وہ کرتے تھے
	جو عمل میں نہیں لاتے تھے اور عمل وہ کرتے

تھے جس کا انہیں امر نہیں کیا گیا تھا۔
 اس سے واضح ہے کہ امم سابقہ میں سنت انبیاء اور اسوہ ہائے پیغمبری شریعت
 ہوتے تھے جس کی اقتدار کی جاتی تھی۔ لیکن ان انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی خلفاء
 کے گزر جانے کے بعد جبکہ اس سوئے کے عملی نمونے اور اس کے پابند لوگ باقی نہ
 رہتے تھے تو شریعت کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ کیونکہ دلائل و حقائق کی علمی قوتیں ان نمونوں
 کی پشت پر نہ ہوتی تھیں کہ وہ اس بگاڑ کو سنبھال کر سنوار سے بدل دیں اور کچھ ہوتی بھی
 تھیں تو صرف انہیں گرم عمل کے بتانے کیلئے ہوتی تھیں۔ ان کو بنانے کیلئے نہیں۔
 چنانچہ اقوام سابقہ کی باقیات آج جن رسوم پر قائم ہیں۔ اگر وہ ان کے دعووں کے
 مطابق وہی قدیم رسوم ہیں جو ان کے انبیاء نے انہیں وراثت میں دی ہیں تو اس سے یہ
 مذکورہ دعویٰ واضح ہو جاتا ہے کہ شرائع سابقہ کی بنیاد علوم و حقائق یا دلائل و شواہد کے
 بجائے زیادہ تر شخصی یا قبائلی رسوم اور مخصوص عملی ہستیوں پر تھی۔ چنانچہ آج بھی اگر ان سے
 ان رسوم کی دلیل پوچھی جائے تو وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ :-

انا وجدنا اباہنا علیٰ امة وانا
 علیٰ اثارہم مقتدون :-
 ہم نے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے
 اور ہم بھی ان کے پیچھے چلے جا رہے

ہیں :-

کیونکہ ان کے پاس اثار کے سوا وجوہ و دلائل ہیں ہی نہیں اور اثار وہی ماضی کے رسوا
 و نقوش ہوتے ہیں جنہیں پھلوں کا نقش قدم کہہ کر بلا دلیل اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی کو عرفی
 محور پر رسم و رواج کہا جاتا ہے۔ جن میں وجوہ و دلائل کی روح نہیں ہوتی۔ ڈھانچہ ہی ڈھانچہ
 ہوتا ہے۔

پس آیت اور حدیث بالا اس کی کھلی شہادت ہے کہ امم سابقہ منہاجول
 شریعتوں میں زیادہ زور نمونہ ہائے عمل ہی پر رہتا تھا۔ طبعی ماحول اور حقائق کلیہ پر نہیں جس
 سے دین میں جان اور قوت تھا کی سزا و نقصان کی استعداد پیدا ہو جاتی جو اس دین کو ہمہ
 گیر بناتی ہے۔

عبادات مذہب

چنانچہ ان کی عبادتوں کو دیکھو تو وہ پہلی مجموعہ رسوم نظر آئیں گی۔ جیسے کسی قوم میں عبادت کے وقت گھی جلانا، گھنٹیاں بجانا، سکھ بھونکنا وغیرہ۔ اگر معبودوں کے ساتھ طریقِ محبت و خدمت کو دیکھو تو بتوں کے سامنے کھانے رکھنا، پانی پیش کرنا اور پھر اُسے خود بخود ان کا پس خوردہ قرار دے کر تبرک سمجھ لینا رسم بے حقیقت نہیں تو اور کیا ہے۔ جس کے نیچے کوئی بھی عقلی یا نقلی حجت اور اصل کلی نہیں بجز اس کے کہ باپ دادا کی رسم کہہ لی جائے، عیسائیوں کے یہاں بوقت عبادت صلیب کی رسیوں میں گہریں باندھنا اور کھولنا کسی کو پتہ دیتے وقت یعنی عیسائیت میں داخل کرتے وقت زرد رنگ کا پانی اس پر پھونکنا خاکساری کے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے پورے بدن کو خاک آلود کر لینا اور محبوت ملنا ترک دنیا (رہبانیت) کرتے وقت مخصوص گیر و لباس اختیار کرنا اور سر منڈانے کی رسم ادا کرنا۔ تواضع اور عبدیت کی صورت بنانے کے لئے گھر گھر اور دکان دکان بھیک مانگنا نکاح کے سلسلہ میں زوجین کو باہم باندھنے کے لئے ایک دوسرے کے دامن کو کپڑے کی گرہ سے باندھ دینا وغیرہ سب فہمی حسی اور مظاہرہ آمیز رسوم ہیں جن کے اندر علمی روح اور اصولی طاقت بطور حجت کے سمائی ہوئی نہیں۔ صرف اگلوں کے عمل کی رسوم ہیں جنہیں محض اگلوں کی تقلید سمجھ کر برتا جا رہا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان اقوام میں احکام کا مدار عقل کلیہ اور حقائق علمیہ پر نہیں بلکہ تقلید آباؤی اور رسوم پرستی ہے گویا مذہب کی پہچان ہی علمی دلائل نہیں، عملی رسوم ہیں، خواہ بے دلیل ہوں یا خلاف دلیل۔

شعائر مذہب

پھر مذہب ہی نہیں ان مذاہب میں مذہبی انسانی کی علامتیں بھی رسوم و نقوش ہی کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں جو افرادِ مذہب سے لگی رہتی ہیں اور ان ہی سے وہ اس کے افراد سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے عیسائیت کے لئے صلیب کا نشان گلے میں ہونا

شعاردین اور عیسائیت کی امتیازی علامت ہے۔ ہندو کے لئے زنا رگلے میں اور قشقہ
پیشانی پر اس کے دھرمی ہونے کی علامت ہے یا سکھ کے لئے کڑا ماتھے میں کرپان
گلے میں، کنگھاسر میں اور بال پورے بدن پر اس کے مذہبی ہونے کا نشان کہا جاتا ہے۔
جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علمی امتیں نہیں کہ علم و استدلال سے انہیں یا ان کے مذہب
کو پہچانا جائے بلکہ رسمی قومیں ہیں جن کا تعارف مخصوص حتی رہم و رواج اور محسوس قسم
کے جسمانی نشانات سے ہوتا ہے۔

تصورِ معبود

محسوس پرستی اور رسم پرستی کی حد ہے کہ یہ اقوام معبود کو بھی بلا کسی رسمی صورت کے
نہیں پہچان سکتیں اور ان کی عبادت کا بھی اس وقت تک تحقق نہیں ہوتا۔ جب تک کہ
معبود کسی مخصوص صورت میں ان کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ کسی قوم نے تو معبود کا
پیکر، پتھر اور سونے چاندی وغیرہ کی صورتوں کو قرار دیا۔ کسی نے گائے، بھینس، بیل وغیرہ کی
صورتوں کو۔ کسی نے روشنی اور آگ کو کسی نے پانی اور دریا کو۔ کسی نے درخت اور پھول پتوں
کو کسی نے سورج اور چاند تاروں کو کسی نے اعضاء انسانی کو، کسی نے ذرائع آمدنی اور وسائل
زر کو اور کسی نے آلات صنعت و حرفت کو سمجھا جن کی پرستش مذہب کہلائی۔ غرض کوئی
نہ کوئی حسی صورت جب تک ان کی نگاہ کے سامنے نہ آجائے، وہ معبود حقیقی کو جان بھی
نہیں سکتے تھے۔

یہود کی اس حس پرستی کا جذبہ جب انتہا کو پہنچ گیا تو اس کی تسکین اس وقت تک نہ
ہوئی۔ جب تک کہ خدا کو بھی آنکھوں سے دیکھنے کی فرمائش نہ کر لی۔ چنانچہ فرعون سے
نجات پا کر بنی اسرائیل کا جب صنعا زمین سے گزر ہوا اور وہاں پتیل کی مورتیاں بھتی دیکھیں
تو چلا اٹھے۔

یا موسیٰ اجعل لنا الہا کما لہو
اے موسیٰ ہمیں بھی ایسا ہی (مصور) خدا
دیکھئے جیسا ان کے پاس ہے۔
الہو

اور آخر کار اپنی اس محسوس پسندی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر صاف ہی پکار اٹھے۔
 لَنْ نُوْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللّٰهَ
 ہم تم پر (اے موسیٰ) سرگزی ایمان نہ لائیں گے
 جب تک خدا کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ
 جَہَنَّةً

لیں۔

نصاری نے اس حس پسندی اور رسم پسندی سے مغلوب ہو کر ایک
 (جسم والا خدا) مانا جو ان کے یہاں حضرت یسح علیہ السلام میں کیونکہ محسوسات
 کے خوگر انسانوں کو کوئی چیز بھی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتی۔

شرائع مذہب

غرض مجموعی طور پر پرانے مذہب اور سابقہ شریعتیں اپنے تمام اجزاء سمیت زیادہ
 تر حیاتی اور رسمی انداز کی ہوتی تھیں جس میں عقیدہ عمل کی چند بندھی بڑی رسمیں سامنے
 ہوتیں تھیں جنہیں عوام بہ سہولت اختیار کر کے اپنے کو پیر و مذہب باور کرتے تھے
 اگر ان رسوم کو ترک کر دیا جائے تو ان اقوام کی مذہبی عرفیت مضحل اور ان کی پہچان
 بے نشان ہو کر رہ جائے کیونکہ مدار مذہب فقہ و بصیرت، حجت و برہان، استدلال و بیان
 اور احکام کی علمی اور اصولی علتوں کی تحقیق و تفتیح پر نہیں بلکہ صرف ان رسوم اور ظاہری علما
 کے پابند ہو جانے پر ہے جن کو بطور علامت اپنا لینے ہی سے آدمی دھرمی ہو جاتا
 ہے اور اُسے کسی فقہ نفس یا دلیل یا ذوق و وجدان کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ان رسوم
 کی صحت و سقم کو سمجھے یا سمجھا سکے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حسی جزئیات میں صرف بصر کی
 ضرورت پڑتی ہے بصیرت کی نہیں اس لئے جب تک یہ رسوم انبیاء یا ان کے خلفاء
 کی موجودگی میں اپنی معنویت کے ساتھ باقی رہتی تھیں بہدائیت کا ذریعہ نبی رہتی تھیں لیکن
 انبیاء کی عدم موجودگی یا ان کے اولین جانشینوں کے اٹھ جانے کے بعد یہ رسمیں رسوم بے
 حقیقت بن کر رواج محض رہ جاتی تھیں جن میں نہ روح ہوتی تھی نہ حقیقت اور نتیجہ یہ
 نکلتا تھا کہ یہ بے روح دین ختم ہو جاتا تھا اور نئے دین کی داغ بیل پڑ جاتی تھی۔

خوارق مذہب

پھر اسی طرح ان اقوام کی حس پسند ذہنیت کے مناسب دین کی اعجازی حجت اور نبوت کی دلیل یعنی خوارق و معجزات بھی صرف علمی اور حسی ہی دیئے جاتے تھے۔ جن کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی یہ اقوام تسلی پاتی تھیں اور متبع پیغمبرین کر دین کی راہ لگی رہتی تھیں۔ جیسے عصا، موسیٰ، ید بیضا، احیاء عیسیٰ، نار خلیل، ناقہ صالح، قیض یوسف، ظلہ شعیب، حجر العرش سلیمان وغیرہ سب آنکھوں ہی سے دیکھنے کے معجزات ہیں جو علمی تھے۔ علمی نہیں اور عملی باتیں عامل کی ذات اور شخصیت تک ہی قائم رہتی ہیں۔ جب عامل رخصت ہوتا ہے تو وہ بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ علمی معجزے دکھانے والی مقدس ہستیاں جب اٹھ گئیں تو ان کے یہ علمی معجزات بھی ختم ہو گئے اور دلیل نبوت کم ہو گئی جس کے سہارے یہ نبوت قوم بہ قوم اور ملک بہ ملک آگے نہ چلی اور اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوا اور ہونا تھا کہ یہ گمشدہ دلیل کی نبوت آنے والی نسلوں کے لئے براہ راست حجت اور واجب الاتباع باقی نہیں رہتی تھی۔

حاصل یہ نکلا کہ اگلے مذاہب کے سلسلہ میں احکام اور حججوں کو تو وہ جتیں سب شخصیات اور رسمی قسم کی ہوتی تھیں۔ جن کا دار و مدار شخصیتوں پر ہوتا تھا۔ اصول کلیہ پر نہیں اس لئے شخصیتوں کے اٹھ جانے سے جب ان کا عملی نمونہ سامنے نہ رہتا تھا تو شریعت کی صورت بھی بحالہ قائم نہ رہتی تھی۔ محض رسوم و رواج اور ان کی بھی نقل در نقل رہ جاتی تھی۔ جس میں روح مذہب تو بجائے خود ہے۔ صورت عملی بھی صحیح باقی نہ رہتی تھی۔ اس لئے یہ بے روح اور متغیر شریعت آخر کار کم ہو کر نئی شریعت کے لئے جگہ خالی کر دیتی تھی۔ ادھر معجزات کو جو دلیل نبوت اور دلیل شریعت ہے تو وہ بھی عملی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ عملی کرامت بھی جوں ہی صاحب عمل کی ذات کے ساتھ اٹھ جاتی تھی تو دلیل نبوت باقی نہ رہتی تھی۔ جسے پیش کر کے وہ نبوت اور اس کی شریعت منوائی جاسکے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ مذہب و شریعت آگے نہ بڑھ سکے اور ختم ہو کر دوسرے

کسی زندہ مذہب کیلئے جگہ خالی کر دے جس کا خلاصہ دوسرے لفظوں میں وہی نکل آیا کہ ستاروں کی طرح انبیاء سابقین کی روشنیاں خود ان کی ذوات تھیں، خواہ بلحاظ احکام و عمل دیکھا جائے یا بلحاظ معجزہ کرامت یعنی دین کی صورت اور اس کی حجت سب شخصیات اور رسومیں انداز کی تھی۔ اس لئے ان حضرات سے صرف ان کا قریبی ماحول تو روشن ہو جاتا تھا اور ان کے وہ مخصوص وابستگان ملک و قوم جو شخصیت سے قریب ہوتے تھے ان میں نور ایمان اور گرمی اخلاق حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن دوسری اقوام کو ان سے کوئی سردکار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے نہ ان کا پیغام ہمہ گیر ہوتا تھا نہ ان کی توجہ و تصرف اور تربیت عام ہوتی تھی اور نہ شریعت ہی عالم گیر اور بین الاقوامی ہوتی تھی جو عالم کو اپنی پیٹ میں لے۔ اسی حقیقت کو لسان نبوت پر فرمایا گیا۔

کان النبی یبعث الی قومہ
 خاصۃً وبعث الی الناس
 کافۃً

ہر نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا (گویا اس کی دعوت قومی اور مقامی ہوتی تھی) اور میں سارے انسانوں کی طرف (بین الاقوامی دعوت دیکر) بھیجا گیا ہوں۔

پس ان نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کی مثال وبالنجیم ہم یہتدون؛ کی سی تھی کہ ستاروں کی طرح خود علامات ہدایت تھے۔ لیکن ان سے پھیلنے والی کوئی عمومی اور کلی روشنی نہ تھی۔ جو وقت کی پوری دنیا کو اپنے ہمہ گیر دائرہ میں لے سکتی چہ جائیکہ وہ قیامت تک آنے والوں کے لئے حجت ہوتی۔ اس لئے ہدایت کا تعلق صرف ان کے ذاتی اسوے سے ہوتا تھا نہ کہ اصولی اور کلی روشنی سے اور یہی اسوے یا مخصوص رسوم عمل بذیل کتاب منضبط کر کے انہیں دے دی جاتی تھیں۔ جو بمنزلہ ایک یادداشت کے ہوتی تھیں۔ نہ بمنزلہ ایک قانون کلی یا دوامی دستور العمل کے۔ اس طرح اصلاح باطن کے سلسلہ میں نفس امارہ اور شیطانی وساوس کا مقابلہ ان کے تصرفات اور کرامات سے ہوتا تھا۔ جو ذوات کے ساتھ وابستہ ہوتی تھیں۔ گویا ستاروں اور شہاب ثاقب کی طرح ان کی ذوات ہی خود شیاطین پر پھینک ماری جاتی تھیں۔ جس سے شیطانی وساوس کا تار پود

بکھر جاتا تھا۔ گو علمی یا استدلالی قوت دفع و ساوس اور دفع مکاسد کی نہیں ہوتی تھی جو اصولی طور پر ہمیشہ دنیا کے لئے اس باب میں کارآمد ثابت ہوتی، اس لئے ان نجوم ہدایت کے یہ مذاہب جزئیاتی اور محدود ہوتے تھے۔ جیسے ستاروں کی روشنی جزوی اور محدود ہے۔

لیکن آفتاب نبوت یعنی حضرت خاتم المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو جو نور دیا گیا ہے۔ وہ رسمی یا علاماتی انداز کا نہیں جو عملی رسوم تک محدود ہو بلکہ علمی اور برہانی اور بیانی اور تبیانی ہے۔ جس میں ہر عمل ایک خاص علم اور اصولی حجت کے تابع ہے ہر حکم میں حکمت اور امر میں کوئی نہ کوئی اصولی علت ہے۔ احکام دین رسمی اور رواجی صورتوں کے نہیں، جو شکل محض اور ہیئت خالص ہوں، جن کا مقصد نفس کو محض کسی ڈگر پر لگائے رکھنا یا زیادہ سے زیادہ نفس کشی اور ترک لذات کے ساتھ کوئی اندرونی دھیان و گیان اور استغراق ہو، جس کا نظام اجتماعی سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ اس دنیا میں مسلم چند رسوم یا مخصوص قسم کی چند ظاہر علامتوں سے مسلم نہیں کہلاتا بلکہ تحقیق و استدلال اور عقیدہ و معرفت سے پیدا شدہ ہیئت و عمل سے مسلم کہلاتا ہے جس کے لئے وہ حجت و دلیل اور بصیرت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ وعلی بصیرۃ انا ومن اتبعنی : میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں۔ (کہ حقیقت کو سمجھ کر نمونہ عمل کو قبول کرتے ہیں جن کے یہاں اصل حجت ہے۔ رسم نہیں) اور اس لئے اس کے اسلام کو پہچاننے کے لئے کچھ خاص بندھی جڑھی رسمیں نہیں رکھی گئیں، جنہیں اس سے لگا ہوا دیکھ کر اس کے اسلام کو باور کر لیا جائے اور جب وہ اس کے ہاتھ پر پیشانی یا گلے میں نہ رہیں تو وہ مسلم نہ سمجھا جائے، بلکہ اس کا عقیدہ و عمل اور اس کی بصیرت و معرفت اس کی پیشانی کا نور اور اس کا طریق عمل طرز اسلام و کلام انداز عمل طرز اخلاق وغیرہ اس کے دین پر گواہ ہوتے ہیں جس سے اس کا مسلم ہونا معلوم ہوتا ہے اور نہ صرف مجموعہ دین بلکہ دین کی جزئی جزئی حجت و دلیل اور علمی قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ جس سے اس کا دین قائم اور متعارف رہتا ہے، نہ کہ رسم و رواج اور نائشی ملامت۔

جس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے مقتدا کے اعظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین و مذہب حقیقت اور عقل و بصیرت کے پیرا میں دیا گیا ہے، حتیٰ کہ آپ کا سب سے بڑا اور خصوصی معجزہ ہی علمی تھا جو قرآن حکیم کی صورت میں آج بھی اسی معجزانہ شان کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن یہ معجزہ کوئی لاشعری یا چمکتا ہوا ماتھ نہیں جسے دشمن پر پھینک مارا جائے یا وہ کوئی آگ برسانے والا سا بان نہیں کہ منکروں کو اس کے نیچے پہنچا کر بھسک کر دیا جائے یا وہ کوئی تیز و تند آندھی نہیں کہ اس سے معاند قوموں کو اڑا کر پھھاڑ دیا جائے یا وہ کوئی صیحہ چنگھاڑ نہیں۔۔۔۔۔ جس سے دشمنانِ حق کے کلیجے شق کر دیئے جائیں کہ اس سے نہ تو اس کے مسائل کی معقولیت ہی ثابت ہو سکتی تھی اور نہ وہ معقول پسند اقوام کے لئے پیغام ہی بن سکتا تھا۔ بلکہ اس کی اعجازی شان و دلائل قاطعہ تسکین دہ اسلوب بیان فطرت کے شواہد و نظائر اور فطرتوں کو اپیل کرنے والی اعجازی جہتیں ہیں۔ جن سے معاندوں کے بدن نہیں۔ دل و دماغ کچھڑ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں اگر عناد کے سبب نہ بھی مابین تو ان کے ضمیر ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جس سے انسانی ذہنیاتوں میں انقلاب پیا ہو جاتا ہے گویا اس علمی معجزے کے ذریعہ اقوام فنا نہیں کی جاتیں۔ بلکہ رام کی جاتی ہیں۔ ماری نہیں جاتیں۔ بلکہ زندہ کی جاتی ہیں۔ یعنی اسکا اعجاز موت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ حیات کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آیاتِ تحریف میں سے نہیں ہے بلکہ آیاتِ تبشیر میں سے ہے۔

ان هذا القرآن یہدی للتی
 ہی اقوام و یبشیر المؤمنین الذین
 یعملون الصلحت ان لہم
 اجر اکبیراً ۛ

تحقیق یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا
 ہے جو سیدھا ہے اور ان مسلمانوں کو
 بہت بڑے اجر کی بشارت دیتا ہے
 جو عمل صالح کرتے ہیں۔

آج بھی یہ علمی معجزات بلا کم و کاست اسی اعجازی شان کے ساتھ بدستور قائم ہے۔ اگرچہ معجزہ کہلانے والی مقدس ذات نگاہوں سے اوجھل ہے کیونکہ علم عالم کے اوجھل ہو جانے سے مٹ نہیں سکتا۔ جیسا کہ عملِ عامل کے اٹھ جانے سے ختم ہو

جاتا تھا۔ اگر قرآن کوئی عملی معجزہ ہوتا تو حضور کے بعد آج سامنے نہیں آسکتا تھا اور جب یہ دوامی معجزہ بدستور قائم ہے تو دین کی حجت بھی بدستور قائم ہے۔ جس سے قرآنی نبوت پر آج بھی دلیل لائی جاسکتی ہے اور قیامت تک لائی جاسکے گی۔ اس لئے نہ حجت مٹ سکتی ہے نہ دین جو اس کا دعویٰ ہے۔ پس اس دین کی بنیاد رسم و رسوم اور رواج انداز کی باتوں یا ظاہر داری کی علامتوں پر نہیں بلکہ قدرتی حقیقتوں اور فطری بصیرت پر ہے۔

عَلِيٍّ بَصِيرَةً اَنَا وَمَنْ اَتَّبَعَنِي وَ
 بِحَمَنِ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ الشُّرَكِيّٰنَ ۝
 میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں پاک
 ہے اللہ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں
 بلکہ یہاں پیغمبر کی ذات اور پیغمبرانہ خصوصیات اقتدار سے بالاتر ہیں۔ وہ اپنے جگہ
 ایک عظیم ترین منارہ روشنی ہے لیکن خود اس پر نگاہیں نہیں ٹھہر سکتیں کہ ان خصوصیات
 کو دیکھ دیکھ کر ان کی اقتدار کی جائے بلکہ یہاں اس آفتابِ نبوت سے چھنتی ہوئی روشنی
 ہی دنیا کی رہنمائی کے لئے رکھی گئی ہے جس کا نام شریعت اور قانون ہے پس جیسے
 عین آفتاب کو دیکھ دیکھ کر راستہ معلوم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روشنی میں رہروی کی جاتی
 ہے بشرطیکہ آفتاب کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کی جائے ایسے ہی یہاں آفتابِ
 نبوت کی خصوصی زندگی اتنی ارفع و اعلیٰ اور عزیمتوں کا اتنا تیز نور لئے ہوئے ہے کہ اس
 کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی نگاہوں سے ہاتھ اٹھالینا بلکہ رہروی سے ہاتھ دھولینا
 ہے چنانچہ خصوصیات نبوی اقتدار کے لئے نہیں رکھی گئیں اور نہ ہی اقتدار کسی کے
 بس کی بات ہے کہ انہیں دستور زندگی بنایا جاسکے۔ اکل اولیاء اور خواص صحابہ بھی اس کا
 حوصلہ نہیں کر سکتے تا بصلیٰ چہ رسد ہاں صرف آفتابِ نبوت سے چھننے والی روشنی
 یعنی عام شریعت اور اس کا توسعات لئے ہوئے عمومی دستور ہی دنیا کے لئے پیغام اور
 راہ نام ہے جس سے انسانیت کبریٰ کی تکمیل وابستہ ہے۔

غرض تارہ ملے نبوت اور آفتابِ نبوت میں یہی فرق ہے کہ نجومِ نبوت
 (انبیائے سابقین) کی شخصیتیں اور ان کے شخصی افعال دین کی علامات تھے جو ہدایت

بخش تھے۔ ایلے جب تک وہ سامنے رہتے تھے ہدایت ملتی تھی۔ جب او جھل ہو جاتے تھے تو ہدایت ختم ہو جاتی تھی جو ستاروں کی شان ہے کہ سامنے رہو تو رہنمائی ممکن۔ سامنے سے ہٹ جاؤ تو رہنمائی ناممکن۔ سابقہ شریعتوں میں گویا ہدایت پانے کا تعلق معنویات سے زیادہ حیات سے تھا۔ کیونکہ ذات اور خصائص ذات دیکھنے ہی کی چیزیں ہیں۔ لیکن آفتاب نبوت کی روشنی سے منور ہونے کیلئے آفتاب کا سامنے رہنا ضروری نہیں، بلکہ اگر ہے تو اس کی ذات اور ذاتیات کو سامنے نہ رکھنا ضروری ہے۔ کہ یہاں خصوصیات نبوی اقتدار سے بالاتر ہیں۔ اس سے پھیلنے والی روشنی جو علمی رنگ میں پھیلی ہوئی بنا دی گئی ہے۔ جو ہر کس و ناکس کے لئے پیغام ہے۔ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں سمجھنے کی چیز ہے۔ ایلے یہاں ہدایت پانے کا راستہ حیات سے زیادہ معنویات میں صورتوں اور اسموں کے بجائے حقائق و معارف ہیں۔ جن کے لئے بصارت سے زیادہ نور بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امت کی کامل رہنمائی کے لئے ان تمام شرعی طالب کو حق خود ہی کر کے دکھلایا۔ جس کا نام اسوۂ حسنہ ہے تاکہ عمل کی صورتیں ہر ایک کی خود ساختہ نہ ہو جائیں۔ جس سے امت میں تشدد ہو اور پراگندگی پھیلے۔ لیکن یہ اسوئے اور عملی نمونے بھی رسوم محض نہیں۔ جنہیں حقیقت نے وجود نہ بخشا ہو، بلکہ ان کے نیچے معقول اصول و کلیات اور علوم و اسرار چھپے ہوئے ہیں۔ جن سے عمل کی ان مخصوص شکلوں کا وجود قائم ہے۔ وہ خود بھی عقل و بصیرت اور قوت و استنباط کے لئے ایک مستقل دعوت ہیں۔ چنانچہ جس طرح قولی حدیثوں سے مجتہدین اور علمائے راسخین فی العلم نے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ ایسے ہی فعلی حدیثوں سے بھی اسی قدر علوم و مسائل کا استخراج کیا ہے۔ اس لئے یہ مخصوص شکلیں اور عمل کے یہ خاص ڈھانچے اگر کسی وقت بگڑنے لگتے ہیں تو وہی اندرونی روح اور اصول کی رہنمائی سامنے کر کے انہیں درست کر دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ شخصیتوں کے اٹھ جانے کی وجہ سے یہ نمونہ مائے عمل بھی کلی طور پر فنا ہو جائیں۔ بلکہ شخصیتوں کا بدل بعد کی شخصیتوں کے ساتھ اصول و قوانین صحیح و براہین اور اصولی طرق و استقامت ہیں۔ جن کے ذریعہ عملی نمونوں

میں پیدا شدہ بگاڑ دور کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔

بہر حال اور شریعتیں اپنی عبادات، علامات اور معجزات کے لحاظ سے علاماتی تھیں جن میں حسی نشانوں کا آنکھوں کے سامنے رکھا جانا ضروری تھا۔ ورنہ نہ ماننے والوں کے نفوس کو تسلی و اطمینان نہیں ہو سکتا تھا اور آفتاب نبوت کی یہ آخری اور کامل شریعت حقیقی اور تحقیقی ہے جس میں حیات کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ چند گنی چنی رسموں کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقائق و بصائر اور حجت و برہان کا مجموعہ ہے جس میں نگاہ کی بجائے عقل و فہم اور ذوق و بصیرت کی ضرورت ہے۔ پس وہاں حس و بصر اصل تھا۔ اور یہاں فکر و نظر اصل ہے اس لئے دوسری قومیں جب بھی اپنے مقتدیان اول کی ذوات اور ان کی عملی رسوم یا رواجی شکلوں کو گم کر دیتی ہیں۔ (در انحالیکہ مقتدا اول کے اٹھ جانے سے ان کا گم ہو جانا قدرتی تھا کہ عمل عامل کے اٹھ جانے سے اٹھ جاتا ہے) جب ہی دین و دھرم گم ہو جاتا تھا اور مستقبل کے لئے وہ صرف کہانیوں کہاوتوں اور رواجوں کی صورت میں بے حجت اور غیر مستند طریقہ سے نام نہاد باقی رہ جاتا تھا۔ جس میں حقیقت نہ ہوتی تھی اور یہاں امت مسلمہ اگر آفتاب نبوت سے اوٹ میں آگئی تو آفتاب نبوت کے علوم و آثار سے کسی وقت بھی اوٹ میں نہیں آسکتی کہ دین کے ختم ہونے کی نوبت آئے۔ کیونکہ علوم و اصول عالم کے اٹھ جانے سے نہیں اٹھ سکتے۔ وہ آج بھی اپنی کلی اور اصولی شکلوں کیساتھ محفوظ ہیں۔ اگر اس کی جزوی صورت میں کوئی بد فہم سجدہ پسند فرق بھی کر دے تو اس کی باطنی حقیقت اور اصولی علت جس نے یہ صورت بخشی تھی پھر اس صورت کو درست کر لیتی ہے جیسا کہ جڑ اپنی خراب شدہ شاخ کو یا ریح اپنے زخم خوردہ حصہ بدن کو خود درست کر لیتی ہے اور اس طرح یہ آخری دین اپنی پوری حقیقت و صورت کے ساتھ بدستور قائم اور محفوظ ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ نورپاشی کا کام محض آفتاب کی ذات ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے آثار بھی کرتے ہیں جس کا نام تپک اور روشنی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے تاروں کی تو ذوات کو نام دی کہا ہے۔ وبالنجوھم یھندون چاندان سے ذرا زیادہ روشن

تھا کہ اس کی نورانی چاندنی بھی پھیلتی تھی گورات کو دن نہ بنا سکتی تھی تو اسے نور کہا والقمر نوراً
مگر سورج کی چمک اور دمک جبکہ خود سورج کی طرح فعال اور ضیا بخش تھی تو سورج کیساتھ
اس کی روشنی کو بھی اس کی ذات کے ہم پلہ دکھلاتے ہوئے مساوات کے ساتھ ذکر فرمایا
تا کہ واضح ہو جائے کہ سورج خود ہی شب بپائی کا کام نہیں کرتا بلکہ اس کے آثار بھی وہی کام
کرتے ہیں چنانچہ سورج کے ساتھ اس کی چمک کی بھی قسم کھاتے ہوئے مساوی انداز
میں ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ

وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا (اور فرمایا گیا) قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی (اور
هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً فرمایا) اللہ وہ ذات ہے جس نے سورج
بنایا اور اس کی چمک بنائی۔

ظاہر ہے کہ ستاروں میں یہ ضعیف اور پھیلنے والی چمک نہیں ہوتی بلکہ صرف ان کے روشن
اجسام ہی بر قدر طاقت اجالا کرتے ہیں اور اس لئے سورج کا لقب سراج (چراغ) رکھا گیا
کہ اس کی ایک لومہی کام نہیں کرتی بلکہ لو سے پھیلنے والی روشنی اور روشنی سے نکلنے والی چمک
بھی کام کرتی ہے، یعنی چراغ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، مگر اس سے پھوٹنے والی روشنی اور چمک
پورے مکان پر قبضہ کئے رہتی ہے جس سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جو عین چراغ
کے سامنے نہیں ہوتے پس ستاروں کی محض ذوات مادی ہوئیں۔ چاند کا نور مادی ہوا مگر
ضعف کے ساتھ اور سورج کے ساتھ اس کی ضعیف (روشنی) بھی مادی ہوئی اور ضیا (چمک)
بھی مادی ہوئی اور سراجیت ————— ہوئی والی روشنی بھی مادی ہوئی جس سے
تمام ستاروں میں اس کی ممتاز شان نور بخشی کھل جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ انبیائے
سابقین نجوم ہدایت تھے جن کی ذوات سے دنیا روشن ہوئی تھی لیکن ذوات کے سامنے
نہ رہنے سے روشنی ختم ہو جاتی تھی کہ ذوات کے ساتھ پھیلنے والے روشن آثار نہ تھے۔
جو ذوات کے اوجھل ہو جانے پر بھی ضیا پاشی کرتے ہیں لیکن آفتاب نبوت کے آثار بھی
روشنی بخش ہیں۔ جیسے خود ذوات روشنی بخش ہے اور ذوات کے سامنے نہ رہنے پر
بھی اس کی نورانی آثار ذوات ہی کا سا کام کرتے ہیں چنانچہ اس کی صبح صادق کے طلوع

ہوتے ہی رات غائب ہو جاتی ہے، حالانکہ سورج سامنے نہیں آتا مگر اس کی روشنی کے کمالات جو اس سے منفصل ہو کر عالم میں پھیلتے ہیں، روشنی اور رہنمائی کا کام ذات ہی طرح کرتے ہیں۔ بخلاف ستاروں کے کہ ان کی کوئی صبح صادق ہوتی ہے، نہ شفق ابھرتی ہے، وہ خود ہی طلوع ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سراج منیر کی بلیغ تشبیہ ہم نے اولادوں کی زمین میں پھیلی ہوئی تاریکی کو سمجھا، پھر آفتاب کے آثار طلوع یعنی اس کی چمکتی ہوئی صبح صادق سے تعارف حاصل کیا، پھر شفقِ احمر اور اس کی آپ و تاب کو سمجھا، پھر مطلعِ آفتابِ نبوت کو پہچانا، پھر آفتاب کے تدریجی ظہور و عروج کو سمجھا اور پھر اس کی ضیا پاشی کی رفتار اور تدریجی آثار کو دیکھا اور پھر تمام ستارگانِ ہدایت کے مقابلہ میں اس کی امتیازی روشنی کو دیکھا، پھر ان انوار کا تاحال موجودہ کر نورِ آفتاب میں مدغم ہو جانے کو سمجھا، پھر ان کی روشنی کے جزوی اور آفتابِ نبوت کے کلی اور جامع ہونے کو سمجھا اور اس طرح ہم اس تشبیہ قرآنی کی ولایت کی روشنی میں سیرتِ نبوت کے ابتدائی مگر جامع مقامات سے روشناس ہو گئے یعنی مادی آفتاب کے نقشہ سے روحانی آفتاب کے طلوع، آثارِ طلوع، اسبابِ طلوع، نوعیتِ طلوع اور خود آفتاب کی نوعیت کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے آ گیا۔ اب وقت آ گیا کہ ہم اس بلیغ تشبیہ کی روشنی میں ان ممتاز مقاصدِ طلوع کو بھی سمجھیں اور آفتابِ نبوت سے صادر شدہ ان مخصوص اوصاف و کمالات کے دقیق گوشوں تک پہنچیں، جو عام نجومِ ہدایت میں نظر نہیں آتے، بلکہ صرف آفتابِ نبوت ہی کی خصوصیات سمجھے گئے ہیں، بلکہ انہی کے پرتو سے تمام نجومِ ہدایت میں روشنی پہنچی ہے، شرعی اصطلاح میں نبوت کے ان ہی امتیازی اہتمامی اور مصدریت کے کمالات کے مجموعہ کا نام ختمِ نبوت ہے۔

ختمِ نبوت

سو اس سے یوں سمجھئے کہ جس طرح آفتاب کی سب سے بڑی امتیازی شان اور سب سے اونچی خصوصیت فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روشنی والا ہے، جو اور ستاروں سے نہیں، بلکہ

جاتی، بلکہ یہ ہے کہ وہ روشنیوں کا منتہیہ اور دوسرے ستاروں کے حق میں روشنی بخش ہے، جس سے اور ستاروں میں روشنی آتی اور اسی کے دم سے قائم رہتی ہے۔ یعنی آفتاب کا کمال محض روشن ہونا یا سب ستاروں سے زیادہ نورانی ہونا نہیں بلکہ ان سب نور کی اصل ہونا ہے۔ کہ اور سب اپنے نور میں آفتاب کے محتاج ہیں اور خود آفتاب اپنے نور میں کسی کا محتاج نہیں کہ اس کا نور خود اپنا ہے اور باقی ستاروں کا نور خود ان کا اپنا نہیں بلکہ آفتاب سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ماہرین ہیئت اور فلاسفہ کے نزدیک آفتاب کے سوا تمام ستاروں کا بڑا کمال صرف جسم کی صفائی اور شفا ہی ہے کہ نور قبول کر سکیں۔ خود اپنی ذات سے نورانی ہونا نہیں۔ پس اصل میں نورانی آفتاب ہے۔ اس کے فیض سے یہ سارے ستارے بھی اس کی محاذات میں اگر نورانی ہو جاتے ہیں۔ خواہ حجم و ضخامت میں کوئی ستارہ آفتاب سے بڑا بھی ہو، جیسا کہ موجودہ سائنس دانوں کا دعویٰ بھی ہے کہ بے شمار ستارے ہیں جو حجم و ضخامت میں آفتاب سے کہیں بڑے ہیں، مگر نور میں بڑا کوئی نہیں، جبکہ کسی ستارہ کا نور ہی خود اپنا نہیں بلکہ آفتاب سے لیا ہوا ہے۔ پس آفتاب تمام ستاروں کے حق میں مربی اور مصدر فیض نکلتا ہے۔ اس لئے آفتاب کا امتیاز محض نورانی ہونا نہیں بلکہ نورانیت کی اصل ہونا نکلتا ہے۔

بنا بریں یہ سمجھنا غیر معقول نہ ہو گا کہ سب النوار کی انتہا آفتاب پر ہو جاتی ہے۔ وہیں سے نور سب ستاروں کے لئے چلتا ہے۔ جبکہ وہ اس کے سامنے ہوں۔ خواہ اوپر ہوں یا نیچے اور حجم و ضخامت میں بڑے ہوں یا چھوٹے اور سب میں ہوتا ہوا اسی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہی شان کسی وصف کے خاتم کی ہوتی ہے کہ وہ وصف اسی سے چلے اور اسی پر لوٹ آئے۔ وہی فاتح ہو اور وہی خاتم ہو، وہی اس وصف کا مبداء ہو اور وہی منتہا ہو، وہی اول ہو اور وہی آخر ہو۔ اس لئے اب ہم سورج کو محض نورانی نہیں کہیں گے بلکہ نور بخش اور نور آفریں کہیں گے اور محض صاحب النوار نہیں کہیں گے بلکہ خاتم الانوار کہیں گے۔ جبکہ سب ستاروں کو نور اس سے ملتا ہے اور اس نور کی حرکت میں پھر اسی کی طرف عود کر آتا ہے پس سورج کی یہ خاتمیت النوار ہی در حقیقت اس کے سارے کمالات کا ممتاز عنوان ہو گا

آفتاب نبوت، کاپی نمبر ۶

جو اس کی امتیازی شان کو نمایاں کر سکے گا نہ کہ مطلقاً نورانی ہونا کہ وہ قدر مشترک کے طور پر سب ستاروں میں درجہ بدرجہ پایا جاتا ہے۔ نیز محض نسبتاً دوسرے ستاروں سے نور میں زیادہ ہونا بھی اس کی کوئی آخری امتیازی شان نہ ہوگی کہ یہ نسبتی کمی بیشی بھی ستاروں میں موجود ہے جبکہ ہر ستارہ روشنی میں کسی ستارے سے بڑا اور کسی ستارے سے چھوٹا ہے بلکہ اصل امتیازی خصوصیت وہی نور بخشی اور سب ستاروں کے نور کی اصل ہونا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان صرف نبی ہونا نہیں کہ یہ شان قدر مشترک کے طور پر سب نبیوں میں موجود ہے۔ نیز ان تمام نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) سے کمالات نبوت میں محض اضافی طور پر کچھ زائد یا قائل ہونا بھی نہیں کہ یہ تفاضل اور فرق مراتب اور انبیاء میں بھی قائم ہے۔

تلك الرسل فضلنا بعضهم
على بعض؛ فضلت دمی سے۔

بلکہ آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نور نبوت میں سب انبیاء کے مربی ان کے حق میں مصدر فیض اور ان کے انوار کمال کی اصل ہیں۔ اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں۔ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل میں نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوئے ہیں۔ ان مقدسین سابقین کا کمال درحقیقت ان کے جو سروں کی صفائی اور شفائی اور استعداد اور ان کی باطنی استعدادوں کا فطری کمال ہے کہ جو ان ہی ان کے قلوب صافی اور ارواح ظاہر کے سامنے آفتاب نبوت کا نورانی چہرہ آیا۔ انہوں نے اس کی ساری شعاعیں قبول کر لیں اور خود منور ہو کر دوسروں کو وہ روشنی پہنچانی شروع کر دی۔ پس آپ ان سب حضرات انبیاء کے حق میں مربی اور اصل نور ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے کو نبی الامت ہی نہیں بلکہ نبی الانبیاء بھی فرمایا ہے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں مصرح ہے۔ پس جیسے آپ امت کے حق میں نبی امت ہونے کی وجہ سے مربی ہیں۔ ویسے ہی نبیوں کے حق میں بوجہ نبی انبیاء ہونے کے مربی ہیں۔ اب اگر جسم یا قد و قامت اور بدن کے ڈھانچہ میں کوئی نجوم ہدایت آفتاب میں بڑا ہو یا چھوٹا تو اس سے آپ کے مربی عام ہونے میں کوئی فرق

نہیں پڑے گا۔ آخر عالم بشریت کے ابتدائی دور میں تمام انسان جن میں انبیاء کرام بھی شامل ہیں، حجم و ضخامت اور قد و قامت میں مابعد کے زمانوں کے لحاظ سے یقیناً بڑے اور طویل و عریض ہوتے تھے۔ آدم علیہ السلام کا قد و قامت اپنے ہاتھ کی پیمائش سے سے ساتھ ہاتھ لبا اور سات ہاتھ چوڑا تھا۔ یہی حال نوح علیہ السلام اور حضرت ہود و صالح علیہما السلام کے قد و قامت کا تھا۔ سیر کی روایتوں میں ہے کہ اس دور کے بعض انبیاء کا جسم مبارک قبر کھلنے سے کھل گیا تو ان کی ناک کی پیمائش ایک گز نکلی۔ جیسے حسب تصریح اہل نجوم بہت سے ستارے حجم و ضخامت میں آفتاب سے بڑے ہیں مگر فیض نور میں سب اس کے محتاج ہیں۔ ایسے ہی اگر بہت سے انبیاء علیہم السلام قد و قامت میں یا اپنی کسی جزوی خصوصیت میں حضور سے زیادہ ہوں تو اس سے نور نبوت میں حضور سے اسکا استغناء اُن کی بڑائی حضور پر ثابت نہیں ہو سکتی اور جب یہ سورت ہے تو حضور کی شان محض نبوت ہی نہیں نکلتی بلکہ نبوت بخشی بھی نکلتی۔ ہے کہ جو بھی نبوت کی استعداد پایا ہو فرد آپ کے سامنے آگیا نبی ہو گیا اور اس طرح نور نبوت آپ ہی سے چلا اور آپ ہی پر لوٹ کر ختم ہو گیا اور یہی شان خاتم کی ہوتی ہے کہ اسی سے اس کے وصف خاص کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور اسی پر انتہا بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو وصف نبوت کے لحاظ سے صرف نبی ہی نہیں کہیں گے بلکہ خاتم النبیین کہیں گے کہ آپ ہی پر تمام انوار نبوت کی انتہا ہے جس سے آپ مہتابے نبوت ہیں۔ آپ ہی سے نبوت چلتی ہے اور آخر کار آپ ہی پر عود کر آتی ہے۔ پس آفتاب کی تشبیل سے آفتاب نبوت۔ نبوت کا سہارا بھی ثابت ہوتا ہے اور مہتابا بھی نبوت میں اول بھی نکلتا ہے اور آخر بھی فاتح بھی ثابت ہوتا ہے اور خاتم بھی چنانچہ آپ نے اپنی نبوت کی اولیت کا تو ان الفاظ میں اعلان فرمایا کہ :-

کُنْتُ نَبِيًّا وَ اَدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ
وَالْجَسَدِ -
میں نبی بن چکا تھا۔ جب کہ آدم ابھی رُوح
و جسم کے درمیان ہی میں تھے۔ (یعنی ان
کا خیر ہی کیا جا رہا تھا اور ان کی تخلیق مکمل

(بھی نہیں ہوئی تھی۔)

اور ادھر اپنی نبوت کی آخریت اور خاتمیت کا اس عنوان سے اعلان فرمایا کہ نبوت کو ایک قصر دکھلا کر اس کی آخری اینٹ اپنے کو ظاہر فرمایا۔ ارشاد ہے۔

فَاَنَا الْبَنَّةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ

پس میں ہی وہ (آخری) اینٹ ہوں اور

میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

اور پھر نبوت کی اس اولیت و آخریت و خاتمیت کے ان دو متضاد پہلوؤں کو ایک

ذات میں جمع کرنے کی صورت یہ فرمائی :-

أَنَا أَوَّلُهُمْ خَلْقًا وَاخِرُهُمْ

میں خلقت کے لحاظ سے سب سے

پہلا ہوں اور بعثت کے لحاظ سے سب

بَعَثًا :-

سے پچھلا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے آپ کو خاتم النبیین فرمایا۔ جس سے

آپ کا تمہارے کمالات نبوت ہونا واضح ہے جو آپ کے مصدر نبوت ہونے کی

کھلی دلیل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :-

مَا كَانَ مُحَمَّدًا أَبَا أَحَدٍ مِّنْ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں

رَجُلًا لَّكُم مِّنْ رُّسُلِ اللَّهِ و

سے کسی کے باپ نہیں تھے۔ لیکن وہ

خَاتَمُ النَّبِيِّينَ :-

اللہ کے رسول اور خاتم النبیین تھے۔

جس سے واضح ہے کہ آپ انبیاء کے حق میں بمنزلہ اصل کے ہیں اور انبیاء آپ کی

نسبت سے بمنزلہ فرع کے ہیں کہ ان کا علم اور خلق آپ کے فیض سے ظہور پذیر ہوا۔ آپ

کی یہ فیض رسانی اور سرچشمہ کمالات نبوت ہونے کی امتیازی شان آغاز بشریت سے شروع

ہوئی تو انہارے کمالات تک جا پہنچی۔

چنانچہ عہد الست میں جب کہ ساری نوع بشری سے سوال کیا گیا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ سب سے پہلے

جس نے ہاں کہہ کر اقرارِ ربوبیت کیا وہ آنحضرت خاتم الانبیاء ہی کی ذاتِ بابرکاتہ تھی جن

کی صدائے حق سن کر سب نے ہلی کی آوازیں لگائیں کہ کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں جس سے واضح ہے کہ آغاز بشریت کے وقت حضور ہی عالم بشریت کے معلم اول اور اس کی معرفت ربوبیت کے مربی تھے۔ بالفاظ دیگر آپ ہی کی عملی رہنمائی سے سارے اولین و آخرین کی ایمانی استعدادیں کھل سکیں اور برورے کا داگئیں۔ جن میں انبیاء علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ پس یہ آپ کی پہلی تربیت اور بہ عنوان مختصر آپ کی پہلی شانِ قیادت و سیادت ہے۔ جو تعلیم و تربیت کے دائرہ میں کھلی اور آپ کی شانِ خاتمیت کا پہلا ظہور ہوا۔ ورنہ اگر یہ محض نبوت کا اثر ہوتا تو سارے انبیاء اک دم ہلی۔ کے کلمہ سے بول اٹھتے اور آپ کے کلمہ کا انتظار نہ کرتے، لیکن سب کا سکوت اور آپ کا لفظ آپ کے معلم اول اور مربی اول ہونے کی کھلی دلیل ہے جو محض نبوت کا اثر نہیں، بلکہ ختم نبوت کا اثر ہے۔

یہ اثر پھر عہد السنت تک ہی محدود نہیں، بلکہ عالم دنیا پھر عالم برزخ پھر عالم مشر و نشر اور پھر عالم جنت تک خاتمیت کی یہ شان مختلف پیرایوں میں نمایاں کی جاتی رہی تاکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر آپ کی فضیلت و سیادت کھل کھل کر انبیاء و اہم کے سامنے آتی رہے۔

چنانچہ شب معراج میں جو خود بھی آپ کی امیاری شان کا ایک عظیم الشان ظہور ہے۔ آپ کو سارے انبیاء سے آگے بڑھا کر اور امام سلوٰۃ بنا کر تمام جماعت انبیاء کو مقتدی بنایا گیا تاکہ آپ کا افضل الانبیاء اور مہتممائے کمالات نبوت ہونا انبیاء اور ان کی امتوں پر کھل جائے۔ کیونکہ نبصِ قرآن عالم کی تخلیق کی غرض و غایت عبادت ہے اور نماز افضل العبادات بلکہ جس سے عبد و معبود کے درمیان علاقہ قائم ہوتا ہے اور انسان کو حقیقی عبودیت نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے جو ذاتِ اقدس نماز میں سب کی امام اور سب پر ممتاز ہوگی۔ وہی مقصد تخلیق کو سب سے زیادہ پورا کرنے والی بھی ثابت ہوگی۔ جس کے یہ معنی ہونے کہ کمالاتِ بشریت میں وہی سب سے فائق ہوگی جو نماز میں سب پر فائق اور سب سے زیادہ ممتاز ہوگی۔ اس لئے شب معراج میں نماز میں آپ کی فوقیت دکھلانے کیلئے آپ کو امام بنایا گیا جو آپ کے مہتممائے کمالات

نبوت ہونے کی دلیل ہے اور ختم نبوت کا حاصل ہے۔ نیز اسی لئے معراج میں آپ کو ساتوں آسمانوں سے گزار کر اور مستوی تک پہنچا کر نمایاں کیا گیا کہ آپ سارے انبیاء گرام اور ملائکہ مقربین کے مقامات سے گزار کر اس مقام تک جا پہنچے، جہاں تک نہ کوئی بنی سر بل پہنچا نہ فرشتہ مقرب پہنچ سکا پس حسی طور پر تو یہ آسمانوں سے گزارنا تھا اور معنوی طور پر مقامات انبیاء سے گزار کر اس انتہائی قرب کے مقام پر پہنچانا تھا، جہاں تک کسی کی رسائی نہ تھی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جب ان آسمانوں میں اپنے اپنے مقامات پر ملتے گئے اور آپ اس سے آگے گزرتے گئے تو اس سے مقامات نبوت میں آپ کا تقدم اور فضل و امتیاز ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر اسی - لوم قیامت میں آپ کو مقام محمود پر پہنچایا جائیگا، جہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے گا اور اسی لئے آپ کو شفاعت کبریٰ کے مقام پر لایا جائے گا، جہاں تک آنے سے سب انبیاء علیہم السلام رک جائیں گے اور اپنی کوئی ذلت و لغزش ظاہر کر کے اس مقام کی طرف بڑھنے سے غدر کریں گے جو آپ کے ان سب مقدمین پر فائق اور محتاج الیہ ہونے کی دلیل ہے اور پھر اسی لئے آپ کو وجہ تخلیق کائنات بتایا گیا اور یہ ظاہر کر کے کہ آپ کی خاطر ساری کائنات کا یہ خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، یہ بتلانا تھا کہ آپ ہی اس عالم خلق کا پھل اور مقصود اصلی ہیں، جن کے لئے یہ کائنات عالم کا عظیم الشان شجر بویا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ درخت میں پھل ہی مقصود اور اصل ہوتا ہے، جس کے لئے درخت لگایا جاتا ہے، باقی ساری شاخیں اور پھول پتیاں اس کی تمہید ہوتی ہیں، جس سے آپ کا ساری کائنات کی نسبت مقصود اصلی ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب کہ پھل ہی میں وہ ساری قوتیں جمع ہوتی ہیں جو درخت کے لئے چوڑے پھیلاؤ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یعنی ثمر جامع قوائے شجر ہوتا ہے تو اسی سے آپ کا جامع کمالا بشر اور جامع کمالات جمیع انبیاء ہونا بھی نمایاں ہو جاتا ہے، جو اس کائناتی درخت کے نگوںے اور گل سرسبز ہیں۔

چنانچہ آپ نے خود بھی کمالات انبیاء کا اپنے کو جامع فرمایا، کیونکہ انبیاء کے

کلماتِ نبوت کی بنیاد وہی چیزوں پر ہے۔ ایک کمال علمی ایک کمال اخلاقی سو آپ نے اپنی نسبت تمام انبیاء و اولیاء کے سارے علمی کمالات کا جامع ہونا تو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا۔

أوتيتُ علماً الأولین و
الأخرین ۛ
مجھے اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم دیئے
گئے (جن کا مظہر اتم قرآن حکیم ہے)
اور آپ کی کمالات اخلاق کی جامعیت اس سے واضح ہے کہ صدیقہ عائشہ
رضی اللہ عنہا سے جب آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔
وکان خلقه القرآن ۛ اور آپ کا خلق یہ قرآن ہی تو ہے۔

(روح المعانی)

(کہ جو کچھ قرآن میں علم کی شکل میں ہے، وہی آپ کی ذات میں
اخلاق و ملکات کی شکل میں ہے، اور جو قلبی مقامات اس میں
رسوم و دال کی شکل میں ہیں، وہی آپ میں خلق و عمل کے درجہ
میں ہیں۔)

اور ظاہر ہے کہ جب قرآن جامع کتب سابقین ہے جو آپ کے اخلاق کا مجموعہ
ہے تو آپ کے اخلاق بھی جامع اخلاق سابقین ثابت ہو گئے۔ جو آپ کے خاتم کلمات
اخلاق اور منتہائے کمال خلق ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس سے خود بخود واضح ہو
جاتا ہے کہ جو ذاتِ بابرکات نبوت کی بنیادوں میں سب کی جامع اور سب پر فائق ہے
وہی ان بنیادوں میں سب کی اصل بھی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ اسی اصل ہونے کی بنا پر تمام انبیاء کرام کے آپ پر ایمان لانے اور آپ
کی پیروی و نصرت کرنے کا عہد و میثاق لیا گیا۔ جیسا کہ آیت قرآنی فاذا اخذ الله میثاق
النبیین ۛ سے واضح ہے اور پھر حضور نے اسی آیت کی روشنی میں انبیاء سابقین
کے تابع خاتم ہونے کی مثال یہ ارشاد فرمائی کہ :-

لوکان موسیٰ حیاً لما اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوں تو انہیں بھی

وسعتاً الا اتباعی : میری اطاعت کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔

اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر بھی بصورت عدم موجودگی خاتم الانبیاء تو واجب الاطاعت ہیں مگر یہ صورت موجودگی خاتم مطاع ہونے کے بجائے مطیع کی حیثیت میں آجاتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کا عہدہ خاتم ماتحت ہو کیونکہ ماتحت کے سارے اختیارات و اقتدارات درحقیقت مافوق اور افسر اعلیٰ ہی کے ہوتے ہیں، جو اس کے دینے سے ماتحت میں آتے ہیں، اس لئے۔۔۔۔۔ اصل کے موجود ہوتے ہوئے فرع کا حکم نہیں چلتا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وزیر اعظم تمام وزراء سے یوں کہے کہ میرے سامنے آپ لوگوں کا حکم نہیں چلے گا۔ صرف میری عدم موجودگی میں آپ لوگوں کی آمریت بحال رہ سکتی ہے جس سے صاف نمایاں ہے کہ ماتحت کے اختیارات مافوق کے سامنے کالعدم ہو جاتے ہیں خواہ عہدہ بدستور باقی بھی رہے یہ ایک اصول ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر دائرہ کے اصل و ظل کا یہی حال ہے کہ اصل کے ہوتے ہوئے فرع کا اختیار نہیں چلتا باپ سامنے آجائے تو صاحب اولاد بیٹا اپنے کو باپ کہتے ہوئے بھی شرمائے گا چہ جائیکہ اپنی ابوت کے حق کو جٹائے اور استعمال کرے کیونکہ اس کی ابوت اپنے باپ کی ابوت کی فرع اور ظل ہے اور اصل کے سامنے فرع کی حیثیت مضحکہ منگول ہو جاتی ہے یا مثلاً سمندر سامنے ہو تو منہروں کو دریا کہتے ہوئے شرم آئے گی کیونکہ پانی کہیں بھی ہو، واسطہ بلا واسطہ سمندر ہی کا فیض ہے۔ ایسے یہ سارے بڑے بڑے دریا سمندر کے سامنے پہنچ کر سمندر ہی کے بہاؤ کے ساتھ ہولیتے ہیں خود ان کی اپنی رفتار باقی نہیں رہتی سورج سامنے ہو تو ستارے اپنے کو نورانی کہتے ہوئے بھی شرمائیں گے کہ ان کی اصل سامنے ہے اور اصل کے ہوتے ہوئے فرع اپنے وجود سے بھی شرمانے لگتی ہے چہ جائیکہ وجود کی مدعی بنے ٹھیک اسی طرح تمام ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کا آفتاب نبوت کے آجانے پر اپنی اپنی نبوتوں کا حکم چلانے یا چلانے

کا حکم دینے کی بجائے خاتم نبوت ہی کے دہارے ہو لینا ایک قدرتی اور طبعی بات ہے
 نہ کہ اپنا حکم جاری کرنا یہی حقیقت ہے جسے حدیث مذکورہ میں نمایاں کیا گیا ہے کہ
 اگر بالفرض کوئی سابقہ نبی خاتم النبیین کا دور پا جائے تو اس پر اور اس کی امت پر ختم نبوت
 کا حکم چلے گا نہ کہ خود اس کا اور وہ بھی خاتم پر جو درحقیقت خاتم کے اصل کمال ہونے
 اور تمام غیر خاتم انبیاء کے فروع کمال ہونے کی واضح دلیل ہے۔ پھر حدیث مذکورہ میں تو
 علی اسبیل الفرض ہی کو واقعہ کر کے دکھلایا گیا ہے کہ دورہ محمدی میں جب کہ حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتار کر زمین پر لائے جائیں گے تو وہ النبی الخاتم ہی
 کے دین کی پیروی کریں گے۔ بلکہ شاید اسی حقیقت کو دکھلانے کے لئے حضرت عیسیٰ
 علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اُٹھا کر دنیا کے آخری دورہ میں آسمان سے زمین پر اتار جا
 گا۔ تاکہ وہ اپنی نبوت کی ساری قوتوں کے ساتھ اس فتنہ زاد دور میں شریعت محمدی کی
 تجدید بھی کریں گے اور اس کی اطاعت بھی کریں گے اور اس طرح دورہ محمدی میں
 سابق نبی کی اطاعت محمدی محض عقیدہ ہی نہ رہے بلکہ عمل صورت بھی سامنے آجائے۔
 بلکہ اس ایک واقعاتی مثال ہی سے عقیدے کے طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ایک
 ہی اسرائیلی پیغمبر کا واقعہ نہیں بلکہ سارے اسرائیلی انبیاء کی تابعیت کا عمل نبوت ہے کیونکہ
 حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نبی اسرائیل اور اس اسرائیلی نبوت کی آخری کڑی
 ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مسلسل زنجیر کی آخری کڑی کو اگر کسی جانب کھینچا جائے گا تو قدرتنا
 پوری زنجیر ادھر ہی کی جانب کھینچ جائے گی اور جو آخر کا حکم ہوگا وہی پورے سلسلہ کا حکم
 شمار ہوگا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا جو اسرائیلی نبوتوں کی آخری
 کڑی ہیں۔ بعد از نزول تابع فرمان محمدی ہو کر آنا اس سارے سلسلہ کے تابع فرمان ہوجانے
 کی دلیل نہ سمجھا جائے۔ بالخصوص جبکہ تورات کی تصریح کے مطابق (جس کو احادیث میں ذکر کیا
 گیا ہے) موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا بھی تھی کہ اگر امت محمدیہ جیسی امت مرحومہ مجھے
 بطور امت نہ نہیں دی جاسکتی کہ وہ امت احمدیہ ہے تو پھر مجھی کو اس امت
 میں شامل کرایا جائے تو ان کے سلسلہ کے خاتم (حضرت مسیح) علیہ السلام کو اس امت

میں بطور مجدد اسلام اور بحیثیت ایک تابع تراجمت محمدی لاکر موسیٰ علیہ السلام کی مقدس خواہش حضرت مسیح کو داخل امت کر کے پورن کر دی گئی۔ چونکہ جب وہ نبی ہوتے ہوئے امت محمدیہ کے فرد بن گئے جو اسرائیلیت کا چور ہیں تو پوری اسرائیلیت ازہ موسیٰ تا عیسیٰ علیہم السلام بحیثیت ایک تابع اور پیر و کار کے شامل امت ہو گئی۔ گویا اولین اسرائیلی پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) اور آخرین اسرائیلی نبی (حضرت مسیح علیہ السلام) کے اتباع محمدی کو اپنی اپنی نوعیت سے ظاہر فرما کر سارے ہی اسرائیلی پیغمبروں کو (جو اپنے دور میں دنیا کی سب سے افضل ترین نبوت تھی، ان کے اول و آخر کے واسطے سے آفتاب نبوت کا پیر و کار ثابت کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی جن نبوتوں کے نتیجے میں اسرائیلیت کا مقام پیدا ہوا۔ وہ بھی اسرائیلیت کے مبادی کی حیثیت سے اس پیر و کاری میں اس کی شریک حال مانی جائیں گی اور اس طرح سارے انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی حکم نکل آتا ہے کہ ان کی نبوتیں ختم نبوت کے تابع اور ظل کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی الانبیاء ہونا کھلے طور پر سامنے آجاتا ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ دورہ محمدی میں جو دنیا کا آخری دورہ ہے۔ جب کہ نبیوں کو بھی اتباع محمدی کے بغیر چارہ نہیں تو یہ اس کا کھلا اعلان ہے، کہ ان کی اقوام و امم کو بھی اس دور میں اتباع خاتم کے بغیر چارہ کار نہیں، بلکہ نجات کا انحصار ہی دین خاتم میں ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا
نَلَن يَاقْبَلْ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ
مِنَ الْخَاسِرِينَ

اور جو کسی اور دین (میں) سے آئے
اسلام کے کسی دوسرے دین کے پیچھے
جائے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائیگا
اور وہ آخرت میں گھا۔ ٹے والوں میں سے
ہوگا۔

پس حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متبوعیت عامہ اور نبوت کے اصلی ہونے کو خاتم النبیین کے عنوان سے نمایاں کیا گیا ہے۔

نور آفتاب سے ستاروں کے نور کی اصل ہے

کیونکہ اس عنوان کے سوا کوئی دوسرا جامع عنوان تھا ہی نہیں جس سے آخر الانبیاء کے سرچشمہ نبوت کو ہونے کو نمایاں کیا جاتا۔ جیسے آفتاب مادی سارے ستاروں کے نور کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم الانوار ہے اور ہر ستارہ نور میں اسی کا پیرو اور متبع ہے۔ ایسے ہی آفتاب روحانی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکت تمام انبیاء کی جو توں کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین ہے کہ ہر نجم ہدایت اور نبی نور نبوت میں آپ سے مستفید اور آپ کے تابع ہے۔

سرچشمہ نور کا حجم میں بڑا ہونا ضروری نہیں

پھر جیسے آفتاب تمام ستاروں کے نور میں ان کا سربانی ہے، خواہ کوئی ستارہ قد و قامت میں اس سے بڑا ہو یا چھوٹا۔ ایسے ہی آفتاب نبوت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کے انوار نبوت میں ان کے سربانی اور فیض بخش ہیں خواہ کسی نبی کا قد و قامت حضور سے بڑا ہو یا چھوٹا۔

نجوم ہدایت کے مخصوص رنگ آفتاب نبوت ہی کا فیض ہیں!

اور جیسا کہ تمام ستاروں کا نور آفتاب ہی کے فیض سے قائم ہے، تو ہر ستارہ کے ظرف کی خاصیت الگ الگ ہے جس سے ان ستاروں کے نور کا رنگ بھی الگ الگ ہے اور تاثیر بھی الگ الگ مگر نور سب میں آفتاب ہی کا کام کرتا ہے۔ ایسے ہی تمام نجوم ہدایت انبیاء علیہم السلام کا نور نبوت بھی خاتم الانبیاء ہی کے فیض سے ہے۔ گو ان کی تعلیم اور تربیت کے رنگ الگ الگ اور اقوام میں آثار تربیت مختلف ہیں جس سے ان کی تربیت یافتہ امتوں کے ذہن بھی الگ الگ ہو گئے، مگر نور سب میں خاتم الانبیاء ہی کا کام کرتا رہتا ہے کہ اس کے نور ڈالے بغیر انبیاء کے پاک قلوب کے استفادے انوار کا ظہور

نہیں ہو سکتا تھا اور نہ علوم نبوت کی یہ نوع بہ نوع خاصیتیں ان ظروف سے گزر کر کھل سکتی تھیں۔

آفتاب کے اصلی نور آجانے پر فروعی انوار کی حاجت نہیں رہتی

اور جیسا کہ طلوع آفتاب کے بعد ستاروں کے ظلی اور فروعی نور کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ بلا واسطہ نور آجانے کے بعد بالواسطہ نور کی قدرتا کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایسے ہی خاتم النبیین کے آجانے کے بعد کسی بھی نجم ہدایت (پیغمبر) کے نور کی حاجت نہیں رہتی۔ جب کہ ان انوار کا اصل اصول نور بلا واسطہ ختم نبوت کے ذریعہ سامنے آجائے کہ اب تنہا سورج ہی کی روشنی سارے عالم کے لئے کافی ہے۔

پس جیسے طلوع آفتاب کے بعد سب ستارے ماند ہو کر اسی کے نور میں گم ہو جاتے ہیں کہ ان کا نور باقی رہنے کے باوجود بھی مشخص ہو کر سامنے نہیں آ سکتا۔ ایسے ہی خاتم النبیین کی بعثت کے بعد اور انبیاء کے انوار بھی نور خاتم میں گم ہو کر لاشی ہو گئے اور اب وہ مشخص ہو کر اپنی اپنی شریعتوں کی صورت میں سامنے نہیں رہ سکتے۔ اسی کے معنی نسخ شرائع کے ہیں کہ آپ کی شریعت سابقہ شریعتوں کے لئے تو نسخ ہو گی، مگر قصہ برعکس نہ ہو گا۔

آفتاب نبوت صرف خاتم النبیین ہی نہیں آخر النبیین بھی ہیں

اور جیسے آفتاب سب ستاروں کے طلوع کے بعد آخر میں طلوع کرتا ہے۔ تاکہ نورانیت کی ہر کھپلی کمی کو پورا کر دے۔ ایسے ہی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر الانبیاء بھی بنایا گیا تاکہ آپ کا زمانہ بھی سب نبیوں کے آخر میں رہے۔ تاکہ آخری عدالت کا فیصلہ ہر ابتدائی عدالت کے فیصلوں کے لئے حرفِ آخر اور ان کے حق میں ناسخ ثابت ہو سکے۔

آفتاب نبوت ہی مصدر انوار ہے۔

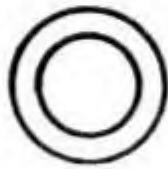
اور جیسے آفتاب کے لئے محض نور ہی ہونا اصل کمال نہیں بلکہ مصدر نور اور اصل انوار ہونا کمال ہے۔ ایسے ہی آفتاب نبوت، ذات بابرکات، نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محض نبی ہونا امتیازی کمال نہیں کہ یہ کمال سارے انبیاء میں مشترک ہے۔ بلکہ مصدر نبوت اور سرچشمہ نبوت ہونا کمال ہے کہ یہ کمال اور انبیاء میں نہیں۔ ایسے اس کے مخصوص آثار بھی اور انبیاء میں نہیں کہ وہ خاتم بھی نہیں۔

آفتاب نبوت اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے مصدر فیض ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب انبیاء کی نبوتیں آپ کی نبوت سے ماخوذ اور اس کی تربیت یافتہ ہیں تو ولایت و امامت بہ طریق اولیٰ ختم نبوت کا فیض ہوگی۔ اس لئے آپ نبوتوں کا سرچشمہ بھی ہیں اور ولایتوں کا بھی۔ انبیاء نے سابقین ہوں یا اولیاء نے لاحقین سب کو نور اس ایک آفتاب سے ملا ہوا ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگلوں کو آپ سے یہ نور بہ صورت نبوت پہنچا اور پچھلوں کو بہ صورت ولایت۔ پس انبیاء نے ائم بھی آپ ہی سے مستفید ہیں اور اولیاء نے است بھی آپ ہی کے در یوزہ گہ ہیں۔ نور سب میں ایک اسی آفتاب نبوت کا کار فرما ہے۔ البتہ یہ تفاوت ضرور ہے کہ اگر آئینہ سورج کے سامنے رکھا جائے تو وہ چمک اٹھے گا۔ مگر اس کی یہ چمک دمک جب ہی تک قائم ہے گی۔ جب تک آئینہ سورج کے سامنے حاضر ہے۔ لیکن اگر آئینہ منہ پھیر لے یا اس پر حجاب ڈال دیا جائے تو آئینہ کی چمک دمک اسی وقت ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر آفتاب کی منور شعاعوں سے بیٹری بھری جائے جو سورج کی کرنوں کی روشنی اور گرمی دونوں جذب کر لے تو سورج اگر اوٹ میں بھی آجائے گا تب بھی بیٹری اپنا کام کرتی رہے گی۔ خواہ اس سے روشنی کا کام لیا جائے یا حرارت ڈالنے کی پہلی مثال اولیاء نے امت کی ہے اور دوسری انبیاء علیہم السلام کی۔ پس انبیاء علیہم السلام کی نبوت اپنے حدود

میں تو خاتم النبیین کے تابع ہے۔ لیکن بقا میں مستقل ہے۔ مگر اولیائے امت کی ولادت حدوث و بقاء دونوں میں آفتاب نبوت کی محتاج اور درو یوزہ گر ہے۔ اس لئے انبیائے سابقین کی نبوتیں جہاں آفتاب کا ظل محض ہیں۔ وہیں ایک گونہ استقلال بھی رکھتی ہیں لیکن ولایت اولیاء حدوث و بقاء دونوں میں تابع محض ہے اور آفتاب نبوت سے ہٹ کر کسی درجہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔

اب خاتم النبیین کے اس جامع فرائض و رہنمائی کے حاوی نقشہ پر اس تمثیل کی روشنی میں غور کیجئے کہ اس نے عالم میں طلوع ہو کر اس دنیا کے لئے مدنی کی خدمت کیا کی اور کس طرح اس ظلماتی دنیا کو نورانی سطح کے سب سے اوپر کے حصہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا جس سے ہر قوم اس کے نور کا اقتباس کرنے پر مجبور ہے اور اس نورانیت کے تدلیجی مراتب چونکہ خاتم النبیین کی ولادت باسعادت ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے سراج منیر کی اس پلینغ تشبیہ میں ولادت و بعثت اور کارہائے بعثت کا نقشہ دیکھئے۔



آفتابِ عالمیاب کے کام

اور اُن سے

مقاماتِ نبوت کی توضیح

خلقت اور ولادت

طبعی طور پر آفتاب کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس کا وجود اور خلقت ہے جس سے اسے اپنے سے متعلقہ مقاصد کی تکمیل کا موقع ملتا ہے اگر وہ پیدا نہ کیا جاتا تو عالم میں چاند نے اور روشنی کا وجود ہی نہ ہوتا اور کوئی بھی دنیا کو نہ پہچانتا گویا اس کے نہ آنے کی صورت میں نہ صرف یہی کہ وہ خود ہی نہ پہچانا جاتا بلکہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ پہچانی جاتی۔ ٹھیک اسی طرح اس روحانی آفتاب (آفتابِ نبوت) کے سلسلہ میں بھی اولاً حضور کی پیدائش ہے اور آپ کا اس ناسوتی عالم میں تشریف لانا ہے۔ اسکو ہم اصطلاحاً ولادت باسعادت یا سیلاؤ شریف کہتے ہیں۔ اگر آپ دنیا میں تشریف نہ لاتے تو نہ صرف یہی کہ آپ نہ پہچانے جاتے، بلکہ عالم کی کوئی چیز بھی اپنی عرض و غایت کے لحاظ سے نہ پہچانی جاتی۔ محمدؐ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ پس جو درجہ علوی آفتاب میں خلقت کہلاتا ہے۔ اسی کو ہم نے روحانی آفتاب میں ولادت کہا ہے۔ قرآن حکیم میں اس ولادتِ جسمانی کا صراحتہ کہیں ذکر نہیں ملتا، بظاہر اس لئے کہ یہ ولادت خود بذاتہ مقصود نہ تھی بلکہ اس سے مقصود ولادتِ نبوت و رسالت تھی تاہم قرآن نے اس پہلو کو کلیتہً چھوڑا بھی نہیں ہے۔ کنایتاً اور ضمنائاً

کا بھی ذکر فرمادیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ

ظاہر ہے کہ عمر کا تعلق ابتداء و ولادت سے لے کر وفات کی آخری ساعتوں تک سے ہے۔ اس لئے اس ضمن میں ولادت شریفہ کا ذکر بھی آجائے ہے۔ مگر ضمنی ہی طور پر کیونکہ مادی زندگی خود بذاتہ مقصود نہیں۔ اس سے مقصود روحانی زندگی ہے۔ اس لئے جب کسی کی روحانی زندگی کی اس کی بساط کی حد تک تکمیل ہو جاتی ہے جب ہی جسمانی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ بذاتہ مقصود ہوتی تو ختم نہ کی جاتی جیسا کہ روحانی زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ پس اس تشبیہ سے یہ درجہ بھی دسرا اچھا منیراً کے تحت میں اگر سراج منیر کا مدلول ہو جاتا ہے۔

طلوع اور بعثت

آفتاب میں وجود کے بعد دوسرا درجہ ظہور کا ہے کہ وہ طلوع کرے تاکہ دنیا کو روشنی حاصل کرنے کا موقع ملے جس کے لئے اسے آسمانوں میں چمکایا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس روحانی آفتاب (آفتابِ نبوت) کی ولادت باسعادت کے بعد آپ کا ظہور ہے یعنی بحیثیت پیغمبر کے آپ کا دنیا کے سامنے آنا ہے جس سے آپ کا لقب محمد ابن عبد اللہ کے بجائے محمد رسول اللہ ہوا، گویا یہ حضور کی ولادتِ ثانیہ تھی۔ جو ولادتِ جسمانی کے چالیس سال بعد ہوئی۔ پس یہ ولادت یا یہ ظہور ثانی ہی تمام سعادتوں اور کمالات کا حشر ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی ظہور کا نام بعثت ہے۔ پس مادی آفتاب میں جس درجہ کا نام طلوع ہے۔ روحانی آفتاب میں اسی درجہ کا نام بعثت چونکہ ولادتِ شریفہ کا اصل مقصد بھی بعثت تھی اور آپ کی نبوت و رسالت کو عالم میں پھیلانا تھا۔ ایسے قرآن حکیم میں بصراحت اور بار بار اور بصد احسان و مثبت و منہی اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ حَقَّقْتَ فِيهِمُ الْبَيْتَ الَّذِي يُبْنَىٰ عَلَيْهِمُ فِي حَقِّهِمُ الْعَالَمِينَ

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر

بَقَّتْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
 يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
 وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
 وَإِنَّ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ
 مُّبِينٍ

احسان کیا۔ جب کہ ان میں ان ہی کی جنس
 سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں
 کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے
 ہیں اور ان لوگوں کی سنائی کرتے ہیں اور
 ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے
 ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی
 میں تھے۔

پیکار اور دعوت

طلوع کے بعد آفتاب کی وہ خصوصیت جو سب سے پہلے سامنے آتی ہے۔
 یہ ہے کہ وہ رُخ دیکر کائنات پر طلوع کرتا ہے۔ یعنی منہ موڑ کر اور پشت دے کر بے
 رخ سے سامنے نہیں آتا۔ بلکہ رخ زیبا سامنے کر کے آتا ہے۔ اگر وہ کائنات کی طرف
 رخ نہ کرتا، بلکہ اس کا چہرہ صرف اس کے خالق و مالک کے ہی سامنے رہتا۔ مخلوق سے
 سے اسے سروکار نہ ہوتا تو عالم میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوتی جو ہے۔
 پس آفتاب کی یہ رونمائی اور رخ دیکر کائنات کی طرف متوجہ ہونا اس کی طرف
 سے ہنر نہ پکار کے ہے کہ لے روشنی۔ کہ پیاسوں میں نور لینے ہوئے آگیا ہوں روشنی
 کا امیر کام ہے۔ جسے روشنی درکار ہو وہ کھل کر میرے سامنے آجائے اور مجھ
 سے رشتہ جوڑے تو میں اُسے وابستگی کی حد تک اُسے روشن کروں گا۔ پھر اس وابستگی
 کے سلسلہ میں انبیائی توسع اور گنجائش دیتے ہوئے اسی زبان حال سے اس کی یہ بھی پکار
 ہوتی ہے کہ ————— ہاں۔ لے روشنی کے طلب گار و بارو روشنی لینے کی یہ صورت
 نہیں ہے کہ تم ٹکٹکی باندھ کر میری ذات کو دیکھنے لگ جاؤ۔ کیونکہ ہر کس و نا کس میری ذات
 کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا کہ میری ذات ان ضعیف نگاہوں سے بالاتر اور نور کی اعلیٰ ترین
 قوت و شدت لئے ہوئے ہے۔ جس پر نگاہیں کبھی نہیں جم سکتیں اور جادوی جائیں گی تو

وہ باقی نہیں رہ سکتیں، ایسے مجھ سے روشنی حاصل کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مجھے اور میری نوری خصوصیات سے نگاہ لٹائے بغیر میری شعاعوں کے نیچے آ جاؤ۔ جس سے تمہیں تیز سے تیز مگر قابل برداشت روشنی مل جائیگی اور میری ذات کے ساتھ کنکشن بھی ہو جائے گا کہ کرنیں میری ہی ذات کی مانند ہیں، لیکن کوئی شعاعوں کی تاب نہ لاسکے تو وہ میری دھوپ میں آ جائے، جو شعاعوں کے نیچے ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، جو بھی مکان سے باہر نکل کر اس کے دائرہ میں چلا آئیگا، وہ نکل کا کل روشن ہو جائیگا اور اسے بھی روشنی اور مجھ سے وابستگی مل جائے گی، کیونکہ دھوپ بھی میری ہی ہے، مجھ سے منقطع یا الگ نہیں ہے، لیکن جسے دھوپ کی بھی سہارا نہ ہو اور وہ بند کو ٹھہری چھوڑ کر کھلے صحن میں بھی نہیں آ سکتا تو میری دھوپ کے ساتھ اسکا چاندنا بھی لگا ہوا ہے، جو میری ہی چمک دک ہے، وہ اندرون مکان میں رہ کر کم از کم مکان کے دروازے ہی کھول دے گا تو میرا چاندنا ہی اندر پہنچ جائیگا اور اسے چاند نے ہی سے روشنی میسر آ جائیگی، گویا روشنی ملے گی اور ضعیف ہوگی، مگر وہ پھر بھی مجھ سے منقطع نہ ہوگا، کیونکہ یہ چاندنا بھی میرا ہی فیض ہے، ہاں جو کونوں سے بھی الگ رہے، دھوپ میں بھی نہ آئے، مکان کا دروازہ کھلا چاند نے کیلئے کھلا نہ رکھے، بلکہ کسی اندھے تر خانے میں گھس کر اوندھے منہ پڑ رہے اور اور اوپر سے آنکھ بھی بند کر لے اور اسی کے ساتھ آنکھوں پر پٹی بھی چڑھائے، گویا نہ صرف یہی کہ وہ روشنی کا طلب گار نہیں، بلکہ روشنی سے اسے سیر اور نفرت بھی ہو تو اس کیلئے روشن ہونے کی کوئی صورت نہیں، وہ ہمیشہ کے لئے روشنی سے محروم رہے گا گو کسی حد تک اس کے بلا ارادے بلکہ مرضی کے خلاف محض علم و شعور کے درجہ میں اسے یہ پتہ چلتا رہے کہ دن ہے رات نہیں اور سورج نکلا ہوا ہے، چھپا ہوا نہیں ہے، مگر یہ علم اس کے لئے کارآمد یا روشنی بخش نہیں، جس سے اس کے بدن میں میری روشنی اور گرمی کے صحت بخش آثار گھس سکیں اور اس کی طبعی زندگی اس سے ابھر سکے، بس اس صورت میں وہ اپنی صحت و توانائی سب کچھ کھو بیٹھے گا اور اس کی زندگی دوامی طور پر ختم ہو جائے گی، جو ہر طرح کا گھانا ہی گھانا اور خسارہ ہی خسارہ ہے، ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کی

وہ خصوصیت جو فاران کی چوٹیوں سے طلوع کے بعد سب سے پہلے سامنے آتی ہے۔ یہ ہے کہ یہ مبارک آفتاب مخلوق سے منہ موڑ کر اس کے سامنے طلوع نہیں ہوا کہ اس کا رخ زیبا صرف خالق ہی کے سامنے ہو اور وہ خلوت کدہ میں رہ کر ہمہ وقت صرف یادِ الہی میں مستغرق ہو، بلکہ توجہ الی اللہ کے ساتھ ساتھ اس کی پوری پوری توجہ مخلوق کی طرف بھی ہے اور پیغمبری کے رخِ زیبا کا پورا پورا رخ خلق اللہ کی طرف بھی ہے۔

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل

پیغمبری کے رخ دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے روحانی ظلمت زدوں کو لٹکا اور پکارا کہ اے روحانیت و سعادت کی روشنی کے بلبگارو! میں روحانیت کا وہ کامل نور لئے ہوئے آ گیا ہوں جس کی دنیا عرصہ سے منتظر تھی۔ اب جسے روشنی درکار ہو، وہ میرے سامنے کھلے دل سے آجائے اور پیروی و اطاعت کا جذبہ لے کر بڑھے تو میں سلامتی کے راستے دکھا دوں گا اور تاریکیوں سے نکال کر نورانی فضاؤں میں لے آؤں گا۔

قد جاءکم من اللہ نورٌ و کتابٌ	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک
بین ینہدی بہ اللہ	روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب کہ اس
من ابع رضوانہ سئل السلام	کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو
و یخرجہم من الظلمات الی	جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی
النور باذنہ ویہدیہم الی	کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق
صراطٍ مستقیمہ	سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے
	آتے ہیں اور ان کو راہِ راست پر قائم رکھتے

میں۔

آفتاب نبوت کی جانب سے نور کی پیش کشی نہ کہ ذات کی پیش کشی

مگر اس آفتاب نبوت کی جانب سے یہ بھی جتلا دیا گیا کہ نور حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگ پیغمبر کی ذاتی زندگی اور خصوصیات پیغمبر کی طرف دیکھنے لگیں کہ یہ زندگی

مقاماتِ نبوت سے وابستہ ہونے کے سبب نہایت ارفع و اعلیٰ ہے جس کی طرف کوئی نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی اس کا حوصلہ کر لگا تو عقلیں اور بصیرتیں کند ہو کر رہ جائیں گی اور باطنی آنکھ کی مینائی جاتی رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ خصوصیاتِ نبوت کی پیروی سے روک دیا گیا کہ ان کا تحمل نبوت ہی کی قوت کر سکتی تھی۔ جیسے ابو قتادہ کی روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضور سے سوال کیا کیفِ تصوم؟ آپ روزے کیسے رکھتے ہیں؟ تو آپ غضبناک ہو گئے کہ پیغمبر کے مخصوص افعال و انداز کی پیروی کا حوصلہ اپنی طاقت اور اندازہ سے بڑھ کر دعویٰ ہے۔ جو بے ادبی بھی ہے اور محرومی بھی۔ جب فاروق اعظم نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ افضل روزے کون سے ہیں۔ تب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور جواب عطا فرمایا۔ یا جیسے آپ ضوم وصال (بلا افطار روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے تھے۔ مگر اوروں کو اس کی اجازت نہیں دی اور ایکو مثلی (تم میں مجھ جیسا کون ہے؟) فرما کر اس حوصلہ سے روک دیا گیا۔

بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے میں فرمایا گیا کہ اجرا دھارہ جاتا ہے۔ لیکن عبداللہ ابن عمر نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ تو اس میں ادھا اجر فرماتے تھے۔ پھر بیٹھ کر کیوں نماز ادا فرما رہے ہیں؟ تو فرمایا۔ انی لست کاخذ منکم۔ (میں تم میں سے کسی جیسا نہیں ہوں)

آپ پر تہجد فرض تھا۔ لیکن دوسروں کی یہ طاقت نہیں کہ اسے فریضہ کی حیثیت سے نباہ سکتے تو انہیں فرضیت سے روک دیا گیا۔ آپ روزانہ پچاس نمازیں فرض کے طور پر ہی ادا فرماتے تھے۔ جو معراج میں ابتداً فرض ہوئیں اور بعد میں تخفیف ہو کر صرف پانچ رہ گئیں۔ لیکن دوسروں کے لئے عادتاً محال تھا کہ وہ اس عزیمت پر ہمیشگی کر سکتے۔ اس لئے ان پر یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان سے ساقط کر دیا گیا۔

آپ کے خلقِ عظیم پر عفو و درگزر چھوڑ کر انتقام لینا شاق تھا۔ اور عمر بھر اپنی ذات کے بارے میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ لیکن دوسروں کی یہ مجال کس سے ہے کہ اس بے نفسی؟

استقامت دکھائیں۔ اس لئے انہیں انتقام کی اجازت دی گئی۔ آپ نواز وراج مطہرات رکھ سکتے اور سب میں عدل کامل فرما سکتے تھے۔ دوسروں کے لئے متعذر تھا۔ جب کہ وہ عموماً دو میں بھی عدل مشکل ہی سے کر پاتے ہیں تو انہیں اس عدوی سے روک دیا گیا: آپ کے گھر میں ایک ذرہ برابر سونا چاندی نہ رہتا تھا۔ دوسروں کے لئے یہ محال تھا تو امت کو اس میں توسع دیا گیا کہ وہ مالی حقوق زکوٰۃ و صدقات وغیرہ دیکر باقی ماندہ مال گھروں میں رکھ لیں، بہر حال یہ اور انہیں کی مانند اور بہت سی خصوصیات نبوی امتی کی زندگی سے بالاتر ہیں جن کی اقتدار کرنا کسی کا حوصلہ نہ تھا۔ صحابہ نے بھی اس ذاتی زندگی کی اقتدار نہیں کی، تاہم اولیاء چہ رسد؟ ایسے آفتاب نبوت کی ذات اور ذاتی زندگی کی خصوصیات کو بالاتر رکھ کر اس سے چھٹنا ہوا اور یعنی قانون شریعت ہی دنیا کے لئے رہنما بنایا گیا، جس میں عام مخلوق کی رعایت سے توسعات اور گنجائشیں رکھی گئیں اور اسے سہل نہ کر دیا گیا تاکہ عوام و خواص اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکیں کہ یہ شریعت ہی نور نبوت ہے، مگر قانون عام کی صورت میں نہ کہ ذاتی زندگی کی صورت میں بہر حال آفتاب نبوت نے سب سے پہلے اپنے آنے اور آنے کے مقصد کا اعلان کرتے ہوئے اس مقصد کی طرف اجمالی دعوت دی اور پکار کی۔

یہ فرمایا سب سے کہ لے آں غالب

مجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا

کہا گر مجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے، اگر میں کہوں گا

کہ فوج گراں پشت کوہ صفا پر

پڑھی ہے کہ ٹوٹے تمہیں گھات پا کر

کہا تیری ہر بات کا یاں یقین ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امین ہو

کہا گر میری بات یہ دل نشین ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہو

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت مادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز سے سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق ہے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

و داعياً الحی اللہ باذنہ و سر اجا منیرا۔

پس یہ دعوت آفتاب نبوت کی پکار تھی جو آفتاب مادی میں رونمائی کی صورت
میں زبان حال سے ہوتی ہے اور اس روحانی آفتاب میں توجہ کی صورت میں زبان
حال سے ہوئی کیونکہ وہ نیکوئی پکار تھی اور یہ تشریحی پکار تھی۔

بیدار و سرشار کی تقسیم

پس جس طرح سے کہ مادی آفتاب کی اس عالی پکار اور اس کے رخ روشن کے سایہ
سے لوگ اک دم بڑا بڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور آنکھیں ملتے ہوئے ابتداءً تیر سے آنکھ
کھولتے ہیں، پھر جن کو مقاصد زندگی عزیز ہوتے ہیں، وہ اٹھ بیٹھتے ہیں اور اپنے معاشی
کاموں میں لگ جاتے ہیں، لیکن جنہیں نیند ہی عزیز ہوتی ہے، انہیں یہ آفتاب کی رونمائی سخت
گراں گزرتی ہے اور وہ منہ پر پلے کر اور زیادہ گہری نیند سو جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح
روحانی آفتاب کی اس مادیانہ پکار اور دعوت الی اللہ کو سن کر سننے والے تیر سے رہ گئے، پھر
بعض کو سمجھ میں آیا تو وہ خواب غفلت کو چھوڑ کر اس روحانی روشنی میں اپنے روحانی مقاصد
کی طرف دوڑ پڑے اور انہوں نے اس کی تلاش و جستجو شروع کر دی اور جنہیں تعصب
و قسوت ہی عزیز تھی، انہوں نے اس روشنی کو اپنے حق میں گراں بار اور ہلک سمجھا تو پہلے
سے بھی زیادہ غافل اور اعراض کفندہ بن کر اس روشنی ہی کے پیچھے پڑ گئے، فَعِنھُمْ
مَنْ اٰمَنَ بِہِ و مَنْھُمْ مَنْ کَفَرَ ۝

پھر حال آفتاب کی رونمائی اور اس کی پکار کے بعد آپ کا موقعہ آگیا کہ آفتاب اپنا کام
کرے اور جو کچھ وہ لے کر آیا ہے، وہ دنیا کو دے، اس لئے اب اس بلخ تشبیہ کی روشنی

میں آفتاب نبوت کے چارگانہ مقاصد طلوع کو سمجھئے۔

تنویر اور تعلیم

جس طرح مادی آفتاب کی اس توجہ یا پیکار کے بعد سب سے بڑا اور سب سے اہم کام تنویر ہے، یعنی عالم کو نور بخشنا جس کی روشنی میں لوگوں کو سیاہ و سپید کا امتیاز اور اشیاء کی پہچان ہو۔ ان کی زندگی کے مشاغل عمل میں آنے لگیں اور دنیا سوتے ہوؤں کا قبرستان نہ رہے، بلکہ جاگتے ہوئے متحرک اور زندہ انسانوں کا جہان نظر آئے اور یہ زندگی بغیر چاند نے کے نہیں چنانچہ قرآن نے زندگی کے معاش کی تکمیل ہی سورج کی روشنی اور دن پر معلق رکھی ہے۔ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (جسے ہم تنویر کہتے ہیں) اسی طرح روحانی آفتاب کی دعوت و پیکار کے بعد نبوت کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کام علم الہی کی روشنی پہنچانا ہے کہ اس کے بغیر نہ حق و باطل میں امتیاز ہو سکتا ہے نہ روحانی زندگی کی بنیادیں ہی قائم ہو سکتی ہیں۔ اور نہ معاد ہی کی زندگی بن سکتی ہے۔ اسی کو شرعی اصطلاح میں تعلیم کہتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے فرمایا۔ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں) اسی کو فرمایا اِنَا قَسَمُ وَاللّٰهُ يَعْطِي (میں تقسیم کنندہ) علم) ہوں اور اللہ دینے والا ہے) اور اسی کو قرآن نے فرمایا۔ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (اور ان کو کتاب اور دانش مندی سکھاتے ہیں)

پس جس طرح مادی آفتاب اپنا جسمانی جمال دکھلا کر زمین و زمان میں چاند بنا کر تا ہے اسی طرح روحانی آفتاب یعنی آفتاب نبوت اپنا پیغمبرانہ جمال دکھلا کر کون و مکان میں چاند بنا کرتا ہے۔ وہ اپنا مادی چہرہ دکھلاتا ہے، جو ظاہری جمال ہے، پیغمبرِ نبویؐ کا جمال دکھلاتے ہیں جو ان کا حقیقی جمال ہے اور جس کی حقیقت علم ہے کہ یہی پیغمبرِ نبویؐ کا اصل اصول ہے۔ کیونکہ پیغمبرِ نبویؐ وحی الہی سے بنتی ہے اور وحی قلبِ نبویؐ پر علم اتارے جانے ہی کو کہتے ہیں۔ پس پیغمبرِ نبویؐ درحقیقت علم الہی کا وزوٹھہر اور اس علم کا دوسروں تک پہنچانا ہی تعلیم ہے۔ اس لئے جو درجہ مادی آفتاب کے سلسلہ میں تفریق کھلائے۔ (یعنی نور پہنچانا) وہی درجہ روحانی

آفتاب کے سلسلہ میں تعلیم کہلائے گا۔ یعنی وحی الہی اور علم پہنچانا۔

تاثر و تربیت

پھر مادی آفتاب محض روشنی نہیں پہنچاتا۔ جو اجزائے کائنات کہ بدنوں، چہروں اور بشری پر پڑ کر رہ جاتی ہے۔ جس سے اجسام ظاہری کی سطح منور ہو جاتی ہے۔ بلکہ نور کے ساتھ وہ کائنات پر حرارت اور گرمی بھی پھینکتا ہے جو بدنوں کے اندر گھستی اور نفوذ کرتی ہے غلام کو پختہ کرتی ہے۔ اشیاء کے اندرون میں سے عفونت دور کر دیتی ہے نجاسات کو خشک کر کے پاک کر دیتی ہے۔ اگر آفتاب تفیذ حرارت نہ کرے اور اپنی سوزش و طیش سے اشیاء کے مزاجوں تک میں نہ گھسے تو صورتیں تو منور ہو جائیں۔ مگر مزاج بدستور فاسد رہ جائیں۔ ان کی اصلاح نہ ہو اور وہ مرطوب رہ کر فنا کے گھاٹ اتر جائیں۔ اس لئے وہ ظاہر کو ردشن کرنے کے ساتھ باطن میں بھی گرمی پہنچاتا ہے تاکہ مزاجوں میں حرارت عزیز می پیدا ہو اور زندگی کی نمود قائم رہے۔ چنانچہ اس حرارت رسانی سے مرطوب مزاجوں میں بھی حرارت اس درجہ نفوذ کرتی ہے کہ امراض بارہ کلیتہً ختم ہو جاتے ہیں۔ سردی کے مریض گرمی میں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ در و دیوار وہی ہیں جو پہلے تھے۔ فرق یہ ہے کہ آفتاب اپنی حرارت کو اندرون مزاج تک میں نفوذ تک کا موقع دیتا ہے اور اس موسم میں اسے تیز کر کے زیادہ سے زیادہ طبیعتوں کی گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ جو سردی میں نہیں کرتا۔ ہاں جو لوگ خلقت اعتدال مزاج یا تحمل کی قوت نہیں رکھتے۔ بعض اوقات موسم گرم میں شدت حرارت سے ان کے مزاجوں میں جھنجھلاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ان کے مزاج کا قصور ہوتا ہے نہ کہ آفتاب کا۔ لیکن عام طور پر گرمیوں صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آفتاب کی حرارت اندر گھس کر اپینے کے راستے سے فضلات رو بہ اور طویات فاسدہ کو باہر نکال کر پھینک دیتی ہے جس سے بدن تھرا اور منقہ ہو جاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت جیسے نور علم انسانوں پر ڈال کر ان کے ظواہر کو منور کرتا ہے۔ ویسے ہی اس کی اخلاقی حرارت اور گرمی عشق خداوندی دلوں کے اندر گھس کر روحوں کو

گرماتی ہے اور روحانی مزاج یعنی فطرت کو صحت مند بنا دیتی ہے۔ سستی و کسل اور کبر و
 نخوت اور ساری ہی اخلاقی گندگیوں کے فاسد فضلات کا میل کچیل جلا کر قلب کو پاک و
 صاف بنا دیتی ہے جس سے روحانی صحت بحال اور ترقی پذیر ہو جاتی ہے۔ گریبان اخلاق
 صبر و شکر، حیا، سخا، شجاعت و مروت، غیرت و حمیت، حلم و انابت، رضامند و تسلیم، زہد و تقاوت
 و درع و ایثار اور دوسری پاکیزہ فضلتوں کو نکھار کر نفس میں جلا پیدا کر دیتی ہے۔ مزاجوں
 میں گرمی عشق الہی اور محبت نبوی کی آگ بھڑک جاتی ہے جس سے نفوس مصفا اور سز کی
 ہو جاتے ہیں پس مادی آفتاب کے سلسلہ میں جس چیز کو ہم تاثیر کہتے ہیں۔ روحانی آفتاب
 کے سلسلہ میں اسی چیز کو ہم تزکیہ اور تربیت کہتے ہیں پس جیسے مادی آفتاب کی تاثیر جسم
 کے اندروں میں پہنچ کر انہیں تپا دیتی ہے۔ ایسے ہی روحانی آفتاب کی اخلاقی تاثیر روحوں
 میں پہنچ کر انہیں عشق خداوندی میں گرم جوش اور روان دواں کر دیتی ہے جس کا ثمرہ انسانی
 نفوس میں اخلاق ربانی پیدا ہو جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ دل صیقل ہو جاتے ہیں۔
 رو میں شفاف بن جاتی ہیں۔ مجاہدہ و ریاضت اور جہاد فی سبیل اللہ آسان ہو جاتا ہے۔
 اسی کو حضور نے ارشاد فرمایا :-

بِعْتَمَلِ لَاتِمُوا مَكَارِمَ الْاِخْلَاقِ فِي مَكَارِمِ الْاِخْلَاقِ كَمَا تَكْمِلُ الْكَلِمَةَ لِمَعْرُوثِ
 كَيْفَا كَيْفَا هُوَ۔

میرا حال آفتاب نبوت کی تعلیم و تربیت کی مثال مادی آفتاب کی تنویر و تاثیر ہے اور
 خود آپ کے علم و اخلاق کی مثال آفتاب کی روشنی اور گرمی ہے۔ پس جیسے سورج کا اثر روشنی
 اور گرمی ہے۔ روشنی سے راہ نظر آتی ہے اور گرمی سے رہروی کی قوتیں ابھرتی ہیں۔ گویا انسان
 کی قوت علمیہ اور قوت عملیہ دونوں کے ابھرنے کا سامان مہیا ہو جاتا ہے جو مادی دنیا میں
 کام کرتی ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا اثر علم اخلاق کی قوتوں کا ابھار ہے جس سے انسان میں
 علم و معرفت اور ہمت و قوت کی طاقتیں ابھرتی ہیں۔ کیونکہ انبیاء سب سے پہلا شخص جو سعادت
 مندوں کو دیتے ہیں۔ وہ ایمان ہے اور ایمان کی حقیقت معرفت جزو اول ہے جس سے
 راہ حق پہچانی جاتی ہے اور دوسرا جزو محبت ہے جس سے جذبہ انقیاد پیدا ہوتا ہے پہلی

چیز سے قوت علم مضبوط ہوتی ہے اور دوسری چیز سے قوت عمل مستحکم ہوتی ہے۔ یہی دو طاقتیں انبیاء کی مخصوص طاقتیں ہیں۔ جن کے دینے کے لئے وہ دنیا میں آتے ہیں۔ ان کی دو طاقتوں کی طرف قرآن حکیم میں اشارہ فرمایا گیا ہے :-

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَاٰدَمَ
وَيَعْقُوْبَ اُولٰٓئِیْكَ الَّذِیْنَ كُنَّا نَخْشٰى
وَالْاَبْصٰرَ

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اولوالایدمی کی تفسیر اولوالقوت فی العبادت (عبادت کی طاقت والے) سے کی ہے اور اولوالابصار کی تفسیر اولوالفقد فی الدین (دین کی سمجھ رکھنے والے) سے کی ہے اور یہی دو قوتیں ہیں۔ جنہیں قوت علمیہ اور قوت عملیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے :-

وَجَعَلْنَا هُمْ اُمَّةً یَهْتَدُوْنَ
بَاْمْرِ نَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا
بِاٰیَاتِنَا یُوقِنُوْنَ ۝۱۰۲
اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا بہت سے پیشوا بنا دیئے تھے۔ جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے اور وہ لوگ ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے۔

اس میں صبر سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ شہوتوں سے نفس کو روک لینا اور طاعتوں پر نفس کو جمائے رکھنا ہی عمل ہے اور ایقان سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یقین ہی سے علم پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ شک اور تردد سے جہل اور انہی ہو قوتوں میں سے جب علم کو دوسروں تک پہنچایا جائے گا تو اسے تعلیم کہیں گے اور عمل پہنچایا جائیگا۔ تو اسے تربیت کہیں گے۔ اس لئے آفتاب نبوت کی تعلیم و تربیت کی مثال آفتاب کی تئوریہ اور تاثیر بنتی ہے۔ جس سے نبوت کے یہ دو بنیادی مقام بھی سراج منیر کی تشبیہ سے ثابت ہو کر اس قرآنی آیت کا مدلول ٹھہر جاتے ہیں۔

اوضاع و سنن

پھر جس طرح مادی آفتاب کی نورانیت اور اس نور سے کائنات میں تاثیر اور اس کی تربیت کی کوئی ایک ہی وضع نہیں، بلکہ فلک پر وہ اپنی نقل و حرکت سے اپنی مختلف اوضاع و اطوار اور مختلف ہیئتیں قائم کرتا رہتا ہے، جن کے مختلف آثار سے دنیا متاثر ہو کر اپنی مادی تکمیل کرتی ہے۔ جیسے کبھی طلوع اور کبھی غروب، کبھی عروج اور کبھی نزول، کبھی استواء اور کبھی انحطاط، کبھی بانگی حرکت اور کبھی مستقیم حرکت۔ پھر ان میں سے ہر حرکت میں نور بھی متفاوت پڑتا ہے اور تاثیر بھی مختلف ہوتی ہے۔ طلوع کے وقت روشنی اور گرمی ہلکی ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ نہیں ہوتی۔ استواء کے وقت روشنی اور گرمی کی شدت ہوتی ہے اور ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔

زوال کے بعد تیسرے پہرے میں وہ شدت نہیں رہتی اور غروب کے وقت انتہائی خفقت ہو جاتی ہے، غرض سورج کی رفتار اور رفتار سے پیدا ہونے والی اوضاع و اطوار کا کوئی ایک ہی نمونہ اور ایک ہی ڈھنگ نہیں، بلکہ سینکڑوں طریقے اور متعدد متحرک نمونے ہیں جن سے دنیا الگ الگ نوع کا اثر لیتی ہے۔ اس کی ابتدائی وضع یعنی ہیئت طلوع سے تو طبعاً ہی میں ابھار آمادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے چڑھانے سے ہمتوں اور افعال میں قوت آ جاتی ہے اس کے استواء سے مزاجوں میں گرمی اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ڈھلاؤ سے مزاجوں میں سستائی اور راحت لینے کے جذبات ابھر جاتے ہیں۔ اس کے غروب سے تھکن، ماندگی اور خوابِ راحت کے میلانات ابھرتے ہیں۔ ان سارے ہی امور سے مل کر انسانی زندگی بنتی ہے اور اس کے مزاج میں پختگی آتی ہے جسے تکمیل انسانیت کہتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب روحانی کی تعلیم، مقامات اور تربیت حالات کے نمونے اس کی روحانی رفتار ہی سے ہے اور اس کی تاثیریں الگ الگ انداز سے ہی امت کے روحانی مزاجوں پر پڑیں جن کو اپنی اپنی ہیئت پر آفتابِ نبوت نے عملاً پیش کیا۔ آفتابِ نبوت طلوع کے بعد جب اٹھا تو اسکا نور ہلکا اور گرمی ضعیف تھی، جو سہانی ہوئی تھی تو یہی وہ عدم شدت اور

صبر کا نمونہ ہے، جس میں روحانی مزاجوں کو منڈھے اور ملے رہنے پر ڈھالا گیا۔ نہ قتال کی اجازت تھی نہ سخت گیری اور سخت گوئی کی۔ جو مکہ کی زندگی تھی اور جمالی تھی، پھر آفتاب نبوت اور اونچا ہوا اور تیزی بڑھی تو مزاجوں میں روحانی غیرت کا پہچان ہوا اور ہجرت کا نمونہ پیش کیا گیا جس میں گزشتہ اعراض اور پہلو بہتی کو چھوڑ دیا گیا جو درمیانی زندگی تھی، بلکہ دشمنانِ حق سے کنارہ کشی اور یکسوئی کی حکمت عملی اختیار کی گئی، پھر استوار پہنچا اور نور و حرارت کی شدت انتہا کو پہنچ گئی تو یکسوئی کو خیر باد کہہ کر جہاد و قتال کا نمونہ پیش کیا گیا جو مدینہ کی زندگی تھی اور جلالی تھی، جس میں قوت اور تشدد کے مظاہروں کا نمونہ دکھلایا گیا، غروب کے قریب پہنچا اور شوکت کی تعمیل ہو گئی تو اجتماعیت کی وعظ، تعلیم تنظیم، تلقین عمومی نظام اسر بالمعروف و منہی عن المنکر کے عمل نمونے دکھلائے گئے اور غروب ہو گیا تو قلوب میں اچانک تھیر و ماندگی پیدا ہوئی۔ بعض صحابہ فرماتے ہیں کہ ابھی حضور کو ہم مٹی ہی دے رہے تھے کہ انکونا قلوبنا (قلوب میں ہم نے نکارت محسوس کی) بعض کو ظلمت کا احساس ہوا، بعض پر حیرت زدگی کی کیفیت طاری ہو گئی، جیسے عثمان غنی کو یہ بھی خبر نہ رہی کہ مجھے کس نے سلام کیا ہے اور مجھے جواب سلام دینا چاہیے، فاروق اعظم غلبہٴ محبت میں یہ بھی پیش نظر نہ رکھ سکے کہ آپ کی وفات ہو گئی ہے، بعض صحابہ کے ذہنوں میں یہ جم گیا کہ حضور بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھائے گئے ہیں اور یہ محض غلبہٴ حال اور غلبہٴ حیرت و حسرت کی بنا پر ہوا، غرض یہ قلبی ماندگی اور ٹھکن کے آثار تھے، جس سے یہ جتلا یا گیا کہ آفتاب نبوت کے کیا اثرات تھے، جو آج بلا واسطہ سامنے نہیں رہے، مگر اس سلسلہ میں آفتاب نبوت کی ان ہدایات نے دستگیری کی جو ایسے مواقع کے لئے صحابہ کو دمی جا چکی تھیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی محبت قلبی اور تصرف باطنی نے کام کیا، جس سے صحابہ سنبھلے اور کار نبوت کو پھر اسی قوت سے جاری کیا، پس اس موقع پر بھی آفتاب نبوت کی ایک شان نمایاں ہوئی کہ ایسے مصیبت افزا وقت میں کیا کرنا چاہیے؟ پھر اس طلوع و غروب کے درمیان کی عروجی اور نزولی زندگی میں جلال و جمال کے ہزار با مختلف عملی مدارج امت کے سامنے آتے رہے، کبھی جان کی بازی لگا کر میدانِ جہاد کو لالہ زار بنانے کا نمونہ سامنے رکھا اور کبھی میدان سے ہٹ کر گوشہٴ مسجد کو اغتکاف و

ذکر اور تسبیح و صلوات سے معمور کرنے کا نمونہ پیش فرمایا کبھی مہینوں فقر و فاقہ سے کمر نفس کے نمونے سامنے رکھے اور کبھی جائز لذات کو جائز بتلانے کے لئے گہرہ و بگہرہ بعض لذتوں کے استعمال کرنے کھانے پینے اور بعض اچھے لباسوں میں منتقع ہونے کے نمونے بھی دکھلائے کبھی شفقت علی الخلق کے جذبہ سے اولاد (حسین) کی محبت زو حبیہ پاک (صدیقہ عائشہ) کی محبت۔ دوست صادق (صدیق اکبر) کی محبت کے اعلان کا نمونہ پیش کیا اور کبھی توجہ الی اللہ کے جذبہ سے مخلوق سے استغنائی جذبات کے نمونے یہ کہہ کر پیش کئے کہ میں اگر کسی کو دوست بناتا تو وہ ابو بکر تھے مگر میرا دوست صرف اللہ ہے۔ کبھی رحمت مجسم بن کر بتا دیئے کا نمونہ دکھلایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ وہ جنت میں داخل ہوا اور اللہ کی رحمت سے ہرگز مت مایوس ہو کر یہ کام کفار اور منکروں کا ہے اور کبھی غضب مجسم بن کر عذاب الہی سے ڈرانے دھمکانے کا نمونہ پیش کیا کہ اگر ذرہ برابر بھی کبر کسی کے دل میں رہا تو وہ جنت کی ہوانہ کھائے گا۔ کبھی بُعثتُ مرحمةً (میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں) سے حوصلہ افزائی کا نمونہ دکھلایا اور کبھی بُعثتُ ملحمةً (میں جنگ مجسم بنا کر بھیجا گیا ہوں) سے دھمکانے اور انداز کا نمونہ پیش کیا۔ کبھی ترک جماعت پر گھروں کو جلا دینے کی دھمکی دی اور کبھی بارش سے جو تے تر ہو جانے پر امنی گھروں میں ناز کی اجازت دی۔ کبھی انا الضحوک (میں بہت ہنس مکھ ہوں) فرما کر دل داری کی اور کبھی انا القتال (میں بہت جنگ جو ہوں) فرما کر نڈر دلوں کو خوفزدہ بنایا۔ غرض مختلف سنتوں اور عمل کے متفاوت پاکیزہ نمونوں کی جلال اور جمالی روشنیوں۔ مہر اور قمر کے محتدل اور کامل عملی نمونے دیانت دہی کے موثر ڈھنگ اور صلح و جنگ اور تعمیر و دفاع کے دلپذیر انداز دکھلا کر ایک جامع ترین ”اسوۂ حسنہ“ قائم فرمایا جو اس روحانی آفتاب کے عروج و نزول اور روحانی نقل و حرکت سے پیدا ہوا جس میں ہزار ہا روحانی اوضاع و اطوار شامل ہیں جس سے شمائل کی کتابیں بھری پڑھی ہیں۔

احوال و مقامات کے یہ عملی نمونے امت کے طبعی اور طبقاتی تغیرات کی رعایت سے آفتاب نبوت نے پیش کئے تاکہ دنیا ان کی پیروی کر کے اور ان احوال کے مرد و گرم سے

گزر کر پختگی کے مقام تک پہنچ جائے۔ پس مادی آفتاب میں جو درجہ اوضاع فلکی کے نوع بر نوع نمونوں کا ہے۔ وہی درجہ آفتاب نبوت میں سنن نبوت اور اوضاع روحانیت یعنی اسوہ حسنہ کا ہے۔ تکمیل معاش کے لئے مادی آفتاب نے عروج و نزول، نور کی شدت و خفت اور حرارت کی کمی و زیادتی کے نمونوں کا زبان حال سے اعلان کیا تاکہ دنیا ان نمونوں کے تقاضوں پر چلے اور اپنی مادیت کو ان نمونوں سے گزار کر مکمل کر لے۔ یہاں تکمیل معاد کے لئے آفتاب روحانی نے اپنے روحانی عروج و نزول اور شدت و خفت کے قوی اور عملی نمونے دکھلا کر دنیا کو ان نمونوں کے مطابق زندگی گزارنے کی طرف بلا یا۔ پس وہاں فلکی بروج منازل آفتاب مادی کے عملی مقامات ہیں اور یہاں ملکی احوال و منازل آفتاب روحانی کے عملی مقامات ہیں، وہ مادی سورج کا تکوینی اسوہ حسنہ ہے اور یہ روحانی سورج کا تشریحی اسوہ حسنہ ہے جس کو قرآن نے فرمایا:-

تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کیلئے	لقد کان لکونی رسول اللہ
جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو	أَسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا
اور کثرت سے ذکر الہی کرتا ہو۔ رسول اللہ	اللہ والیوم الآخر و ذکر اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمدہ نمونہ	کثیراً

موجود تھا۔

یہی وہ حکمتِ عملی ہے جس کو قرآن نے تعلیمِ حکمت کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ اب ان تعلیمی، تربیتی اور حکمتی نمونوں کا جو ان ہر دو مادی اور روحانی آفتابوں سے سرزد ہو رہے ہیں، اصطلاحی الفاظ میں اجمال کیا جائے تو اس کے خلاصہ میں چار باتیں نکلیں گی جو گویا ان آفتابوں کے فریضے ہیں۔ مگر مادی سورج پر تکوینی انداز سے اور روحانی سورج پر تشریحی انداز سے یہ فرائض عائد ہیں۔ مادی سورج کو ایسے تو تکوینی طور پر اس پر چار فریضے عائد کئے گئے ایک توجہ یعنی منظر عام پر طلوع ہو کر رخ روشن دکھلانا گویا زبان حال سے پکار دینا کہ میں نور سے کر آ گیا ہوں تاکہ نور کے طلب گار چونک سکیں۔ دوسرے تو یہ یعنی رخ روشن سے دوسروں کو روشنی پہنچا کر منور بنا دینا تاکہ ایک

چیز دوسرے سے متاثر ہو کر نظر آنے لگے۔

تیسرے تاثیر یعنی اپنے خواص و آثار جیسے گرمی و تپش اور سوزش سے دوسروں کو تپانا اور ان سے حرارت بھر دینا تاکہ ہر چیز حرارت غریزی کی زندگی سے ہلنے بھلنے کے قابل ہو جائے اور زندگی کی منزلیں عملاً طے کر سکے۔

چوتھے تاثر یعنی اپنی نقل و حرکت سے مختلف مقامات و اوضاع بنا کر دنیا کو مدارج زندگی طے کرنے کے نمونے دکھلانا اور اسوہ حسنہ بنانا تاکہ ان سے گزرتے ہوئے لوگ اسے فطرت سمجھیں اور تکمیل انسانیت کی منزلیں طے کریں۔

ٹھیک اسی طرح اللہ کی تشریح نے روحانی سورج (ذات بابرکات نبوی) کو پیدا کر کے ان پر بھی چارہی فریضے عائد کئے۔

تلاوت

ایک توجہ یعنی منظر عام پر پہنچ کر پیغمبری کا جمال پیش کر دینا ہے اور علم کا جمال یا اس کی پاکیزہ صورت اس کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لئے علم الہی اور وحی خداوندی کے الفاظ پڑھ کر سنا دینا بلاشبہ جمال علم اور جمال پیغمبری ہے۔ جسے قرآنی اصطلاح میں تلاوت کہا گیا ہے۔

تعلیم

دوسرے تنویر یعنی علم الہی کی صورت سے اس کی اندرونی حقیقت تک پہنچانا (جس کا نام علم اور معنی ہے) یعنی الفاظ کے مطالب اور مرادات سمجھانا جو بلاشبہ کمال پیغمبری ہے اور جسے قرآنی اصطلاح میں تعلیم کہا گیا ہے۔

تزکیہ

تیسرے تاثیر یعنی اپنے قلب کی اخلاقی گرمی اور سوز عشق سے طالبوں کے قلوب کو تپانا اور قلب نبوت کی گرمی سے قلوب کو گرم کرنا ان کا تصفیہ و جلا کرنا جو بغیر ریاضت و

مجاہدہ کے نہیں ہوا۔ جسے قرآن کی زبان میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

اسوۂ حسنہ

چوتھے تاشی۔ یعنی طالبوں کے عمل کے لئے نمونے دکھلا کر اسوۂ حسنہ قائم کرنا تاکہ دنیا انہی اوضاع و اطوار پر چل کر زندگی کی منزل مقصود تک پہنچ جائے اور اُسے عملی نمونے خود اختراع کرنے کی نوبت نہ آئے کہ من گھڑت اور اپنے نام تمام نمونوں پر چل کر دنیا حد کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ بجائے کمال کے نقصان اور گھاٹے کا شکار ہو کر رہتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں حکمت کہا گیا ہے۔ یہی وہ چار فرائض نبوت ہیں۔ جن کو قرآن کریم نے بعثت نبویؐ کی غرض و غایت ٹھہرایا ہے اور فرمایا:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان
رُسُلًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ	ہی سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا	ہیں اور ان کو کتاب اور دانش مندی سکھلا
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ	ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں

تھے۔

بنا بریں جس طرح توحید، تنویر، تاثیر اور تاشی سے آفتاب مادی کی غرض و غایت پوری ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی تلاوت، تعلیم، تزکیہ اور اسوۂ حسنہ سے آفتاب روحانی کی بعثت کی غرض و غایت بھی پوری ہو جاتی ہے اور جب کہ مادی آفتاب میں چاروں مقامات قانون تکوین کی ایک عظیم الشان آیت میں جو شبیہ اور نظیر ہیں۔ مذکورہ چاروں روحانی مقامات کے تو نبوت کے یہ چاروں مقامات "سراج منیر" کی تشبیہ کے نیچے آکر اس آیت کے مدلول اور مصداق بن جاتے ہیں۔ یعنی اس تشبیہ کے راستہ سے نبوت کے یہ چاروں فرائض اور سیرت نبویؐ کے یہ بنیادی ارکان اس لفظ سراج منیر سے قرآن سے ثابت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس تشبیہ کے سلسلہ میں ہم نے ان چار امور کو دوسری تشبیہات

پر مقدم رکھا ہے کہ یہ آفتاب نبوت کے وجود کی بنیادی عرض و غایت اور اس کے ظہور کے اولین مقاصد ہیں۔

آفتاب نبوت سے استفادہ کے مراتب

پھر آفتاب ہی کی اس تمثیل سے آفتاب نبوت کی تاثیر و تربیت اور تعلیم و تہذیب سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات و مراتب بھی کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے۔ یعنی جو اس سے قریب تر ہے۔ وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر تر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

درجہ صحابیت

مثلاً طلوع آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقتہ اپنی فضا سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلا واسطہ حاضر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے نور و حرارت کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔ بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا۔ اس میں سے آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ گویا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فانی ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا نور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلا واسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضا اپنی بے حدود وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ وہ طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ جو بلا واسطہ

اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحابہ کرام کا طبقہ ہے جو فضا کی مانند ہے۔ کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمان نبوت سے فروتر ہے۔ وہ فضا کی طرح خلقی طور پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھلا دینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے۔ ان کا علم گہرا تھا۔ ان میں تکلف نہ تھے۔ انہیں امامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا گیا تھا۔ ان کا نقشِ تداً واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کے لئے عطا ہوئی تھی۔ پس وہ فطری شفاف اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلا واسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتاب نبوت کا نور و اثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سرتاپا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی۔ بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہ اپنی فطری قابلیتوں کی بنا پر اس درجہ پاک قلوب عین العلم، قلیل الکلف اور بے غل و غش بنا دیئے گئے تھے کہ گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔ اسی لئے حضور نے ان کے عقیدہ و عمل کو اپنے عقیدہ و عمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق فرمایا اور اعلان فرمایا کہ سنن نبوت اور سنن صحابہ ایک ہی ہیں، جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ کی دینی خصوصیات خصوصیات نبوی تھیں۔ چنانچہ امت کے بہتر فرقوں کے بارے میں جب حضور سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا۔ ما انا علیہ الیوم و اصحابی، جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ میں۔

گویا اپنے عقیدہ و عمل کے سامتھان کے عقیدہ و عمل کو اس طرح ملا کر بتلایا کہ انکے عقیدہ و عمل اور حضور کے عقیدہ و عمل کی نوعیت ایک ثابت ہو گئی اور فرقوں کے حق و باطل ہونے کا معیار آپ نے خود اپنی ذات بابرکات اور حضرات صحابہ کو ٹھہرا دیا۔

صحابت بالاتر از تنقید

پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کا جو طبقہ روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب و شتم یا گستاخی یا سود ادب یا جسارت و بے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپاکی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاء شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

میر حال حضرات صحابہ فضا قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے۔ وہ آفتاب نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلا واسطہ اس سے ملحق بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتاب نبوت کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

پس صحابہ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر سے اقرب تر اور اشد تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شفاعتوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیزمتوں کی زندگی اور اولوالعزما نہ زندگی ہے کہ جائزات کی آرٹ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ کو اپنا لیا جائے اور نفس کی راحت طلبوں کو خیر باد کہہ کر علی مجاہدہ و ریاضت ہی کو زندگی بنا لیا جائے۔ بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے۔ جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبوی بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی و داعی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ

کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر نہیں گئے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو۔ طبقہ صحابہ کے سوا دوسرا نہیں۔ جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنا لیا۔ طبعی مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطنِ طبیعت سے ہجرت کر کے موطنِ شریعت میں آکر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی جلد جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزمِ صادق کے ساتھ ہمہ وقت مرضیاتِ الہی اور مننِ نبوی کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنا لیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیتہً تارکِ دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی۔ دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال و دھن و دولت و حکومت و سیاست، گھر بار، زمین جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادلئے حقوق میں بے لاگ بھی۔ یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی۔ درویشِ کامل بھی ہیں اور قبلاً شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔

یوں ہم کس نے کئے ساعز و سداں دونوں؟

انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی، نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں۔ نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک اپنی ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حد و دسے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان کامل فرما کر اس کے مقدم و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال، قومی عقائد، احوال، اقوال سب میں یہ کامل اعتدال رچا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا۔ سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاء میں ہوتا ہے اور بالعرض بحیثیت طبقہ ان کے صحابہ میں ان کے

بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔ پس صحابہ درحقیقت نبوت کا ظل کامل تھے۔ جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالات نبوت پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسول کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کا طبقہ ہے جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور۔

رضی اللہ عنہم ورضوانہ
 الشان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی
 کی دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیام قیامت ثبت کر دی گئی کہیں
 اولئک الذین امتحن اللہ قلوبہم یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ
 للتقویٰ لہم مغفرۃ واجرٌ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے۔
 ان لوگوں کے لئے مغفرت و اجر عظیم ہے۔

کے ذریعہ ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی اور کہیں اولئک ہم اللہ شدون
 فضلاً من اللہ ونعمۃ اور کہیں والذین معہ اشدُّ علی الکفارِ مَرَحَمًا
 بینہم تراءمہم کفراً سجداً پُراکران کے اخلاق کی برتری ثابت
 کی گئی اور کہیں اصحابی کا نجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم، فراکران میں کے ہر ہر فرد
 کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصول ہدایت میں ادنیٰ کٹکا
 نہ ہو۔

طبقات مابعد ائمہ و اسخین فی العلم

فضا سے گزر کر شعاعیں جب نیچے اترتی ہیں تو زمین کے کھلے میدانوں پر پڑتی
 ہیں اور وہ اس درجہ اس کے نور حرارت کو جذب کرتے ہیں کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں ہی
 نور سے منور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کھلا میدان اپنے کو کلینتہ آفتاب کے سامنے پیش کر دیتا
 ہے۔ گویا کل کا کل آفتاب کی محاذات میں آجاتا ہے اور درمیان میں کوئی رکاوٹ و رودیوار
 وغیرہ کی حامل نہیں ہونے دتا کہ نور کسی گوشہ سے بھی ان میں آتا ہو اور ک جائے۔ یہ درجہ

ائمہ مجتہدین علمائے راسخین سے فقہائے ستقین اور ارباب معرفت مجاہدین یعنی اولیائے کاملین کی زندگی کا ہے۔ جنہوں نے کھلے ہوئے صاف میدانوں کی طرح اپنے کھلے دل سے آفتاب نبوت کی دھوپ کے لئے پیش کر دیا ہے اور فضا سے چھتا ہوا نور انہوں نے اپنے ظاہر و باطن میں سمو لیا ہے۔ ان میں دریا کی سی تاریک گہرائی، مکاٹوں کا سا ظلماتی اندرون پہاڑوں کا سا کثیف اور ٹھوس دل نہیں ہے۔ جس میں شعاعیں نہ پہنچ سکیں اور گہرائی کا حصہ قبول نور سے رہ جائے۔ اس لئے فضائی نور ان میدانوں کے اندر اور باہر سما جاتا ہے کہ جو ان کا اندر ہے۔ وہی ان کا باہر بھی ہے۔ کھلے میدان کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی جہت سے بھی بند یا آرٹ میں نہ ہو۔ پس جو اس کا ظاہر ہے۔ وہی اس کا باطن بھی ہے اس لئے ان کا ظاہر و باطن دونوں منور ہو جاتے ہیں۔ فضا اور کھلے میدان میں فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ میدان فضا کی طرح اپنی خصوصیات دکھلائے بغیر محض آفتاب ہی آفتاب نہیں دکھلاتا۔ بلکہ خود اپنی خصوصیات بھی کچھ نہ کچھ نمایاں کرتا ہے اگرچہ وہ خصوصیات نورانی اور رنگ سنت ہی میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ پس یہ نور پہلے نور سے ہلکا ہے۔ مگر مابعد کے لوگوں کے نور سے تیز ہے۔ یہ ظاہر و باطن میں فانی فی الشہیں۔ علم نبوت ہی ان کا اڈرھنا اور بچھونا ہو جاتا ہے اور وہ ہمہ وقت ذکر و فکر میں مستغرق رہتے ہیں۔ ان میں ماسوا اللہ سوخت ہو کر زائل ہو جاتا ہے اور کسی ماسوا سے ان میں خوف و طمع باقی نہیں رہتا بلکہ وہ خوف و خشیت خداوندی میں ہمہ وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

يَا دِرْكُوهَا اللّٰهَ كَے دَرَسْتُوں پَر نہ كوئی اَنْدیشہ	اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ
ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں۔ وہ وہ	عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ
میں جو ایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں۔ ان	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاٰمَنُوْنَ
کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں	لَهُمْ اَلْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
بھی خوشخبری ہے۔	وَفِى الْاٰخِرَةِ ۝

تیسرے درجے میں پہاڑ اور دریا وغیرہ متاثر ہوتے ہیں۔ جن کی سطح بلند ہے اور آفتاب کی طرف مائل۔ مگر وہ کل کے کل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کا کوئی ایک رخ اثر لیتا

ہے جو آفتاب کی سمت میں آیا ہوا ہو۔ اگر طلوع کا وقت ہے تو شرقی سمت روشن اور گرم ہو جاتی ہے۔ غربی نہیں ہوتی اور غروب کا وقت ہے تو غربی سمت منور ہو جاتی ہے مگر شرقی سمت تاریک ہی رہتی ہے۔ الایہ کہ آفتاب نصف النہار پر آگراپنی پوری سمت سے ان پر پورا نور ڈالے تو وہ ایک لمحہ کے لئے پورے پورے منور ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ تنور دیر پا نہیں ہوتا۔ استواء کی ساعت گزارتے ہی ان کا یہ کامل تنور گھٹنے لگتا ہے اور آخر کار ایک سمت مثلاً غربی جانب میں باقی رہ جاتا ہے۔ تاہم ان پہاڑوں پر دن بھر میں کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی کہ ان کی کوئی نہ کوئی سمت روشن نہ ہو اور وہ نور سے خالی رہ جائیں مگر حالے بہ حالے منقلب ہوتے رہتے ہیں۔

علماء و اتقیاء

یہ شمال عام علماء و صلحا اور اتقیاء کی زندگی کی ہے۔ جو پہاڑوں اور ٹیلوں کی مانند ہیں کہ وہ آفتاب کی سمت ابھرے ہوئے بھی ہیں اور ساتھ ہی کسی نہ کسی سمت سے آفتاب سے روشن بھی رہتے ہیں۔ نیز نور کامل کی ان پر کلیتہً چھا جانے کی کیفیت بھی کبھی کبھی آجاتی ہے جیسے استواء کے وقت پہاڑوں پر آفتابی نور ہر طرف سے پڑ جاتا ہے۔ لیکن وہ ہمہ وقت اس کیفیت کا تحمل نہیں کر سکتے کہ فانی محض ہو جائیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی سمت اور کسی نہ کسی کیفیت و حال کے لحاظ سے ہر وقت روشن رہتے ہیں۔ ان پر کوئی ساعت ایسی نہیں آتی کہ وہ نور سے یکسر خالی ہو جائیں۔ جو پہاڑوں کی کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی کوئی سمت روشن ہوتی ہے اور کبھی کوئی سمت گویا آفتاب نبوت کا نور ان کے وجود پر گھومتا رہتا ہے مگر یک جہتی طور پر کل جہتی انداز سے نہیں۔ پس وہ مجموعی طور پر تو ہمہ وقت منور ہی رہتے ہیں لیکن ہر جہتی طور پر نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان میں بشری ظلمت کی پرچھائیاں بھی پڑتی رہتی ہیں۔ جب کہ اس حیثیت میں شعاع نبوت اوٹ میں آجاتی ہے۔ گویا حالت مغلوب اور گمبہ ہو۔ گویا لوگ گھروں سے باہر نکل کر آفتاب کی دھوپ میں تو آ بیٹھتے ہیں۔ جن کے کسی نہ کسی سمت سے نور پڑتا رہتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ہر وقت نور میں رہتے ہیں۔ مگر وہ

شعاعوں کو دیکھتے رہنے کی قوت نہیں پاسکے کہ ہر اسو اجل کر خاکستر ہو جائے اور وہ ہر وقت فانی فی اللہ اور خشیت اللہ میں مستغرق ہو کر باقی باللہ ہو جائیں تاہم ہر وقت دھوا میں رہنے کے سبب اپنی غالب زندگی کے لحاظ سے وہ بھی نور ہی میں داخل رہتے ہیں اور اچانا اگر ظلمات نفس ان کے قدم کو کسی وقت پھلا دیں تو ان کا تقویٰ و طہارت انہیں فوراً بیدار کر دیتا اور وہ فوراً اونگھ سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

ان الذین اتقوا اذا مسَّهُمْ
 طائفٌ من الشیطان تذکُّرًا
 یأذوا هم مبصرون
 یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں۔ جب ان کو کوئی
 خطر شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ
 یاد میں لگ جاتے ہیں۔ سو یکایک ان کی
 آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

عوامِ صالحاء

چوتھا درجہ بناؤں اور مکانوں کا ہے کہ ان میں بھی آفتاب کا نور آتا ہے مگر صرف اوپر سے ہی دھوپ پڑتی ہے۔ کوٹھے کے اندر دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ تاہم مکان کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رہیں تو چاندنا اندر ضرور پہنچ جاتا ہے۔ الایہ کہ کسی وقت بارش یا ہوا کی شدت وغیرہ کی وجہ سے مکانوں کے دروازے بند کر لئے جائیں تو چاند نے میں بھی نمایاں کمی آ جاتی ہے۔ یہ مثال عوامِ مسلمین کی زندگی کی ہے کہ آفتاب نبوت کے سامنے وہ مثل مکانوں کے ہیں جن کے اوپر دھوپ اور اندر صرف چاندنا پہنچ رہا ہے۔ گویا انہوں نے گھروں سے نکل کر دھوپ میں آ بیٹھنا تو گوارا نہیں کیا اور شہوات نفس کے اندھیرے مکانوں میں بند اور مجوس پڑے ہوئے ہیں۔ مگر مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں کیں۔ دلوں کے دروازے کھلے چھوڑ دیئے جن میں سے نور نبوت کا کچھ نہ کچھ چاندنا ان کے اندر ضرور پہنچ گیا۔ پس اگر وہ نور نبوت کی ہر وقت کی دید و شنید میں مشغول نہیں ہوتے تو کم از کم آفتاب نبوت کی چمک دمک سے محروم بھی نہیں ہوتے جس سے ان میں طبعی ظلمات کے ساتھ کچھ ایمانی نورانیت بھی سراپت کر گئی اور اس لئے

جب وہ اس چاند نے کی طرف دیکھ لیتے ہیں تو صلاح و فلاح اور ہدایت کی طرف اُٹکتے ہیں اور جب طبعی ظلمت کی طرف رُخ کر لیتے ہیں تو معاصی اور سیئات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے توبہ کی توقع اور اس کی امید قائم رہتی ہے۔

وَآخِرُ دِنٍ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ
 خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخِرًا
 سَيِّئًا عَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ
 عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ

اور جو کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقرر ہو گئے۔ جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ بُرے۔ اللہ سے امید ہے کہ ان پر کچھ توجہ فرمائیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

کفار و منافقین

پانچواں درجہ آفتاب سے بعید تر حصوں کا ہے۔ جن کی سطح پر تو دھوپ پڑ جاتی ہے۔ مگر اندرونی گہرائی میں کوئی روشنی نہیں پہنچتی کہ سیاہ و سفید کا کوئی امتیاز پیدا کر سکے، اس کے حق میں رات اور دن برابر رہتا ہے۔ یہ حصہ سمندروں کی گہرائی کا ہے جس میں اوپر کافی چمک مگر اندر اندھیرا ہے۔ یہ مثال منافقوں کی زندگی کی ہے جنہوں نے نور ایمان کو سطح پر تو لے لیا ہے۔ مگر اندروں کو بند رکھ کر ظلماتی محض چھوڑ دیا ہے اور چھٹا درجہ اس سے بھی زیادہ ظلماتی اور تاریک تر ہے اور وہ تہِ خاک تہِ خالوں کا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن دونوں ہی روشنی سے محروم رہتا ہے۔ نہ دھوپ قبول کرتا ہے نہ چمک گویا وہ زبان حال سے اعلان کرتے ہیں کہ نہ ہم روشنی قبول کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔ گویا ہماری ساخت ہی اس لئے نہیں کہ ہم نورانی بنیں۔ یہ مثال کفار و معاندین حق کی ہے۔ جنہوں نے نہ آفتابِ نبوت کی کرنوں کو آنکھوں میں لیا نہ دھوپ کی سطح پر لیا اور نہ ہی اس کی چمک کو دل کے کسی حصہ میں آنے دیا۔ یعنی دلوں کے دروازے بھی سب بند کر لئے کہ اندر چمک تک نہ آسکے۔

إِنَّ عَلَىٰ قُلُوبِ أَقْفَالُهَا
 يَا اِنَّ كَيْ دِلُوں پَر قفل لگ رہے ہیں۔

اوپر سے آنکھیں بھی بند کر لیں کہ کسی بھی سوراخ سے نورِ نبوت کی کوئی شعاع اندر نہ پہنچ جائے۔

وَلَهُمَا عَيْنٌ لَا يَبْصُرُونَ بِهَا
اور ان کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے۔

اسی کے ساتھ آنکھوں پر پٹی بھی چڑھائی کہ دیکھنے کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔
وَعَلَىٰ الْبَصَارِ هُمُ غِشَاوَةٌ
اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔
اور اوپر سے اوندھے منہ بھی لیٹ گئے کہ نگاہوں میں روشنی آنے کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے۔

سوکیا جو شخص منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ
مَنْ يَمْشِي مُكَبِّئًا عَلَىٰ وَجْهِهِ
منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا۔ یا وہ
أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا
شخص جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو۔
عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

اور ساتھ ہی پختہ عزم بھی باندھ لیا کہ کچھ بھی ہو، اس حق کو قبول کرنا نہیں۔
بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ
بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب
وَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝
پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے۔ سو
ان میں ایمان نہیں، مگر قدرے قلیل۔

عرض کسی درجہ میں بھی انہوں نے آفتابِ نبوت کی چمک دمک سے استفادہ گوارا نہ کیا۔ بلکہ اس سے نفرت و عداوت کا مظاہرہ کیا۔ جس سے وہ کسی درجہ میں بھی روحانی روشنی اور رضائے الہی کی تابانی نہ پاسکے۔

پس جیسے مادی اشیاء آفتاب سے محروم ہو جانے پر اپنی صحت و توانائی اور مادی زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتیں، ایسے ہی روحانیت طلبی کے دائرہ میں یہ ظلماتی انسان بھی آفتابِ نبوت سے محروم ہو کر اپنی روحانی صحت و توانائی ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے اور ابدی ہلاکت کے مور دہن گئے۔ کیونکہ جیسے مادی زندگی کا ضامن مادی آفتاب ہے، ایسے ہی روحانی زندگی

کامنت داریہ روحانی آفتاب ہے۔

میر حال سراج منیر کی اس تمثیل سے آفتاب نبوت کے افادہ اور اس سے امت کے استفادہ کے مراتب ششگانه بھی کھل گئے اور مستفیدوں کے درجات کا ایک اجالی نقشہ سامنے آگیا کہ طبع طور پر انسانوں میں بلحاظ قرب و بعد آفتاب یہی چھ مراتب نکل سکتے ہیں، بعض طبقات آفتاب نبوت کی تعلیم و تربیت سے ہر جہتی حیثیت سے منور ہو کر نور مجسم اور منظر آفتاب بن گئے۔ جیسے صحابہ کرام بعض نے ظاہر و باطن دونوں کو یکسانی کے ساتھ منور کیا اور منظر نور آفتاب بن گئے۔ جیسے ائمہ اور اسخین فی العلم، بعض کے باطن نے زیادہ اثر لیا۔ مگر ظاہر زیادہ نہ چمک سکا اور وہ منظر ضیاء آفتاب بن گئے جیسے ارباب علم و معرفت، بعض کے باطن نے اثر کم لیا۔ مگر ظاہر زیادہ روشن ہو کر نمایاں ہوا اور وہ آفتاب کی ظاہری چمک دمک کا مظہر بن گئے۔ جیسے عوام مومنین اور بعض نے باطن کو یکسر بند کر کے محض ظاہر کو صورت چمک سے آراستہ دکھلانے کی کوشش کی اور وہ منافقین ہیں۔ بعض ظاہر و باطن دونوں کے لحاظ سے محروم اور تاریک رہے اور انہیں منظریت کی کوئی نسبت بھی حاصل نہ ہوئی، جیسے کفار و منکرین میر حال اس تمثیل سے اہل حق اور اہل باطل اور پھر اہل حق میں قبول حق کے درجات کی تفصیل سامنے آجاتی ہے جو آفتاب نبوت، تعلیم و تربیت اور ترکیب و تاسی سے امت میں پیدا ہوئے۔

خوارق و معجزات

پھر جس طرح آفتاب کی ایک تو روزانہ کی مقررہ عادی شان ہے کہ وہ عادت عامہ کے مطابق طلوع ہو کر دنیا کو اپنی تنویر و تاثیر سے روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے، ہر کس دنیا کس کو ملتی ہے اور اس کی فیض رسانی سے ہر ایک درجہ بدرجہ مستفید ہوتا اور اسے جانتا پہچانتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی ایک غیر معمولی اور غیر عادی شان بھی ہے کہ اس کی اسی روشنی اور گرمی سے جب کہ وہ سمٹ کر کسی چیز پر پڑے، عادت کے خلاف بھی کبھی کچھ آثار نمایاں ہوتے ہیں جس سے اس کی خاص قوتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً اسکی

عام عادت محض اجالا کرنا اور اشیاء کو تپا دینا ہے۔ جلانا اور آگ لگانا نہیں کہیں اگر آتشی شیشہ کے ذریعہ اس کی حرارت کو سمیٹ کر کسی چیز پر ڈالا جائے تو وہ کپڑے اور کاغذ وغیرہ میں آگ بھی لگا دیتا ہے یا جیسے آج کے بعض سائنس دانوں نے اس کی شعاعوں سے ایک خاص درجہ حرارت جذب کر کے ایک ایسا چولہا ایجاد کر لیا ہے کہ اس پر محض سورج کی شعاعوں سے کھانا پکایا جاسکتا ہے یا جیسا کہ روسیوں نے سورج کی شعاعوں سے ایک ایسا بم ایجاد کر لیا ہے کہ اُسے روانہ کر دیا جائے تو وہ خود ہی مقام متعینہ پہنچ جاتا ہے۔ اور مقررہ ساعتوں میں خود جل جاتا ہے اور لاکھوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ سورج کا عام متناہ کام آگ لگانا اور مخلوق کو تباہ کرنا وغیرہ نہ تھا۔ لیکن وہ خاص محرکات سے اپنی طاقتوں کو جب خاص طریقوں سے سمیٹ کر نمایاں کرتا ہے تو اس سے تعمیری اور تخریبی دونوں قسم کے کام اعجازی طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کھانا بھی پکا دیا جو تعمیری انداز ہے اور کپڑے، کاغذ اور آدمیوں کو جلا کر خاک سیاہ بھی کر دیا جو تخریبی رنگ ہے یا مثلاً یوشع ابن نون علیہ السلام کے لئے باذن خداوندی آفتاب کا روک دیا جانا کہ اس نے اپنی متناہ حرکت چھوڑ کر قیام اختیار کر لیا تو دن وپن کا وہیں ٹھہر رہا اور مغرب نہ ہوئی۔ جب تک حضرت یوشع نے جنگ کو فتح نہ کر لیا یا جیسے قرب قیامت میں بلا کسی کی تحریک و دعا، از خود باصر خداوندی آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع کرنا یا نصف النہار پر پہنچ کر مغرب ہی کی طرف لوٹ کر غروب ہو جانا یا وصال کے خروج کے وقت چالیس دن کے برابر ایک دن کا ہونا۔ گویا چالیس دن کے اندازہ کی برابر سورج کا اپنی حرکت سے رکا رہنا جس سے ایک دن چالیس دن کے برابر ہو جائے گا۔ وغیرہ وہ خاص افعال ہیں جو اس کی حرکت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے کم یا زیادہ ہونے سے پورے عالم کی زمانی مسافت گھٹ بڑھ گئی اور انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب امور عادت نہیں، حرق عادت ہیں۔ جو عالم کی تربیت میں موثر ہیں۔ ان سے یا تو کسی قوم پر اتمام حجت مقصود ہوتا ہے یا کسی قوم کی تقویت ایمان ملحوظ ہوتی ہے۔ بہر حال آفتاب مادی کے حق میں۔ یہ امور حرق عادت ہیں جو خاص خاص اوقات میں خاص مقاصد کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح روحانی آفتاب کی بھی ایک عام اور معتاد چال ہے جس سے اقوام عالم کو اپنے اپنے وقت پر علم الہی اور اخلاق ربانی کی روشنی اور گرمی ملتی رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی عادت عامہ کے خلاف خرق عادت کے طور پر یہی علمی اور اخلاقی قوتیں علو باطنی سے کسی ایک نقطہ پر سمٹ کر نمایاں ہوتی ہیں تو ایسے عجائبات عالم کا ظہور ہوتا ہے جو بشری طاقت سے خارج ہوتے ہیں تاکہ اس کی نبوت کی کھلی دلیل دنیا دیکھ لے، لیکن یہ سب کچھ وہی علم و اخلاق کی طاقت ہوتی ہے جسے اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کے عرش بلقیس اٹھواٹھ گانے کے واقعہ میں علم کی اس طاقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے جس سے اسے علم الہی کی قوتوں کا کرشمہ کہا جائے گا۔ گو ظہور اس کا پیغمبر کے ہاتھ پر ہو۔ فرمایا گیا:-

قال الذی عندہ علم من
الکتاب انا اتیک بہ قبل
ان یرتد ایلک طر فک
جس کے پاس کتاب کا علم تھا اور وہ
اغلباً خود سلیمان علیہ السلام ہیں) اس نے
کہا کہ میں اس (تخت) کو تیرے سامنے
تیرمی آنکھ پھینکنے سے پہلے لا کر کھڑا کر

سکتا ہوں۔

بہر حال علم کی قوت یا اس علم میں سمائے ہوئے اسمائے الہی کی قوت کی تاثیر سے پیغمبر کے ہاتھوں پر غیر معمولی رموز نمایاں ہوتے ہیں جنہیں معجزہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ عالم کو اپنا مثل لانے سے عاجز کر دیتے ہیں۔

پس آفتاب نبوت کی ایک روشنی اور گرمی تو وہ ہے جو عادتاً اس کے علم و اخلاق سے چھن چھن کر مخلوق پر برستی رہتی ہے۔ کہیں کبھی خرق عادت کے طور پر یہی قوت غیر معمولی انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ کبھی تعمیری صورت سے اور کبھی تخریبی رنگ سے جیسے غزوہ خندق کے موقع پر دو روٹیوں کے ٹکڑے سینکڑوں انسانوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہو گئے کہ یہ تعمیری صورت تھی اور غزوہ بدر کے موقع پر چند لنگروں سے جو پیغمبر نے اٹھا کر پھینک دیں۔ سینکڑوں کفار کے دماغ پاش پاش ہو گئے کہ یہ تخریبی

صورت تھی یا ایک طرف توفیح بغداد کے موقعہ پر حضرات صحابہ کے گھوڑے دریائے
 وجلہ کے ماتھی ڈبان پانی میں کشتیوں سے بھی زیادہ تیز دوڑ پڑے تاکہ ایمان والوں
 کو فتح مبین نصیب ہو کہ یہ کرامت صحابہ بھی بالواسطہ پیغمبری کا معجزہ تھی اور دوسری طرف
 ہجرت کی روپوشی پر سراقہ بن مالک کا گھوڑا سخت زمین پر بھی نہ چل سکا اور اس کے
 پیر زمین نے پکڑ لئے تاکہ کفار پیغمبری کی سزا عجز سانی نہ کر سکیں۔ ایک تعمیر کی صورت تھی اور
 ایک تخریب کی۔ مگر اللہ کے ان دونوں قسم کے افعال کا مورد جس سے خدائی کام نمایاں ہوئے
 وہی علمی اور اخلاقی یعنی روحانی قوت تھی جو پیغمبر کے اندر سے ہو کر گزرتی اور اس نے خرق
 عادت کی صورت اختیار کر لی۔ پس جیسے مادی آفتاب میں عادت اور خرق عادت دونوں
 قسم کے افعال موجود ہیں، ایسے ہی روحانی آفتاب میں بھی عادت اور خرق عادت دونوں
 قسم کے افعال موجود ہیں، جو اپنے اپنے موقعہ پر صادر ہوئے، فرق اتنا ہے کہ مادی آفتاب
 کے خوارق میں براہ راست خدائی ارادہ کام کرتا ہے، خود آفتاب کے ارادہ یا ہمت کو
 دخل نہیں اور روحانی آفتاب کے خوارق میں ارادہ خداوندی بذیل ہمت نبوی ہی نمایاں
 ہوتا ہے، اس لئے یہ معجزات نبی کی طرف منسوب ہوتے ہیں، بہر حال سراج منیر کی
 تمثیل سے جیسے آفتاب نبوت کے عادی افعال تعلیم و تربیت وغیرہ واضح ہوئے
 تھے، ویسے ہی خوارق اور معجزات کا ثبوت بھی ملا، جو اس آیت (آیت عنوان و سراج منیر
 کا مدلول ثابت ہوگا۔

دلیل آفتاب نبوت کی واقعیت و صداقت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے عام ستاروں کے طلوع و غروب کا کوئی عمومی
 علم نہیں ہوتا، بلکہ فن بیست کی فنی دلیلوں اور خارجی وجوہ سے معلوم کرتے ہیں کہ کون سے
 ستاروں کے طلوع کا کون سا وقت ہے، اور وہ کتنے زمانے میں اپنا دورہ پورا کرتا
 ہے، کب طلوع ہوا اور کب غروب ہوا، بلکہ طلوع ہو جانے پر بھی اس کے طلوع کا متعین
 علم نہ ہونے کے سبب خود وہ اپنے علوم کی دلیل نہیں بنتا، جب تک کہ فن نجوم کے

قواعد سے مدد نہ لی جائے۔ خود ان ستاروں کی چال سے یہ سب باتیں محسوس نہیں کی جاسکتیں۔ بخلاف آفتاب کے کہ اس کے طلوع کا ہی عام علم ہوتا ہے۔ بلکہ پہلے سے رہتا ہے اور اس آثار طلوع خود اس کا پتہ دیتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے طلوع ہو جانے کے بعد اس پر یقین لانے کے لئے کسی بیرونی اور خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صر

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید از دے رومتاب
 کا قصہ ہوتا ہے کہ اس کا طلوع وغروب حسی ہے۔ جس کے لئے صرف آنکھ کی ضرورت ہے۔ قواعد فن کی ضرورت نہیں وہ ایک حسی اور بدیہی چیز ہے۔ پھر اسکی روشنی اور گرمی جو بدنوں نے اندر سمائی ہوئی ہے اور اس کا باجبردت روشن چہرہ جو امتیاز کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ خود اس کے وجود کی ایک مستقل دلیل ہوتا ہے۔ باہر سے کسی فنی دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ورنہ دنیا کے عوام اور بکثرت خواص میں کون فن ہیئت سے واقف ہے۔ مگر آفتاب سے سب واقف ہیں۔ ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت یعنی انبیاء علیہم السلام کے ظہور ان کے علوم و کمالات اور ان کی خدمات کا علم کسی کو بھی بدابہتہ نہیں بلکہ فن تاریخ پر یا دلائل عقلیہ سمعیہ سے پرکھنے پر موقوف ہے۔ غرض براہ راست انبیاء کی سیرتوں اور ان کی لائی ہوئی روشنیوں کا براہ راست کسی کو علم نہیں بخلاف آفتاب نبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی لائی ہوئی صداقت کے لئے کسی خارجی یا منطقیانہ اور فلسفیانہ دلیل کی حاجت نہیں۔ اس کے پھیلے ہوئے علم کی روشنی اور اس کی اخلاقی اور عملی سیرت کی گرمی اور تاثیر جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اقوام عالم کی روحوں کے اندر اثر می ہوتی اور ان پر چھانی ہوئی ہے۔ خود اس کے وجود کی شاہد عدل ہے۔ نیز اس کا مثالی چہرہ جو پاک زندگی کی صورت میں ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کی صداقت کے لئے کافی دلیل ہے۔

گر دلیلت باید از دے رومتاب

کیونکہ اخلاق و عمل کا وہ کردار جو خاتم النبیین سے ظہور پذیر ہوا اور عمیق ترین علوم

سے نکلے ہوئے وہ جامع مقاصد انسانیت جو ختم المرسلین سے وجود پذیر ہوئے، انہ
انگلوں میں نظر آتے ہیں نہ پھلوں میں، جس کی وجہ یہی ہے کہ آگے اور پیچھے آفتاب کے سوا
کوئی دوسرا آفتاب ہی نہیں کہ ایسی روشنی اور گرمی اور ایسا تاباں چہرہ کسی اور کا ہو۔ ایسے
صداقت کے ثبوت کے لئے یہی روشنی و گرمی اور اس کی مثالی سیرت کافی ہے۔ جو ہر
کچے کچے گھرانے میں پہنچ رہی ہے۔ خواہ بطور رغبت خواہ بجزوری۔ بعض عزیز و
ذیل ذیل:

چنانچہ وہ اعترافات اور بیانات جو دنیا کی اقوام کے ذمہ داروں نے آپ کی
صداقت کے سلسلہ میں دیئے ہیں، درانحالیکہ انہوں نے آپ کا اتباع نہیں کیا۔ اس کا بین
ثبوت ہیں، گویا آپ کی امتیازی فضیلت و بزرگی کے اعتراف سے اغیار بلکہ مخالفین کو بھی
چارہ کار نہ رہا۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابو جہل ہی تھا۔ (جسے فرعون امت کا لقب ملا
ہوا ہے) گھر میں بیٹھ کر آپ کی سچائی کا قائل تھا اور سارے ہی مشرکین عرب باوجود شدید
عداوت کے آپ کو صادق اور امین کہتے تھے اور دعویٰ نبوت کے بعد بھی یہ اعتراف ان
کے دلوں سے نہیں نکلا تھا مگر حَسَدًا مِنْ عِنْدِ انْفُسِهِمْ: زبانوں پر انکار اور جھوٹا گیا
تھا۔ اس لئے باوجود انکار کے بھی وہ معترف ہی کہے جائیں گے۔ ایسے قرآن کریم نے
ان کے استفہام اقراری کے لہجے میں فرمایا۔

أَمْ لَوْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ
لَهُ مُنْكَرُونَ
کیا لوگ اپنے رسول کو پہچانتے نہیں جو
منکر بن رہے ہیں؟ یعنی ضرور پہچانتے
ہیں، گو نفسانی اعزاز و جذبات کی وجہ
سے منکر ہیں۔

اہل کتاب گو عموماً آپ کے پیرو نہ بنے، مگر اپنی کتب سماوی کی خبروں اور آپ
کی دیانت و صداقت کے روشن آثار دیکھ کر آپ کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے
بجیرا رہب جیسے لوگوں کی شہادت حتیٰ کہ نبوت سے قبل آپ کے آثار مقبولیت دیکھ
کر اور علامات سے خاتم النبیین کو پہچان کر ابو طالب کو آپ کی حفاظت پر نصرانی راہبوں کا

آبادہ کرنا اور یہ کہنا کہ انہیں یہود سے محفوظ رکھنا یہاں تک کہ بعد نبوت بعض یہود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کھلے لفظوں میں آپ کی صداقت و نبوت کا اقرار کرتے ہوئے پائے گئے۔ جیسا کہ ترمذی میں صفوان بن عسال کی روایت میں ہے کہ دو یہودیوں نے (جب کہ حضور نے خود انہی کے مذہب کے اصول پر ان کو یوم بہت وغیرہ کے بارہ میں نصیحت فرمائی) آپ کے ہاتھ اور قدم چومے اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ پیغمبر ہیں۔ گو آپ کے تابع نہ بنے۔ نیز عموماً یہود من حیث القوم اس صداقت کو جانتے تھے۔ مگر سرکشی اور مجبور سے انکار کرتے تھے چنانچہ ان کے اعتراف کے بارہ میں قرآن نے فرمایا:-

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَةَ هَامَانَ
وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا
پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو
پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر
واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں، اخفا
کرتے ہیں۔

مگر پھر ان کے مجبور و سرکشی کے بارہ میں بھی فرمایا:-

وَجَدُوا بِهَا دَأْيُهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا الْفُلُجُ
ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۝

اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو
گئے۔ حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا
یقین کر لیا تھا۔

انگلوں ہی پر موقوف نہیں، آج کے متمدن اقوام کے لیڈروں اور ذمہ داروں کے وہ
بیانات جو آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں اور سیرت کے جلسوں میں زبان پر آتے
رہتے ہیں جن میں منہ بھر بھر کر حضور کی امتیازی شانوں کو سراہا جاتا ہے، اس کے شاہد عدل
ہیں کہ آفتاب نبوت کے طلوع کے بعد بھی اعترافات کا سلسلہ قائم ہے۔ سو یہ اعترافات
کسی منطقی دلیل سے ظہور میں نہیں آئے، بلکہ صرف آپ کی سیرت پاک کے پاکیزہ کردار اور
آپ کے مثالی اور معیاری علوم کالات اور اقوام و امم میں پھیلے ہوئے آپ کے اثرات
اور آپ کی بین الاقوامی برکات زبانوں اور ان کے دلوں میں آئے یعنی آفتاب اپنی دلیل

خود ثابت ہوا، غرض اس تشیل سے حضور کے ممتاز کمالات کا اعتراف دوست دشمن اور ہر کس و ناکس کی زبان زد ثابت ہوا جو ستاروں میں آفتاب کی شان تھی۔

ناگزیرٹی اعتراف

اس تشیل (سراج منیر) کو سامنے رکھ کر منکر دل کے اس جبری اعتراف کو یوں سمجھئے کہ جس طرح سورج کی روشنی سے کوئی کتنا ہی بھاگے، وہ خود اس کا پچھا کرتی ہے اور بالآخر لگے لگ کر اور اس میں گھس کر اس سے اپنا اعتراف کرا لیتی ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کے وسیع ترین دائرہ اثر سے باہر نکل کر کسی اور سورج کی عملداری میں نہیں جاسکتا۔

زمان ہو یا مکان جب ہر جگہ سورج ہی کی عملداری ہے تو ان احاطوں سے نکل کر کوئی باہر جابھی کیسے سکتا ہے؟ اسی طرح آفتاب نبوت کی صداقت سے کوئی کتنا ہی بھاگے صداقت خود اس کا پچھا نہیں چھوڑتی، حتیٰ کہ وہ ارادہ و شعور سے نہیں مانتا تو زبردستی اس کا دل مانتا ہے اور یہ صداقت اس کے ضمیر میں گھس کر رہتی ہے، کوئی اندھے سے اندھے کوٹھے میں بھی گھس جائے، روشنی کسی نہ کسی درجہ میں وٹاں بھی پہنچ کر رہتی ہے، پس کوئی تائیک سے تائیک دل انسان بھی آفتاب نبوت کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا، چنانچہ آج بھی اور آج سے پہلے بھی دنیا کی اقوام کی شہادتیں جو انہوں نے پیغمبر اسلام کے بارہ میں دی ہیں اور ان کے قلوب اس کے سامنے جھک رہے ہیں، اس کی شاہد عدل ہیں جیسا کہ اس پر مستقل رسالے اور مقالات لکھے گئے اور مطبوعہ ہو چور ہیں، کیونکہ دورہ محمدی کے بعد جب کہ کوئی اور نبوت اور کوئی پیغام آنے والا نہیں تو لامحالہ اسی ایک پیغام کی روشنی سارے عالم میں پھیل جانی ضروری تھی، چنانچہ آج دنیا کی قوموں میں نہ صرف آپ کی حقانیت کا زبانی بجا اعتراف کیا جا رہا ہے، بلکہ دین اور سیاست دونوں کے لحاظ سے اسلامی ہی اصول عملاً قبول کئے جا رہے ہیں جو برابر پھیلنے اور سرج ہوتے جا رہے ہیں، اس حقیقت کی طرف کلام نبوت میں بایں الفاظ رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

لا یبقی علی ظہر الارض
بیت مدین ولا یراد دخل اللہ
کلمتہ الا سلام بعد عزیز وذل ذلیل
(فیكون الدین کلمہ اللہ)

زمین کی پشت پر کوئی کچا اور پکا گھر ایسا باقی
نہیں رہے گا کہ جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے
کلمہ کو داخل نہ کر دے، عزت والے کی
عزت اور ذلت والے کی ذلت کے باوجود
اور تمام تر دین صرف اللہ ہی کا ہو گا۔

نہیں بلکہ اگر اس عالم کو بھی چھوڑ بھاگے اور دنیا سے گزر کر عالم قبر اور عالم برزخ
میں بھی پہنچ جائے۔ وہاں بھی جس طرح مادی آفتاب کی روشنی اس کا پیچھا کرتی ہے۔ ایسے
ہی روحانی آفتاب کی روشنی بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ دونوں آفتاب ان کی روشنیاں بلکہ ان
دونوں آفتابوں کی صورت مثالی وہاں بھی آنکھوں کے سامنے آکر رہتی ہے کہ وہاں بھی ان سے
اور ان کے کمالات کے اعتراف سے چارہ کار نہیں رہتا۔ چنانچہ تبصریح حدیث نبوی
جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور اس کا دینی امتحان لینے کے لئے ملائکہ برزخ سوال
کرنے آتے ہیں تو اس وقت میت کو یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب
ہے۔ دھوپ پر زردی آچکی ہے اور دن ختم ہونا ہے اور آفتاب مغرب کے قریب
پہنچ چکا ہے تو یہ مرد صالح جو دنیا میں نماز کا خوگر اور دلدادہ تھا، اک دم گھبرا کر ان ملائکہ سے
کہتا ہے کہ دعوتی اصلتی (مٹوجی بکھے چھوڑو، میں نماز پڑھ لوں، وقت نکلا جا رہا ہے)۔
یہ مادی آفتاب کی صورت مثالی ہوتی ہے جو سامنے لے آئی جاتی ہے۔ پس آفتاب کی صورت
اور اس کی حقیقی غرض و غایت نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسی طرح ملائکہ برزخ جب
اس میت سے نبی کریم علیہ السلام کے بارے میں یہ پوچھتے ہیں کہ من هذا الرجل، (یہ کون
شخص ہیں؟) تو شرح حدیث کی شرح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی صورت یا
یعنی صورت لے سے دور سے نظر پڑتی ہے۔ تا آنکہ وہ اپنے ضمیر کی شہادت سے پہچان لیتا ہے
اور پکارا ٹھٹھا ہے کہ یہ تو میرے وہی پیغمبر ہیں۔ جن کی عقیدت و عظمت دنیا میں میرے دل
کی امانت رہی ہے اور فوراً گواہی دیتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ہمارے پاس
ہدایت نامہ خداوندی لے کر آئے۔ تھے۔ البتہ جس نے دنیا میں باوجود ضمیر کی شہادت کے

انکار کی مشق کی اور تعصب و عناد سے خود اپنے ضمیر کو جہالت کی حیرت کا شکار بنائے رکھا جس سے یہ تیج و تجاہل ہی اس کا جوہر نفس بن گیا تو قبر میں بھی نہ آفتاب مادی کی صورت دیکھ کر نماز کی طرف دوڑے گا اور نہ روحانی آفتاب کی مثالی صورت دیکھ کر اسے پہچانے گا بلکہ وہی جہل و تیج کا اظہار کر دے گا کہ ہا ہا ہا ادرسی ہکا بکا ہو کر کہے گا کہ میں تو واقف نہیں کہ یہ کون ہیں؟ مہر حال اس سے واضح ہے کہ عالم برزخ میں جس طرح مادی آفتاب کی صورت مثالی دکھائی جاتی ہے، جس سے عمل و عبادت اور نماز کا امتحان مقصود ہوتا ہے، اسی طرح آفتاب روحانی کی صورت مثالی بھی دکھائی جاتی ہے، جس سے عقیدہ و فکر کا امتحان مقصود ہوتا ہے، غرض حسی صداقت ہو جو مادی سورج میں ہے یا معنوی صداقت ہو، جو روحانی سورج میں ہے، ایک فطرت ہے جو کسی حال آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی خواہ وہ دنیا میں رہے یا عالم آخرت کو سدھار جائے، اب کوئی قبول ہی کا ارادہ نہ کرے تو اس سے صداقت میں فرق نہیں پڑتا۔ پس آفتاب نبوت کی ناگزیری اعتراف اور اس کا اپنی دلیل خود ہونا بھی اسی تشیل سے نمایاں ہو گیا، اس کی ایک بڑھی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے دنیا میں تشریف لا کر تمام انبیائے سابقین کی تصدیق کرانی اور تکذیب کی خوئے بد جو تعصب و عناد سے پیدا ہوتی ہے، مٹا دی، پس کسی بھی نبی کا کوئی پیرو ہو، جب کہ اس کے نبی کی تصدیق اس سے کرائی جائے گی تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اس تصدیق سازی کے قول کی تکذیب کر دے، ورنہ اس سے خود اپنی تکذیب لازم آجائے گی تو کون ہے جو اپنے کو خود جھوٹا کہے، اس لئے بدیں وجہ بھی حضور کی تصدیق اقوام کے لئے ناگزیر ہے کہ آپ سارے انبیاء کے مصدق خود بھی ہیں اور ساری دنیا سے ان کی تصدیق کرنے آئے ہیں، گویا انبیاء سابقین کی بنوتوں کا تحفظ بھی ختم نبوت کا ایک مقبول کام ہے، غور کرو تو ختم نبوت کا یہ مقام بھی اس مادی آفتاب کی تشیل سے واضح ہو جاتا ہے، قرآن نے اپنا لقب مصدق ذکر کیا ہے، مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ، مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ وَعَبْرٌ غَوْرٌ كَرُوْهُمُ حُضُوْرٌ كِ تَصْدِيْقٌ عَامٌ كِ يَ وَجہ بھی اسی سراج منیر کی تشیل سے واضح ہوتی ہے۔

عمومی تصدیق

کیونکہ جیسے طلوع آفتاب کے بعد ستاروں کی روشنیاں مٹ نہیں جاتیں اور نہ ان کی تاثیرات کم ہوتی ہیں، بلکہ باقی رہتی ہیں، مگر سوچ کے نور کی تیزی اور غلبہ کی وجہ سے ان کا وجود الگ سے دکھائی نہیں دیتا وہ نور آفتاب سے کم ہو کر اسی کے ضمن میں ملی جلی رہتی ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اس نور میں کھپی ہوئی موجود ہیں، جو دنیا پر بہ ضمن آفتاب پڑ رہا ہے، گویا آفتاب زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا آتا ہے کہ چونکہ میرے نور میں سب کے انوار مجتمع ہیں، ایسے میں سب کو لے کر آیا ہوں، میرا نور قبول کرنا سب کے انوار کو قبول کرنا ہے، میری تصدیق سب کی تصدیق ہے اور میرا انکار سب کا انکار ہے، اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع کے بعد انبیائے سابقین کے علوم و آثار کو آفتاب نبوت نے مٹا نہیں دیا ہے، بلکہ باقی رکھا ہے، چنانچہ اسی لئے ان کی تصدیق ضروری قرار دی ہے، مگر یہ سب علوم و کمالات آفتاب نبوت کے عظیم نور میں اس حد تک کم ہیں کہ ان کا مستقل وجود الگ سے نہیں نظر آ سکتا، لیکن وہ ختم نہیں ہوئے، دور رس نگاہوں کو ان کے وجود کا علم و یقین حاصل رہتا ہے، اس لئے اس آخری شریعت کے ضمن میں ان سابقہ شریعتوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا، بلکہ اس شریعت پر ایمان لانا ہی ساری شریعتوں کو مان لینا ہے کہ وہ سب کی سب اس جامع الشرائع شریعت میں موجود ہیں، اس لئے جیسے مادی آفتاب ستاروں کی روشنیوں کو جھٹلاتا ہوا نہیں آتا، بلکہ انہیں اپنی ضمن میں لے کر ان کی حفاظت کرتا ہوا آتا ہے اور ان کے وجود کو اپنے ضمن میں زندگی دوام بخشتا ہوا آتا ہے، ایسے ہی آفتاب نبوت نے سابقہ نبوتوں کے علوم کو اپنے اندر کھپا کر انہیں ضائع ہونے سے بچایا ہے، اقوام نے انہیں مسخ کیا، ضائع کیا، لیکن قرآن نے ان کی تصدیق کی، انہیں اپنے اندر جگہ دی، اور اپنی دوامی بقاد کے ساتھ انہیں بھی باقی دوام بنا دیا، اسی لئے ان کی تصدیق ضروری قرار دی اور تکذیب سے باز رکھا اور کھلا اعلان کر دیا کہ میں سب کے علوم لے کر آیا ہوں۔

او تیت علم الاولین والآخرین - میں گلوں اور پھولوں کے علوم عطا کیا گیا ہوں۔
اس لئے میری تصدیق سب کی تصدیق اور میرا انکار سب کا انکار ہے، بلکہ انبیاء سابقین

میں سے کسی ایک کا بھی انکار سب کا انکار ہے۔ کیونکہ اب سب کے انوار مجھ میں مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اس لئے کسی ایک کے ساتھ تصدیق و تکذیب کا معاملہ سب کے ساتھ سمجھا جائے گا۔ بالخصوص جبکہ خود ان انبیائے سابقین کی سابقہ نبوتوں کے صحیفوں میں پہلے سے بھی اس صحیفہ خاتمت (قرآن) کا نور پھیلا ہوا تھا۔

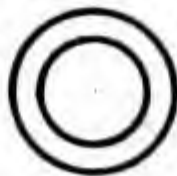
وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأُولَىٰ ، اور اُسکا ذکر پہلی امتوں کی کتابوں میں ہے۔
تو اس حالت میں ان صحف کو جھٹلانا خود اپنے کو جھٹلانا ہے، جس کی کوئی دانشمند جرات نہیں کر سکتا، اس لئے تصدیق عام کا فرمان ان جامع الفاظ میں دیا گیا۔

قولوا منّا باللہ وما أنزل	کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور
إینا وما أنزل الیٰ ابراہیم	اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو حضرت
وإسمعیل واسحق و یعقوب	ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور
والاسباط وما اوتیٰ موسیٰ	حضرت یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف
وعیسیٰ وما اوتیٰ النبیون	بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت
من ربہم لا نفرق بین	عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء کو دیا گیا
احدینہم ونحن لہ	ان کے پروردگار کی طرف سے اسی کیفیت
مسلّمون ۛ	سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق

نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں

میرا حال اس سراجِ منیر کی اس تشیل سے حضور کی حفاظت ادیان سابقہ اور مصدقیتِ علم بھی نمایاں ہو گئی جو ختم نبوت کا (جس کی تشریح آگے آرہی ہے) اساسی اور بنیادی مقام ہے، واللہ اعلم

تمت بالخیر۔ (حصہ اول)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دوامِ ظہور

پھر اسی تشیل سے حضور کے ان مخصوص اوصاف و مقامات پر روشنی پڑتی ہے جو ذاتِ بابرکات کو ممتاز طریق پر عطا ہوئے۔ مثلاً جس طرح سے کہ عام ستاروں کی ہمہ وقت ضرورت نہیں، بلکہ مدتہا مدت بھی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ بعض ستارے سال میں ایک مرتبہ طلوع ہوتے ہیں، گویا سال بھر میں اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ بعضے دس سال میں بعضے سو سال میں، بعضے ہزار سال میں، یعنی ہزاروں برس میں طلوع ہوتے ہیں، جن کے طلوع و غروب کا ہمیں علم بھی نہیں ہوتا، دنیا جانتی بھی نہیں کہ کس ستارے نے کس وقت طلوع کیا اور کب وہ غائب ہو گیا، گویا ان کا ظہور وقتی ہوتا ہے اور اس وقت ہی کی مصلحت سے ہوتا ہے، نہ ہمہ وقت وہ مصلحت درکار ہوتی ہے، نہ ہمہ وقت ان کا ظہور ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہزاروں برس بھی ہماری نگاہوں سے بلکہ خود ہم سے اوجھل رہیں تو ہماری نگاہ اور ہماری اپنی دنیا میں اس سے کوئی نمایاں نقصان نہیں آتا۔ بالفاظِ دیگر عالم ان کا زیادہ محتاج نہیں، لیکن آفتاب کو دیکھو تو بارہ مہینہ موجود اور چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کر کے روزانہ ہمیں زیارت بھی کرتا ہے، نور بھی بختا ہے، گرمی بھی پہنچاتا ہے، اور راستے بھی دکھاتا ہے، پھر اگر وہ رات میں نگاہوں سے اوجھل اور غائب بھی ہوتا ہے، تو صرف انہی سے جن کی مغرب میں وہ غروب ہو رہا ہے، لیکن وہ نقطہ دنیا سے غائب نہیں ہو جاتا، اگر یہاں غروب ہو رہا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہے اور جبکہ زمین

مدد کر وی۔ ہے تو ہر قدم پر اگر غروب ہے تو ہر قدم پر طلوع بھی ہے۔ ایسے وہ ہمہ وقت موجود اور فیض رساں ہے۔ اگر کسی بھی خطے سے وہ مقررہ ساعتوں سے زیادہ غائب ہو جائے تو عالم تباہی کے کنارے آئے۔ اس لئے وہ ہمہ وقت دنیا اور نبی نوع انسان کے سامنے ہے۔ ورنہ لاکھوں ستارے پس کر اول تو ان کے خصوصی ظہور اور طلوع ہی کا پتہ نہیں چلتا اور چلتا ہے تو عام ستاروں میں مل جل کر ان کا ظہور بھی ہو جاتا ہے۔ جس کا دنیا کو احساس بھی نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت یعنی انبیاء علیہم السلام کے ظہور کا ایک وقت خاص مقرر تھا کہ وہ دنیا میں تشریف لائے اور اپنے نورانی آثار چھوڑ گئے۔ دس برس سو چکاس ہزار دو ہزار برس میں ایک نبی کے ظہور کا وقت آیا اور انہوں نے ایک مدت نمایاں رہ کر مخلوق کو راستہ دکھایا۔ لیکن جب غروب ہوئے تو آج ہزاروں نفوس ہیں کہ دنیا ان کے نام نامی تک سے واقف نہیں اور یہ بھی نہیں جانتی کہ دلوں پر ان کے اثرات کیا تھے اور باقی ہیں یا ختم ہو گئے اور نہ ہی دنیا اسکی تمنا ہی کر سکتی ہے کہ وہ اثرات پھر لوٹ آئیں۔ جبکہ وہ اثرات متعارف ہی نہیں اور نہ ان کی ضرورت ہی دلوں میں آئی ہوئی ہے۔ لیکن آفتاب نبوت کا ظہور دوامی از روز اول تا آخر ہے۔ یعنی اس کا دورہ بارہ کے بارہ مہینہ کا ہے۔ حتیٰ کہ اس ظاہری ظہور سے پہلے آپ ہی کا علمی ظہور تھا۔ عہد الست میں آفتاب نبوت ہی کے بلی (کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں) کہنے سے سب انبیاء و اولیاء و صلحا کی زبانوں پر بلی کا ایمانی کلمہ جاری ہوا، جیسا کہ حدیث الست سے نمایاں ہے۔ پھر ہر نبی آپ کی بشارت دیتا ہوا آیا، اور حضرت عیسیٰ کی بعثت کا تو بڑا مقصد ہی یہ بشارت دینا تھا جیسا کہ قرآن شاہد ہے۔ پھر اسی ازل میں سب سے آپ کا یہ علمی ظہور دکھلا کر آپ کے ماننے اور اطاعت کا عہد لیا گیا۔ جیسا کہ آیت یثاق سے واضح ہے۔ پھر پیدائش کے وقت رحم مادر میں توحید کے سانچے آپ کی رسالت ماننے کی تجدید کی جاتی ہے اور فرداً فرداً ہر ایک سے وہی عہد لیا جاتا ہے جو اجتماعی طور پر یوم الست میں لیا گیا تھا۔ جیسا کہ روایات حدیث میں موجود ہے۔

پھر دنیا میں ہر نبی نے اس آفتابِ نبوت کی بشارت دی اور اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر وہ ان کے سامنے آئیں تو سب ان کی اطاعت کریں۔ جیسا کہ قرآن نے اس میثاق کو کھول کر بیان فرمایا۔ پھر آپ ہی کی یہ قرآنی تعلیم قرون سابقہ کی تمام آسمانی کتابوں میں کام کرتی رہی۔

دانش لفظی ذہن اولادیں گویا آپ علم و آثار اور اپنے نام اور کام کے لحاظ سے اہم و اقوام سابقہ میں ظاہر و نمایاں اور متعارف رہے۔ پھر قبر میں بھی آپ کو یا آپ کی صورت مثالی یا صورت صفائی کو دکھلا کر پھر اس عہد سابق کے بارہ میں امتحانی سوالات کئے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ برزخ میں بھی آپ کا ظہور ہے۔ پھر عالم حشر میں آپ ہی کے جہنم کے نیچے سب اقوام و اہم ہونگی آپ ہی کی طرف سارے نبی آدم مل کر شفاعت کلمی کے لئے رجوع کریں گے۔ جس سے عالم آخرت میں بھی آپ کے ظہور کا صاف پتہ ملتا ہے۔ غرض زمانہ الت سے لے کر رحم مادر و دوار دنیا، دنیا کے قرون و دہور، عالم برزخ اور عرصاتِ قیامت تک کو نسا عالم ہے۔ جس میں آپ کا ظہور نہیں اور وہ بھی ایک ایسے امتیاز کے ساتھ جو اور کسی کو میسر نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ آفتاب کی طرح اگر آپ کسی جہان سے کسی وقت غائب بھی ہوتے تو کسی جہان میں علمی ظہور کے ساتھ آپ نمایاں بھی رہے۔ آپ دنیا میں تھے تو عالم غیب میں آپ کے آثار صالح پھیلے ہوئے تھے اور اب عالم آخرت میں ہیں تو عالم دنیا میں آپ علمی ظہور کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ چنانچہ آپ کا عظیم الشان زندہ معجزہ ہی علمی ہے، جو قرآن کی صورت میں دنیا پر ضیاء پاشی کر رہا ہے اور اس معجزہ کی زندہ شرح حدیث پاک کی صورت میں جلوہ گر ہے جو سند صحیح اور اعلیٰ نایابی اصولوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے اور پھر اس کتاب و سنت کی زندہ تفصیلات فقہ و تصوف اور کلام وغیرہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کو روشن کئے ہوئے ہیں جو ذوق نبوی کی حامل اور باذوق راسخین فی العلم کے غلبہ، صفائی پر الہام شدہ ہیں۔ اس لئے واسطہ بلا واسطہ آثار نبوت اسی شان سے دنیا میں آج بھی جلوہ پیرانی کر رہے ہیں جس شان سے وہ قرن اول میں ضیاء پاشی کر رہے تھے۔

ہنوز ان ابر رحمت در نشان است

خم و خم خانہ با مہر و نشان است

یہ ضیاء افگنی اور علمی ضیاء افشانی اتنی کھلی ہوتی ہے کہ ساری دنیا ان اصول و علوم سے زندگی حاصل کر رہی ہے۔ پس یہ آفتاب نبوت گویا اولین و آخرین کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت موجود اور جانا پہچانا ہے۔ جس کے اثرات کو دنیا کھلی آنکھوں محسوس کر رہی ہے، حضور کی اس موجودگی یا حیات کو کوئی کور باطن حاضر و ناظر کے معنی میں نہ لے کر حاضر و ناظر خاصہ الوہیت ہے۔ مخلوق میں جو ظہور تمام باذن اللہ ہو سکتا ہے، حضور سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہیں پس آفتاب مادی کی طرح یہ آفتاب روحانی بھی عالم کائنات میں اگر ایک جگہ غائب ہے تو دوسری جگہ حاضر ہے اور جہاں سے غائب ہے وہاں اس کے علمی اثرات قائم رہتے ہیں۔ اس لئے گویا وہاں سے بھی غائب نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر اس کے اثرات عالم سے ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع ہو جائیں تو دنیا کی روحانیت تباہ ہو جائے تو نہ دنیا کا موجودہ تمدن ہی برقرار رہ سکتا ہے نہ ذہنیت میں وسعت باقی رہ سکتی ہے۔ آفتاب نبوت کا دوامی ظہور اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔



عظمت و شہرت عامہ قبول عام اور پیروی اقوام

پھر جس طرح سارے ستاروں میں آفتاب ہی سب سے زیادہ رفیع و بلند پر نور اور بزرگ ترین ستارہ ہے۔ نیز سب ستاروں سے زیادہ جانا پہچانا اور عجب سے زیادہ مشہور ہے۔ کہ نہ اس کی شہرت کی حد کو کوئی ستارہ پہنچا ہوا ہے اور نہ رفعت و عظمت ہی اس جیسی رکھتا ہے۔ چنانچہ کتابوں اور کہاوتوں تک میں جو شہرت اسکی ہے۔ وہ کسی ستارہ کی نہیں۔ اکثر و بیشتر ستاروں کے تو نام تک سے بھی دنیا واقف نہیں نہ ان کا کوئی منحصوی ذکر زبانوں اور قلموں پر ہے اور نہ ان کی کوئی یاد ہی دلوں میں ہے اور جن چند ستاروں کے

اسماء معلوم بھی ہیں، جیسے زہرہ، مشتری، زحل، مریخ، عطارد وغیرہ تو وہ زیادہ تر جنسیوں کی زینت ہیں۔ خواص و عوام میں سے بہت کم لوگ ہیں جو ان ناموں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ بخلاف سورج کے کہ کوئی فرد بشر اس سے اور اس کے نام سے ناواقف نہیں اور کون ہے جو اس کی صورت زیبا اور سیرت نورا فرما سے باخبر نہ ہو۔ حتیٰ کہ بہت سی قومیں تو اُسے معبود کی حیثیت سے جانتی ہیں، طلوع و غروب کے وقت اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایس کو بھی صورت معبودیت بنانے کے لئے اسی کی آڑ لینی پڑتی ہے کہ عین طلوع و غروب کے وقت اسی کو سر پر لے کر کھڑا ہوتا ہے تاکہ سجدے کرنے والی قوموں کا سجدہ اپنے حق میں تصور کر کے دل ہی دل میں خوش ہو کر یا وہ صورت ان کا معبود بن گیا ہے۔ یا غیر اللہ کی پرستش کرانے میں وہ سورج کی معرفت کامیاب ہو گیا۔ بہر حال ایس لعین رو سیاہ بدنام کو بھی اپنی نام نہاد بڑائی میں چار چاند لگانے کے لئے سورج کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی اس عمومی شہرت و عظمت اور اس عمومی و مخصوصی تعارف کی بناء بجز اس کے فیضان عام کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فضا اور سطح زمین کا ذرہ ذرہ اس کی تمویز اور تاثیر سے فیضیاب اور اس سے روشنی اور گرمی کا فیضان لئے ہوئے ہے تو عدم تعارف کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

ٹھیک اسی طرح آسمان نبوت کے تمام ستاروں میں آدم سے لے کر حضرت یسح تک آفتاب نبوت کو جو عظمت و رفعت اور جو شہرت و وجاہت حاصل ہے۔ وہ کسی سیارے کو نہیں۔ ہزار ہا نجوم نبوت (انبیاء علیہم السلام) ہیں جن کے اسماء گرامی سے بھی دنیا واقف نہیں ہے۔ جن کا آج کوئی تذکرہ تک نہیں۔ قرآن نے بھی فرمایا۔

فمنہم من قصصنا علیک ومنہم
من لو نقص علیک
پس انبیاء میں سے کچھ وہ ہیں جنہیں ہم نے
آپ کے سامنے بیان کیا اور کچھ وہ ہیں جنہیں
بیان نہیں کیا۔

قرآن کریم یا کتب تاریخ کی بدولت جن کے اسماء معلوم بھی ہیں۔ جیسے موسیٰ و عیسیٰ یونس سلیمان، یعقوب و یوسف، داؤد و شعیب، یحییٰ و زکریا، ارمیاد شیخا اور دانیال وغیرہ علیہم السلام

ان کی مکمل تاریخ نامعلوم اور جس حد تک ہے بھی تو وہ ہر قوم میں یکساں متعارف نہیں۔ کوئی قوم کسی پیغمبر کو جانتی ہے اور کوئی کسی کو کیونکہ کوئی بھی ان میں سے عالمی پیغمبر نہیں تھا۔ اور عالمی پیغام لے کر نہیں آیا تھا کہ پورا عالم اس سے واقف ہوتا اور پوری دنیا پر اس کا فیضان عام ہو جاتا۔ نہ ان میں سے کسی نے سلاطین عالم کو فرما میں ہدایت بھیجی۔ نہ کسی نے دنیا کے تمام انسانوں کو خطاب کر کے اپنے پیغام سے آشنا کیا اور نہ وہ پیغام ہی عالمی اسپرٹ اپنے اندر رکھتا تھا کہ ایسا کیا جاتا۔ کیونکہ نجوم ہدایت کا نور محدود اور بلا پھیلاؤ کے ہوتا ہے۔ اس لئے نجوم کا تعارف بھی عمومی نہیں اور رفعتِ ذکر بھی عام نہیں۔

لیکن آفتابِ نبوت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی دنیا کی ہر قوم میں معروف ہے۔ آپ کی شہرت آسمانوں اور زمینوں میں یکساں، بحر و براہ و صحراء و بیابان میں اذانوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ جن میں اللہ کے نام کے ساتھ نام نامی کا تذکرہ لازم ہے۔ ودفعلناک ذکوکے کوئی جگہ نہیں جہاں آپ کے علوم کی روشنی نہ پہنچی ہو اور کوئی خطہ نہیں جہاں آپ کی اخلاقی تاثیرات و برکات نہ پھیلی ہوں۔ جس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کا فیضان عام پوری دنیا کو پہنچا کیونکہ آپ مقامی پیغمبر نہ تھے بلکہ آپ عالمی پیغمبر اور پورے عالم انسانیت کے مصلح اور مرتبی تھے، آپ کا پیغام کسی ایک قوم یا ایک طبقہ کے لئے خاص نہ تھا بلکہ عمومی تھا۔ شرعی حیثیت سے بھی، تاریخی حیثیت سے بھی اور تمدنی حیثیت سے بھی شرعی طور پر دیکھو تو قرآن نے آپ کو رحمتہ للعالمین، نذیر للعالمین کہا جس سے آپ کا سب جہانوں کے لئے رحمت ہونا اور سارے جہانوں کے لئے ہادی و نذیر ہونا واضح ہے، پھر ان دونوں اوصاف کے ساتھ آپ کی رسالت کو سارے انسانوں کے لئے بنایا گیا اور کہا گیا اور آپ کی رحمت ممالک دنیا میں پھیلی اور عام ہوئی۔

وَمَا ارسلناکَ اِلَّا کَافَّةً لِّلنَّاسِ

اور ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کیلئے

بشیراً و نذیراً۔

بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کو ارشاد فرمایا گیا کہ جہانوں کے سارے انسانوں کو خطاب فرمائیں۔

قل یا ایہا الناس انی رسول

آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی

اللہ الیکو جمیعاً ۛ طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس لئے روم و شام، مصر و فلسطین، ایران و توران، ہند و سندھ، یورپ و ایشیا، افریقہ و امریکہ، چین و روس، افغانستان و ترکستان، جاوا و سماٹرا، عرض مشرق و مغرب میں آپ کی امت پھیلی اور آپ کا ملک وسیع ہوا۔ تاریخی حیثیت سے دنیا اُسے مان چکی ہے کہ آپ علمی مصلح اور عالمگیر تعلیم لے کر آئے ہیں اور دنیا اس تعلیم کو قبول کرنے پر مجبور بھی ہے۔ جو آپ کی نبوت کو نہیں بھی مانتے۔ وہ بھی آپ کو دنیا کا سب سے بڑا حکیم اور سب سے بڑا دانا اور عاقل ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے تعلیم فرمودہ اصول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ توحید کامل کا پیغام آپ ہی نے دیا جو مذہب کی جان اور روح رواں ہے۔ اسی توحیدی گونج کا نتیجہ تھا کہ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا۔ جس نے تثلیث سے بیزاری کا اظہار کر کے وحدانیت کا درس قبول کیا۔

انہی توحیدی سواعظ کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں میں آریامت کھڑا ہوا۔ جس نے توحید کا نام لینا شروع کیا۔

انہی توحیدی تعلیمات کا ثمرہ تھا کہ ہندوؤں میں سکھوں کا فرقہ توحید کا نام لیوا بن کر کھڑا ہوا۔ جس کے بانی گرو نانک صاحب نے حضرت بابا فرید شکر گنج سے مستفید ہو کر توحید کی اشاعت شروع کی۔

اسی توحیدی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج بت پرست قومیں بھی بت پرستی کو عیب اور شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ معاشرت کی لائن کو دیکھو تو اوپر نیچ مٹا کر مساوات کا درس آپ نے دیا اور دنیا کی قومیں اس اصول کو اپنانے پر مجبور ہو گئیں، بالخصوص آج کے مشینی دور میں جبکہ پوری دنیا ایک عالم اور ایک قبیلہ بن چکی ہے اور اقوام عالم میں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عوامیت اور عبوریت اُبھر رہی ہے جس میں مساوات کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے اوپر نیچ والی قومیں بھی آج اوپر نیچ کو لعنت قرار دینے لگی ہیں۔ نسلی امتیازات کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ درس

انہیں کہاں سے ملا؟ بلاشبہ وہیں سے ملا ہے جہاں سے بطور اصول اعلان کیا گیا تھا کہ

- ۱۔ ان الناس کلہم اخوة (حدیث نبوی) تمام نبی آدم بھائی بھائی ہیں۔
- ۲۔ یا ایہا الناس انا خلقناک من ذکر وانثی (القرآن) اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔
- ۳۔ کلکو بنوادم وادم من قراب (حدیث نبوی) تم تمام اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔

آج ہندوستان کے وزیر اعظم (مسٹر نہرو) اعلان کرتے ہیں کہ اگر عالمیت چاہتے ہو تو نسلی امتیازات ختم کرو۔ چھوت چھات کی لعنت دور کرو۔ اوپر نیچے مساوی! گاندھی جی بھنگی بستی میں ٹھہرتے ہیں اور ہر کچنوں کیلئے مندر کھلوانے کا پرچار کرتے ہیں۔ پتھری چاروں کے گھر کے گلاس میں دودھ پیتے ہیں۔ آخر کار چھوت چھات کے دلدادوں کو یہ تعلیم کہاں سے ملی؟ کو ڈبل کے پاس کرانے پر آج تعلیم یافتہ ہندو کیوں تلے ہوئے ہیں جو ستراسر فقہ اسلامی کا چربہ ہے۔ میراث بنات، تعداد ازدواج، طلاق بل، خلع بل وغیرہ کا اسمبلیوں میں کیوں چرچا ہے؟ مسئلہ غلامی کی تحقیر پر آج کیوں نظر ثانی کی جا رہی ہے؟

سیاسی لائنوں میں بادشاہت ایڈمی کی شکل میں کیوں آرہی ہے؟ گدی نشینی کے بجائے انتخاب اصلاح کا اصول کیوں جاری ہو رہا ہے؟ شخصی استبداد کے بجائے رائے عامہ کی اہمیت کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ جس سے امراء و سلاطین ہمیشہ گریزاں اور متنفر رہتے تھے۔ تنگدلی کے بجائے رواداری کا درس آج کس نے دیا ہے، تعصب کو بری لگا ہوں سے کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ جو اب تک بقاء قومی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا تھا۔ آج ایشیوں پر دوسروں کے مقتداؤں کی تعریف وہ لوگ کیوں کرنے لگے ہیں جن کی مذہبی بنیاد ہی مقتدیان مذہب کی تحقیر پر قائم تھیں جن کے یہاں مذہب تکذیب غیر کا نام تھا۔ نہ کہ تصدیق غیر کا۔ آج یہ نفرت کی بنیادیں کیوں بری سمجھی جا رہی ہیں اور انہیں فرقہ واریت بتا کر ان کے مقابلہ میں بین الاقوامی موانست کا پرچار کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ بلاشبہ صرف اسی

آفتاب نبوت کی روشن تعلیمات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہونے کا ثمرہ ہے۔ جس نے عالمیت کی طرف دنیا کو بلایا۔ سب مقتدا ایمان نہاد سب پر ایمان لانا سکھایا جس نے ایمان کے سلسلہ میں تفریق بین الرسل کو ممنوع قرار دیا۔ سارے انسانوں کو بھائی بھائی کہا۔ ساری دنیا کو پیغام امن سلامتی دیا۔ سارے انسانوں کو بلا تفریق نسل و رنگ ایک ذات واحد کی طرف بلایا اور اس پر جمع کر دیا۔ ساری اقوام کو قوم واحد بنانے کا اصول رکھا۔ سلاطین عالم کو فرما بیٹھے۔ قیصر و کسریٰ کی جاہلانہ اور مستبدانہ سیاستوں کو الٹ کر اخلاقی سیاست پھیلانی۔ پوری دنیا میں اپنے نقیب بھیج کر پیغام فطرت پہنچایا جو ہر قوم کے لئے یکساں قابل قبول تھا۔

یہی وہ عالمگیر فیضِ رسانی تھی جس سے آپ کی مقبولیت عالمگیر شہرت و عظمت عالمگیر اور معرفت و پہچان عالمگیر ہوئی۔ جیسا کہ ستاروں میں آفتاب کی ہے۔ پس دنیا اور انبیاء کے ناموں تک سے واقف نہیں کر ان کی روشنی پھیلتی ہوئی روشنی نہ تھی۔ لیکن آپ کی تعلیمات آفتاب کی دھوپ کی مانند تھیں جنہوں نے دن بھی کر دیا اور ذرہ ذرہ پر پھیل کر ہر فرد بشر کے سامنے اپنے کو خود روشناس کر دیا۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ آفتابِ نبوت کو پورا عالم جان نہ جانا اور پہچان نہ لیتا۔ نیز سارے نجوم نبوت میں اس کی یہ امتیازی معرفت و پہچان عام نہ ہو جاتی۔

جامعیتِ شئون

پھر آفتاب میں جہاں جامعیت کی شان بھی موجود ہے۔ وہ جلاتا بھی ہے اور بھجاتا بھی ہے۔ اس میں سوز و تپش بھی ہے اور خشکی و برودت بھی ہے۔ جلال بھی ہے اور جمال بھی ہے۔ کیونکہ اس مادی آسمان پر جب سورج طلوع کرتا ہے تو برکھلی ہوئی بات ہے کہ بے تحاشا گرمی برسنے لگتی ہے۔ جس سے اشیاء تپ جاتی ہیں اور سوختہ ہو جاتی ہیں اور اسی آسمان پر چاند بھی طلوع کرتا ہے۔ جس سے ٹھنڈک برسنے لگتی ہے اور چیزیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اگر سورج کی گرمی نہ برے تو اشیاء میں حرارتِ عزیز می نہ رہے جو نشاءِ حیات ہے اور اگر چاند کی ٹھنڈک نہ برے تو پھلوں میں رس، نلیوں میں گودا اور پھلکوں میں مغز پیدا نہ ہو، جو شے کی زندگی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ بڑیاں اگر خشک ہو جائیں، پھل رس نہ رہنے کی وجہ سے سوکھ جائیں۔

اور پھلکے مغز کو کھو کر خشکی سے سکتا جائیں تو یہی ان کی فنا ہے جس سے واضح ہے کہ جہاں اشیاء کے لئے خشکی کی ضرورت ہے۔ وہیں تیزی کی بھی حاجت ہے اور یہ دونوں چیزیں آسمان نے جمع کر رکھی ہیں خشکی کو سورج لاتا ہے اور تیزی کو چاند، لیکن خود کر و تو یہ تیزی بھی سورج ہی لاتا ہے کیونکہ چاند میں خود اپنی کوئی روشنی نہیں۔ وہ تو ایک شفاف آئینہ کی طرح ہے جس کی چمک دمک اور نورانیت سب آفتاب کا فیض ہے۔ اس لئے چاند میں درحقیقت آفتاب ہی کا نور ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خود چاند کے طرف میں کچھ ٹھنڈک کی خاصیتیں رکھدی گئی ہیں جس سے سورج کا نور اس میں پہنچ کر رنگ بھی بدل دیتا ہے۔ اس کی تیزی اور تیزگی بھی باقی نہیں رہتی اور تپش بھی تبدیل ہو جاتی ہے کہ شعلہ باری باقی نہیں رہتی اور روشنی کا نام بھی بدل دیتا ہے کہ دھوپ کے بجائے اُسے چاندنی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن ہوتا ہے۔ وہ سورج ہی کا نور ہے چاند کی ٹھنڈی روشنی درحقیقت سورج ہی کی روشنی ہے جو مقامات خصوصیات سے کچھ تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے بجلی کو میٹر میں دوڑا دیا جائے تو کمرے گرم ہو جانے میں اور اسی بجلی کو ایر کنڈیشن کے طور پر اسکی مشین میں دوڑا دیا جائے تو کمرے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پس بجلی کی اصل تو درحقیقت ناریت اور تیزی ہے۔ لیکن ایر کنڈیشن کے راستے سے اسے لایا جائے تو وہی تیزی اور گرمی ٹھنڈک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو مشین اور اس کے طرف کی خاصیت ہوتی ہے، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ بجلی کی آگ جلانے اور بجھانے کے دونوں کام کرتی ہے۔ صرف طرف کی خصوصیات، بدلتی ہیں بجلی نہیں بدلتی۔ ٹھیک اسی طرح سورج کے نور میں بھی گرمی اور جو چاند کے طرف کی خصوصیت ہے۔ ٹھنڈک دونوں کی خاصیتیں موجود ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ گرمی بلا واسطہ ہے جو سورج کی اصل خاصیت ہے اور ٹھنڈک بواسطہ چاند ہے جو چاند کے طرف کی خصوصیت ہے۔ مگر نور دونوں جگہ سورج ہی کا کام کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں حالتوں کو سورج ہی کی شائیں کہا جائے گا کہ وہ جلانا بھی ہے اور بجھانا بھی ہے۔ گر مانا بھی ہے اور ٹھنڈا کرنا بھی ہے۔ صرف واسطہ اور بلا واسطہ کا فرق ہے۔ لیکن اگر نکالنا کو اور گہرا لایا جائے تو واضح ہو گا کہ چاند کے واسطہ کے بغیر بھی سورج پر یہ گرمی اور

ٹھنڈک دونوں یکساں جمع ہیں کیونکہ سورج جہاں سمندروں کو تپاتا ہے جس کا نام ہی جلالا اور تپانا ہے۔ وہیں اس تپش سے ان میں انجرات بھی اٹھاتا ہے جو انسون لیکر ٹھنڈا پانی دنیا پر برساتے ہیں جس سے گرمیاں بگھتی چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ سورج ہی کا فیض ہوتا ہے۔ وہ نہ ہو تو سمندروں میں بخارات بھی نہ اٹھیں، ان سون بگھتی رہتے اور ٹھنڈے پانی سے دنیا سرد ہو جاتے۔ اس سے نمایاں ہے کہ سورج ایک ہی وقت میں سمندروں میں تپش اور ٹھنڈک کے دونوں سامان پیدا کرتا ہے۔ پھر بحر ہی میں نہیں رہیں بھی یہ دونوں کیفیات سورج ہی کی قات سے نمایاں ہوتی ہیں۔ عین گرمی کے شدید میں جس آن سورج زمین کی سطح کو تپاتا ہے اسی آن زمین کے اس اندرونی حصہ کو ٹھنڈ بھی بخشتا ہے چنانچہ اوپر کی گرمی جتنی شدید ہوتی ہے اندرونی ٹھنڈک اسی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ گرمیوں میں پانی تک زمین کے اندر سے ٹھنڈا نکلتا ہے۔ لیکن سردی کے موسم میں اس کا عکس ہوتا ہے، یہی آفتاب جب زمین کے اوپر کے حصہ کو گرمی کم دیتا ہے گویا اس میں ٹھنڈک ملا دیتا ہے تو زیر زمین گرمی بڑھا دیتا ہے۔ جتنی کہ سردیوں میں پانی بھی زمین کے اندر سے گرم نکلنے لگتا ہے، اتنے خانے بھی گرم ہو جاتے ہیں اس سے ثابت نمایاں ہے کہ سورج چاند کے واسطے کے بغیر بھی سردی و گرمی اور حرارت و برودت کی دونوں شاخیں اپنے اندر ملی جلی لئے ہوئے ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جامعیت اخلاقیات اپنے خاص شان ہے اگر گرمی میں یہ زمین کی ذاتی ٹھنڈک ٹھنی تو سردیوں میں یہ ذاتی وصف کہاں کم ہو جاتا ہے اور کیوں کم ہو جاتا ہے اور زمین کے اندر کی گرمی اصل اور ذاتی ہے تو گرمی میں وہ کیوں زائل ہو جاتی ہے اور اگر زمین کی یہ سردی گرمی ذاتی نہیں، بلکہ آفتاب کا اثر ہے تو یہی ہمارا مدعا ہے جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ سورج بحر و بر میں گرمی و خشکی دونوں کے آثار نمایاں کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت بھی جلال و جمال نرمی و گرمی، مہر و مہر دونوں شاخیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے جس سے اس کا کمال اعتدال ثابت ہوتا ہے۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف رحمت مجسم ہیں تو دوسری طرف غضب مجسم بھی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے

بعثت مرحمة و
ملحمة
اور فرمایا گیا۔

میں رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور غضب
مجسم بنا کر بھی۔

انا الضحوک القتال
میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور بہت جنگی
بھی ہوں۔

چنانچہ ایک طرف آپ کی شریعت میں عفو و درگزر، نفی جرم، عذر پذیر می، مصالحت و چشم
پوشی اتہائی ہے جو مہر کی شان ہے اور دوسری طرف حدود و قصاص، سزا و تعزیر، جہاد
و قتال اور کفارات بھی مکمل پیمانہ پر ہیں جو قہر و سیاست کی شان ہے۔ پس جیسے اس آفتاب
روحانی کی روشنی سے مہر و رحمت ٹپکتی ہے۔ ویسے ہی قہر و سیاست بھی چھتی ہے اور جیسے
وہ جمال کا مصدر ہے۔ ویسے ہی جلال کا مظہر تم بھی ہے۔

اسی لئے اس روحانی آفتاب کو "سراج منیر" فرمایا گیا۔ "سراج" کے لفظ سے
جلال و قہر اور گرمی کا ثبوت ملتا ہے، اور "منیر" کے لفظ سے ٹھنڈک اور جمالی شان
کا پس لفظ سراج کے گویا نذیر للعالمین کی شان نمایاں ہے اور منیر کے لفظ سے رحمة للعالمین
کی شان واضح ہے اور یہ دیانت و سیاست کے دونوں نور ایک ہی ذات میں جمع کر لئے
گئے۔ ایک طرف حکم ہے:

خذ العفو و امر بالمعروف و
اعرض عن الجاهلین؛
اور دوسری طرف حکم ہے۔

آپ عفو اور درگزر اختیار کریں۔ بھلائی کا
حکم کریں اور جاہلوں سے اعراض کریں۔

یا ایہا النبی جاہد الکفار و
المنافقین و اغلظ علیہم؛
اور ان پر سختی کیجئے۔

اے نبی صلح مخالفوں سے جہاد کیجئے

ایک طرف فتح مکہ کے وقت مکہ میں آپ لشکرِ جبار کے ساتھ مسلح داخل ہوتے ہیں جو
قہر و سیاست کی شان ہے اور اسی آن تو واضح اور خاک ساری اور شفقت کا یہ عالم ہے کہ شدت
تواضع سے گردن جھکی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اونٹ کی گردن کے قریب سر مبارک آیا ہوا ہے

اور اس عام کا اعلان فرماتے جاتے ہیں۔ پس انڈیا بھی ہے اور تبت بھی۔ مہر بھی ہے اور
 قہر بھی، دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، فقیر بھی ہے اور شاہی بھی، آپ ہی کی روحانی
 قوتیں جب صدیق اکبر میں سے ہو کر گذرتی ہیں تو وہ رحمتِ محضہ اور جلالِ صودت میں نیلیاں
 ہوتی ہیں اور وہی قوتیں جب فاروقِ اعظم میں سے گذرتی ہیں تو جلالی اور سیاسی شان اختیار کر لیتی
 ہیں مگر دونوں میں نور ایک ہی آفتاب کا کار فرما تھا۔ غرض اس آفتابِ نبوت اور سراجِ منیر
 میں نرمی و گرمی دونوں بیک وقت ملی جلی قائم ہیں۔ پس جیسے سورج کی تشبیہ سے آفتابِ نبوت میں
 اجتماعیت کبریٰ کی شان ثابت ہوتی تھی۔ ویسے ہی اس تشبیہ سے اس میں جامعیتِ جلال و
 جلال کی شان بھی ہو پیدا ہو جاتی ہے اور ایک ذات میں دونوں متضاد کمال جمع دکھائی دیتے
 ہیں۔ ورنہ پہلی امتوں میں یہ دونوں شائیں الگ الگ رہتی تھیں، انبیاءِ شرعی احکام دیتے تھے
 اور سلاطین و ملوک ان کا نفاذ کرتے تھے۔ یعنی دین اور سیاست دو طبقوں میں الگ الگ منقسم
 تھے گویا اس وقت کا دین مادی قوت و شوکت برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت
 کی قوتیں مزاج کی شدید قوتوں کے لحاظ سے قومی تر اور نفسانی قومی کے لحاظ سے شدید تر تھیں
 انہیں دین پر لانے کے لئے اس درجہ یکسوئی اور ترکِ دنیا کی ضرورت تھی کہ اس کے ساتھ
 دنیوی جاہ و جلال اور تاج و تخت کسی طرح جمع نہیں رہ سکتے تھے اگر جمع کئے جاتے تو ان
 کی شدید نفسانی قوتیں اس کو فرسے نفسانی جذبات ہی کی طرف مائل ہو کر رہ جاتی اور روحانیت
 کا کوئی شمعان میں قائم نہ ہوتا۔ پس انبیاء کا گروہ تو ان کے دلوں میں ترکِ دنیا کے مجاہد سے
 دین اور خدا ترسی پیدا کرتا تھا اور ان کی سرپرستی میں ملوک و سلاطین کا گروہ سیاسی قوت سے
 اس دین کو نافذ کرتا تھا۔ تب اقوام کا دین خالص ہوتا تھا۔ اس پر بھی عام قومیں دین اور روحانیت
 پر نہ اٹکیں اور انبیاء کا مقابلہ کر کے ہلاک ہو گئیں۔ مگر امتِ مسلمہ آخری امت تھی، قدیم دنیا کے
 منقسم جلال و جمال کا ردِ عمل دیکھ دیکھ کر اس کے قومی میں کمالِ اعتدال اچکا تھا اور جامعیت
 کی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے اسے نبوت اور شریعت جامع دیدی گئیں اور ایک ہی
 ذاتِ بابرکات (آفتابِ نبوت) میں یہ جلال و جمال کی دونوں شائیں رکھ دی گئیں جس سے
 دیانت میں سپاست اور روحانیت کے ساتھ ملوکیت مخلوط ہوئی، اس طرح الملک والذین

تو اسات (ملک اور دین دو جوڑواں بچے میں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا) کا ظہور ہوا گویا ام سابقہ میں ان دونوں چیزوں کی جدائی استغداد کے سبب سے تھی۔ اصل حقیقت نہ تھی یہ ضرور ہوا کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو جہاد کا حکم دیا گیا اور ملک کا کوئی خاص حصہ فتح کرنے پر مامور فرمایا گیا۔ لیکن بعد از فتح پھر وہی دیانت و سیاست کی تقسیم ہوتی رہی۔ صرف اسلام میں جہاد اور فتح کے بعد دین و ملک جمع کر دیئے گئے تھے جو ان کی اصلیت تھی، اس سے آفتاب نبوت کی شان جامعیت اسی تمثیل سے نمایاں ہو جاتی ہے جو بہت سی شرعی نص کا مصلوق ہے۔

جامعیت احوال

پھر اسی جامعیت کا ایک اور نمونہ اور ایک دوسرا پہلو بھی اسی تمثیل سے کھاتا ہے اور وہ یہ کہ آفتاب ہی کی ایک اور خصوصیت پر نگاہ ڈالنے سے نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف تو وہ ہر آن دنیا کو نور و حرارت اور روشنی بخشتا رہتا ہے کوئی ایک لمحہ اس سے فارغ نہیں کہ اس سے نور و حرارت دنیا کو ملنا بند ہو جائے بغضاً اور موالبہ کو گرمانا اور روشن کرنا، ہر ایک کے گھر پر روشنی و گرمی ڈالنا، بیماریوں کی طبیعتوں میں گرمی اور روشنی بھرنا، تندرستوں میں حرارت عزیز کی کو ابھارنا، پھر اس روشنی اور گرمی سے دنیا کے کام کاج میں اعانت کرنا۔ جیسے مسافروں کے سفر کی تکمیل جو بلا روشنی کے نہیں ہو سکتی۔ معاش کی تکمیل جو بغیر روز روشن کے نہیں ہو سکتی۔ آتشگیر مادوں میں آتشیں مادے بھرنا۔ وہ طلوع نہ کرے تو کسی بھی آتشگیر مادے اور آتشخان طرف میں آتشیں اثرات کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ نہ چقماق سے شرارہ بلند ہو، نہ لوہے سے چنگاری پیدا ہو، نہ پتھر سے آگ نکلے۔ نہ پانی سے بجلی بنے، نہ سمندر سے مان سون اٹھے، نہ رطوبات فاسدہ خشک ہوں نہ مرطوب مزاجوں میں اعتدال پیدا ہو جس سے واضح ہے واضح کہ سورج کا ایک ایک لمحہ تمام اشیاء کائنات کو فیض رسانی میں مشغول ہے جسے خدمت خلق کا عنوان دیا جانا غیر موزوں نہ ہوگا۔

لیکن خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ اگر اس کے دوسرے حال پر نظر کیجائے تو
نظر آتا ہے کہ اس کا کوئی لمحہ عبادتِ رب سے بھی فارغ نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث ابو ذر
غفاری رضی اللہ عنہ میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم

في السجدة عند غروب الشمس

فقال يا ابا ذر تدرى اين

تذهب هذه الشمس؟

قلت الله ورسوله اعلو قال

تذهب لتسجد فتسأذن

فيؤذن لها في الرجوع كما جاء

(كافي رواية الترمذي واحمد)

ويوشك ان تسجد فلا يؤذن

لها فقال لها ارجعي من حيث

جئت فتطلع من مغربها فذلك

قوله عز وجل والشمس تجري

لستقر لها

مراد حدیث متعین کرنے کے لئے اس پر غور کیجیے کہ زمین گول ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ ثابت

شدہ ہے اور آفتاب اس کے ارد گرد گردش میں ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور

کیا ہو سکتا ہے کہ ہر آن کہیں طلوع ہے اور کہیں غروب گویا ہر لمحہ وہ طلوع بھی کرتا ہے

اور غروب بھی ہوتا ہے اور جبکہ ہر غروب کے بعد سجدہ کر کے نئے طلوع کی اجازت

چاہتا ہے تو نتیجہ صاف یہ نکلا کہ وہ ہر آن سجدے کرتا ہوا چلتا ہے۔ پس جب یہ

اس چال سے ہر لمحہ اشیاء کو نور اور گرمی بخشتا ہے۔ اسی طرح اس حال میں ہر لمحہ سجدہ

کرتا ہے جسے عبادتِ رب کہنا چاہیے۔ گویا سورج کا ایک ایک لمحہ خدمتِ خلق اور

عبادتِ رب دونوں میں یکساں مشغول ہے۔ نہ خدمتِ خلق سے عبادت اُسے مشغول کرتی ہے اور نہ عبادتِ رب سے خدمتِ خلق میں فرق آتا ہے جس سے سورج کی جامعیت احوال واضح ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب کی بھی کہ ادھر تو شب و روز مخلوق خدا کی تربیت اور انہیں علم کی روشنی اور عشق الہی کی گرمی پہنچانا جس سے ایک منٹ فارغ نہیں تھا کیونکہ آپ کی پوری زندگی کو اسوہ حسنہ کہا گیا ہے جس کا ایک ایک لمحہ دین اور شریعت ہے۔ وہ قول ہو یا عمل۔ عادت ہو یا عبادت ہر ایک میں نمونہ عمل اور ذریعہ اتباع و پیروی موجود ہے۔ آپ کا سغا ہو یا جاگنا۔ سب نمونہ شریعت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع دین میں ہے۔ دنیا میں نہیں۔ ایسے آپ کی پوری زندگی اور زندگی کا ایک ایک حرکت و سکون دین بخشنے والا ہے جس کی تعبیر دوسرے لفظوں میں یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کا ہر لمحہ خدمتِ خلق اور تربیتِ مخلوق میں مصروف تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ کا کوئی لمحہ یاد الہی اور ذکرِ خداوندی سے فارغ نہ تھا۔ صریح حدیث میں ہے:

کان یذکر اللہ علی کل احیانہ آپ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے اور

کان دائم الفکرۃ حزیناً ہر وقت متفرد اور حزین رہتے تھے۔

ہر لمحہ ذکر الہی میں اور ہر دقیقہ فکر میں مشغول تھا۔ کوئی گھڑی ذکر و فکر سے خالی نہ تھی اور سونے اور جاگنے کا کوئی عمل نہ تھا۔ جس میں اخلاص کامل اور جہت کاملہ کی روح دوڑی ہوئی نہ ہو پس وہی ساری زندگی جو خدمتِ خلق میں لگی ہوئی تھی۔ وہی پوری کی پوری عبادتِ رب میں بھی مشغول تھی کہ لوجہ اللہ تھی۔ اسلئے ہر آن آپ شفقت علی خلق اللہ میں بھی مشغول تھے اور ہر آن تعظیم لامر اللہ میں بھی لگے ہوئے تھے نہ خدمتِ خلق سے عبادتِ غافل بنا سکتی تھی نہ عبادتِ رب سے خدمتِ غافل کر سکتی تھی۔ اس لئے آفتابِ نبوت کی جامعیت احوال بھی اسی آفتابِ مادی کی تشیل سے واضح ہو گئی۔

رحمت مطلقہ

پھر جیسے سورج کے لئے طلوع و غروب رکھا گیا۔ طلوع سے وہ سامنے آجاتا ہے اور غروب سے پردہ کر لیتا ہے نہ ہر وقت موجود نہ ہر وقت غائب کیونکہ اسکی ہمہ وقت کی موجودگی بھی دنیا کے لئے باعثِ تباہی ہوتی۔ عدمِ تحمل کی وجہ سے اور اس کی ہمہ وقت کی غیبت بھی دنیا کی بربادی کا باعث ہوتی۔ انقطاعِ حرارت کی وجہ سے، اس لئے اس کا ظہور بھی نافع ہے اور خفا بھی مفید اور دونوں ہی عالم کے لئے ضروری ظہور سے دنیا خود اس سے نور لیتی ہے اور اس کی استفادہ صلاحتیں بروئے کار آتی ہیں اور اس کے خفا سے دنیا اپنے ان نور افکن اجزاء سے افادہ کسٹی ہے۔ جن میں آفتاب کے فیض سے نور افکنی کی صلاحتیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا میں نئی نئی قسم کی روشنیاں اور گرمیاں نمودار ہوتی ہیں۔ جس سے دنیا کی افادہ قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آفتابِ نبوت کا دور بھی ظہور و خفا پر مشتمل رکھا گیا۔ اس کے ظہور سے دنیا نے اس سے علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حاصل کی۔ اپنے سینوں کو روشن کیا جس سے خالق و مخلوق کو اور ان کے فرق کو پہچانا، اپنا علم و عقیدہ درست کیا اور اس سے اپنا صحیح انجام اس میں دیکھا اور اس طرح روحانیت کا کارخانہ جاری ہوا۔ جس سے انسان کی اپنی روحانی زندگی کی تکمیل ہوئی، ظاہر ہے کہ طلوعِ آفتاب کے بغیر ہدایت کی روشنی کسی طرح بھی نمایاں نہ ہوتی اور انسان ظلم و جہالت کی تاریکیوں میں پڑا رہ جاتا۔ جس سے ظاہر ہے کہ آفتابِ نبوت کا طلوعِ عالم کے لئے ایک مستقل رحمت اور نعمت ہے۔ ان احسانہ

مہداتہ میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ (عالمِ انسانیت) کو دی گئی ہے۔

لیکن غور تو آفتابِ نبوت کا غروب اور پردہ کر لینا بھی کچھ کم رحمت نہیں۔ کیونکہ جیسے مادی آفتاب کے غروب کے بعد ہی لوگ جدوجہد کرتے ہیں کہ آفتاب کی بخشی ہوئی روشنی و گرمی جس جس مادہ میں بھی موجود ہے۔ اس سے نکال کر دنیا میں چاندنا کریں تو ان کی قوتِ ایجاد چراغ، لائٹن، گیس، الیمپ، بجلی اور قمقمے دیا سلائی اور چمقاق اور ٹارچ وغیر

کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور رنگ بزرگ کی روشنیاں دنیا میں نمودار ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قوت ایجاد بروئے کار نہ آتی اور اس کی یہ ایجاد ہی صلاحیتیں پردہ عدم میں مستور پڑھی رہ جاتی۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب یا اس کی موجودگی میں اس سے یہ حسّی اور مکانی جدائی بھی اللہ کی ایک عظیم نعمت اور رحمت ثابت ہوئی۔ آفتاب نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی جبکہ دنیا اندھیر ہو گئی، ان وارثان نبوت میں جو روشنی بفیض نبوت آئی تھی، اس کے ظہور کا وقت آیا اور جس جس فرد میں اس آفتاب روحانی کی کوئی کن پیوست تھی، اس سے استنباط کر کے حوادث میں اس نے راہ نکالی۔ نئے نئے مسائل رونما ہوئے اور لاکھوں وہ علوم و معارف جو نور نبوت کی شکنوں میں پلٹے ہوئے تھے شکنیں کھولنے کے بعد ظاہر ہونے شروع ہوئے، جس سے دین ایک مرتب گلدستہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ اگر آفتاب نبوت یہ ظاہری پردہ نہ کر لیتا تو کس کی مجال تھی کہ اس کے روبرو کوئی اپنے اجتہاد و استنباط سے کام لیتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ امت کی اجتہاد ہی صلاحیتیں کبھی بھی بروئے کار نہ آئیں۔ پس مادی آفتاب کے غروب سے جیسے کائناتی مادوں کی نور بخشی کی ایجاد ہی صلاحیتیں کھلتی ہیں، ایسے ہی روحانی آفتاب کے غروب سے روحانی مادوں کی علم بخشی کی اجتہاد ہی صلاحیتیں کھلیں۔ پس طلوع سے اگر نور گیری کی قوتیں کھلیں تو غروب سے نور بخشی کی صلاحیتیں نمودار ہوئیں، ایک سے استفادہ کی قوت نمایاں ہوئی اور ایک سے افادہ کی۔ گویا دونوں حالتوں میں نور آفتاب ہی کا ہونا ہے، جو ضیاء بخش ثابت ہونا ہے مگر طلوع میں بلا واسطہ اور غروب میں بالواسطہ۔ پس طلوع سے نبوت کا نور نمایاں ہوا اور غروب سے ولایت کا طلوع سے تقلید و اتباع کا رنگ کھلا اور غروب سے اجتہاد و استنباط کا جو بالواسطہ وہی نور نمودار ہوتا ہے۔ صرف طرف کی خصوصیات اس میں لگ جاتی ہیں، اس لئے وہ رنگ بزرگ ہو جاتا ہے جو جیسے نبوت کی شائیں خود رنگ بزرگ ہیں، اسی طرح ان کے مظاہر بھی رنگ بزرگ ہونے ضروری تھے۔ اسلئے نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی صدیقیت، فاروقیت، امامت اور اولوالامر کی استنباطی قوتیں نمایاں ہونی ممکن تھیں۔ اسلئے غروب آفتاب نبوت بھی ایک

مستقل نعمت اور رحمت ثابت ہو اور اس طرح ذات بابرکات نبوی اسی تمثیل سے رحمت
مطلقہ بھی ثابت ہوئی۔ انارحمة مہداة :

ادھر یہ ظہور و غیبت اور حضور و شہود خود آپ کی ذات بابرکات کے حق میں
ہر لمحہ ترقی مدارج کا ذریعہ تھا۔ ظہور اور شہود کے وقت تو تعلیم و تربیت اور تنویر و تاثیر
سے آپ کے سامنے ہوتے تھے اور ہر لمحہ ترقی درجات تھی اور غیبت کے
وقت جبکہ غیبت تامہ ہوتی تھی۔ جیسے مثلاً نزول وحی کے وقت فنایت کاملہ کا غلبہ ہوتا تھا
اور غیبت تامہ ہوتی تھی کہ نہ آپ کسی کے پاس ہوتے تھے نہ آپ کے پاس کوئی ہوتا تھا یا
حسی طور پر جیسے شب معراج میں آپ سب سے اوجھل تھے تو اس میں بلا واسطہ ترقی درجہ
ہوتی تھی پس شہود میں ترقی بواسطہ تعلیم و تربیت و خدمت خلق تھی اور غیبت میں ترقی
بلا واسطہ تھی۔ ایسے آفتاب نبوت کا یہ ظہور و خفاء خود آفتاب نبوت کے حق میں بھی ہر
لمحہ رحمت کاملہ ثابت ہوا۔

پختگی اور تکمیل

پھر جیسے آسمانی ستارے جڑی بوٹیوں میں رس ضرور بھر دیتے ہیں بلیوں میں گدا ضرور
پیدا کر دیتے ہیں، لیکن انہیں پکانہیں سکتے پختگی صرف آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے
جس سے جڑی بوٹیوں کا رس حد کمال کو پہنچتا ہے اور پٹی کی نلکیوں میں گدا پختہ ہو کر بدن
کی جان بن جاتا ہے۔ اگر آفتاب اپنی حرارت سے ان مغزوں کو نہ پکائیں اور وہ بہتے ہوئے
سیال ماٹھے رہ جائیں تو کسی بدن میں جان اور توانائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک اسی طرح نجوم
نبوت (انبیائے سابقین نے قلوب اور دماغوں میں ایمانوں کا ضرور بھر اور دین کے مغز
کوان کے ظرفوں میں بھرتے بھی رہے، مگر دین کی پختگی اور تکمیل آفتاب نبوت کے بغیر ناممکن
تھی، البتہ امم سابقہ میں تو پختگی کی صورت یہ تھی کہ علوم خاتم النبیین ان کے صحیفوں میں کار فرما
تھے، وانہ لفضی ذوالاولین (اور اسی قرآن کی روح پھیلوں کی کتابوں میں موجود تھی) اور
اس طرح انبیاء کی ہنگامی تعلیمات کے خاکوں میں یہ قرآنی علوم و معارف اپنا رنگ بھرتے تھے۔

جس سے تعلیم و تربیت میں پختگی کی صورت پیدا ہو جاتی تھی، اور امت محمدیہ میں اس کے برعکس علوم سابقین تو بلواسطہ حضرت خاتم النبیین موجود تھے اور علوم نبوی براہ راست کارفرما ہوئے، اس لئے اہم سابقہ اور امت مرحومہ سب کے لئے پختگی کا سبب آفتاب نبوت ہی ہو یا دوسرے رنگ سے یہ حقیقت یوں ادا کی جائے گی کہ پختگی کا مطلب دین کی تکمیل ہے اور تکمیل کے معنی از سر نو ایجاد کے نہیں بلکہ ایجاد شدہ کو حد کمال تک پہنچانے کے ہیں پس وہ دین جو آدم سے چلا تھا اور تکمیل کی طرف درجہ بدرجہ بڑھ رہا تھا، اسکی تکمیل آخر کار حضرت خاتم النبیین علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی کہ خاتم کے کامل ترین علوم کے بغیر تکمیل وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پس آفتاب روحانی نے دین سابق کو اپنی جامعیت کبریٰ کے راستے سے بلحاظ اصول و فروع حد کمال کو پہنچایا، دلائل قاسرہ اور معجزات عظیم سے مضبوط اور پختہ فرمایا، نیز اپنے جامع اسوۂ حسنہ سے دین کے ان گوشوں کو جو بحالی تھے، پر کر کے دین کی ہر جہتی تکمیل فرمادی۔

ایوم اکملت لکم دینکم
 اتمت علیکم نعمتی و رضیت
 لکم الاسلام دیناً
 لے دین اسلام پسند کیا۔

پس پہلی صورت میں اباب دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم وجود پذیر نہیں ہو سکتی اور دوسری صورت میں نفس دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم کے ناممکن تھی۔

حکمت تربیت اور نسخ شراعی

پھر جیسے طلوع آفتاب کے بعد اُسے ایک جگہ ساکن نہیں رکھا گیا بلکہ متحرک بنایا گیا جو مشرق سے مغرب کی طرف چلتا رہتا ہے اور حرکت بھی مستقیم نہیں دُور می رکھی گئی کہ ایک دائرہ پر گھومتا ہے اور ایک جگہ سے چل کر وہیں پھر آ جاتا ہے، جہاں سے چلا تھا، پھر یہ حرکت بھی دفعی نہیں تدریجی رکھی گئی کہ چند منٹوں میں نہیں چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک دم

جھلانگ لگا کر مشرق سے خطِ استواء پر آجائے اور اس کے نکلنے ہی دن میں دھوپ کی وہی
 تیزی اور حدت و گرمی آجائے جو نصف النہار کے وقت ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ نصف النہار
 سے ایک ذقن بھر کر یکدم مغرب میں پہنچ جائے اور وہ نصف النہار کی روشنی و تیزی الگ
 رفع ہو کر ٹھنڈک پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ رات کے ٹھنڈے ہوئے اکدم طلوع
 کے وقت گرما جاتے اور استواء کے وقت کی انتہائی گرمی سے گرمائے ہوئے اچانک غروب
 سے یکدم ٹھنڈا جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ان میں اس دفعی اور اچانکی کی ٹھنڈک اور گرمی سے
 فساد مزاج پیدا ہو کر طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتیں اور اگر سرے سے آفتاب میں حرکت
 ہی نہ رکھی جاتی بلکہ وہ طلوع ہو کر ایک نقطہ پر کھڑا رہتا تو دنیا اس کی حدت و شدت سے
 تنگ آجاتی۔ ایسے اسے متحرک بھی رکھا اور حرکت میں سرعت اور تیزی کے بجائے تدریج
 رکھی۔ جسے عروج و نزول اور قرب و بعد سے مقید فرمادیا تاکہ تدریج کے ساتھ ساتھ کائنات
 ہر ہر کیفیت کے اثرات سے آہستہ آہستہ متاثر اور مستفید ہو اور ہر اگلی حالت پھلی حالت
 کو تدریج ختم کر کے اگلی کے لئے مزاجوں کو مستعد بناتی رہے۔ کیونکہ جب تک یہ پہلی حالت
 ختم نہ ہو جو مزاجوں کی رعایت سے رکھی گئی تھی۔ دوسری حالت کی استعداد نمایاں نہیں ہو سکتی۔
 ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے احوال میں بھی حق تعالیٰ نے ترقی رکھی ہے جو ہر
 وقت حرکت میں ہے جس میں روحانی احوال کے عروج و نزول اور شدت و خفت کی مختلف
 کیفیات نے اُبھرا بُھرا کر روحانی مزاجوں پر اپنے اپنے اثرات ڈالے اور مزاجوں کو ایک
 خاص انداز پر ترتیب دیا۔ ابتداء اسلام میں جو طلوع آفتاب کے مشابہ زمانہ ہے۔ آفتاب
 نبوت کی روشنی و صیہی اور ہلکی تھی جو طبیعتوں کے قریب تھی۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کی طبیعتیں
 ایک دم کمال دین کی تو گر نہیں ہو سکتی تھیں۔ نماز کی جو مکمل صورت آج ہے۔ وہ ابتداء اسلام
 میں نہ تھی۔ اس میں سلام و کلام سننا سنانا۔ ادھر ادھر دیکھنا۔ حرکت کر کے ادھر سے ادھر ہو
 جانا سب جائز تھا۔ کیونکہ حدیث العہد اور نو مسلم لوگ اچانک اسلامی نماز کی ساری پابندیاں
 عائد ہو جانے سے نماز ہی سے اکتا جاتے اور اُسے برداشت نہ کرتے۔ اس لئے جو
 جوں طبیعتیں سہتی گئیں۔ اسی طرح قیدیں عائد ہوتی گئیں۔ پہلے نقل و حرکت ممنوع ہوئی۔ پھر ادھر

اُدھر دیکھنے کی ممانعت ہوئی۔ پھر سلام و کلام کی ممانعت آئی اور حسب قول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔

فامرنا بالسکوت ولفہینا
پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور کلام
کرنے سے روک دیا گیا۔
عن الکلام

اگر ان ساری آزادوں سے اکدم روک دیا جاتا تو یہ ایسا ہی ہوتا۔ جیسے کہ سورج کی دفعی حرکت سے اکدم سردی سے گرمی میں پہنچا دیا جاتا۔ سو اس سے اگر مادی مزاج فاسد ہوتا تھا تو اس سے روحانی مزاج فاسد ہو جاتا۔ پس رفتہ رفتہ ابتدائی احکام منسوخ ہوتے گئے اور جدید احکام آئے تاکہ طبائع سے سہتی جائیں اور روحانی مزاجوں میں بتدریج ترقی و سکون کی کیفیات پیدا ہوں۔ یہی تدریجی نسخ احکام کی صورت کتوں کے ختم کرانے میں کی گئی۔ یہی تدریجی اور تیسری صورت شراب کے احکام میں رکھی گئی۔ یہی تدریجی صورت صوم عاشوراء اور ماہ رمضان کے روزوں کے لئے اختیار کی گئی۔ یہی تدریجی صورت وصیت و مواریت کے احکام میں رکھی گئی۔ یہی تدریجی صورت تشدد اور جہاد کے بارہ میں اختیار کی گئی۔ بغرض آفتاب نبوت کی شرعی نقل و حرکت سے بتدریج احکام آتے گئے اور مہذب و ترتیب اختیار کر کے پچھلے احکام کو ہر باب میں ختم کرتے گئے۔ اس حکمت تربیت کے ماتحت کہیں شریعت تساہل سے تشدد کی طرف چلی ہے۔ جیسے شراب بندی میں اور کہیں تشدد سے تساہل کی طرف چلی ہے۔ جیسے کتوں کے قتل کے بارہ میں مگر تدریج اور تساہل بہر دو صورت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ جو حکمت تربیت کی اساس و بنیاد ہے۔

پس آفتاب ہی کی تمثیل سے نسخ شرائع اور حکمت تربیت کا مشغلہ بھی آفتاب نبوت میں ثابت ہوا۔

مانسح من آیۃ او نمنہا نأت
ہم کسی آیت کا حکم جو منسوخ کر دیتے ہیں یا
بخیر منہا او مثلہا
اس آیت کو فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت
سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں۔

عموم فیضان اور عمومیت بعثت

پھر مادی آفتاب کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالئے کہ اس کا فیضان کسی فرد یا نوع یا جنس کی ساتھ خاص نہیں بلکہ اس آسمان کے نیچے کی کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی روشنی اور گرمی کے اثرات عام اور اس کی تدریر و تاثیر ہمہ گیر ہے۔ وہ جس طرح امیروں کے محلات اور شاہی قلعوں پر روشنی اور گرمی ڈالتا ہے۔ ایسے ہی غریبوں کی جھونپڑیوں اور فقیروں کی کیتھوں پر بھی ڈالتا ہے اور جس طرح انسانوں میں اس کی شعاعیں نفوذ کرتی ہیں جس سے بدن کی گہرائی تک متاثر ہوتی ہے۔ ایسے ہی حیوانات، نباتات اور جمادات بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتے۔ آفتاب چڑھنے پر شجر جھکنے لگتا ہے، پتھر لوہا لکڑی چمڑا اور کپڑا سب سے سوزش اور تپش کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ ندی، نالوں اور تالابوں میں پانی تک اپنی خشکی کھو بیٹھتا ہے اور گرم ہو جاتا ہے، فضا میں ہوا تک گرم ہوتی ہے اور خود فضا بھی گرم ہو جاتی ہے۔ بغرض کوئی چیز بھی آفتاب کا اثر لئے بغیر نہیں رہتی۔ بلکہ ان سب کی زندگی ہی اس حرارت عزیز سے قائم ہے جو آفتاب انہیں بخشتا ہے۔

پھر آفتاب کی یہ فیض رسانی یکساں بھی ہے۔ وہ ذرہ ذرہ پر چمکتا ہے اور سب کو یکساں اپنی نورانیت اور حرارت کا فیض پہنچاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی کو نور کم بخشنے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو گرمی کم دے اور کسی کو بہت۔ گویا کسی کی نسبت وہ سخی ہو اور کسی کی نسبت بخیل نہیں اس کی وہ ایک ہی گرمی اور روشنی ہے جو سب پر یکساں پڑتی ہے۔ لینے والے اگر اپنی صلاحیت و استعداد کے فرق سے لینے میں کمی زیادتی کریں یا آفتاب کے قرب و بعد کی وجہ سے کم زیادہ لیں تو یہ تفاوت خود ان کا ہے۔ اس سے آفتاب کی عطا وجود کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ سورج کا جو نور قبول کریگا۔ وہ کالا تو انہیں کر سکتا ہے۔ لوہا، پتھر دھوپ سے جتنا گرم ہو جاتا ہے۔ لکڑی اور کپڑا اتنے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ سب ان کی قابلیتوں اور قبول کا فرق ہے۔ آفتاب کی دین کا نہیں۔ غرض کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آفتاب کی روشنی اور گرمی کا فیض یکساں نہ پہنچ رہا ہو۔

ٹھیک اسی طرح آفتابِ نبوت اپنی علمی روشنی اور اخلاقی گزرمی کائنات کے سارے نفوس کو یکسانی کے ساتھ پہنچا رہا ہے۔ امیر و غریب، قرب و بعید یگانہ و بیگانہ، ملکی اور غیر ملکی۔ کالے اور گورے۔ آزاد اور غلام حتیٰ کہ مقرر اور منکر سب ہی پر ان کے انوار یکساں پڑ رہے ہیں اور اس کا پیغام ساری دنیا کے لئے عام ہے۔ اس نے جیسے غریبوں کو پکارا۔ ویسے ہی سلاطین عالم کے نام بھی فرامینِ نبوت بھیجے۔ وہ جیسے عوام اور سادہ لوگوں کیلئے راہنما ہے۔ ویسے ہی خواص اور فلسفیوں کے لئے بھی راہبر ہے۔ اعلان کر دیا گیا کہ

بِشْتِ الْحِیِّ الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

عمومیت کے ساتھ پکارا گیا کہ

قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ آپ فرما دیجئے۔ اے لوگو میں تم سب کا رسول ہو چکا۔

اللّٰهُ اِلٰکُمْ جَمِیْعًا اور اقوام و انبیاء کی نسبت سے اس عمومیت کو اور زیادہ واضح الفاظ میں کھول دیا

گیا کہ

كَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهِ خَاصَّةً پہلے نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے

وَبِشْتِ اِلٰی النَّاسِ كَافَّةً رہے اور میں سارے انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

جس سے عموم فیضان اور یکسانی ہدایت نمایاں ہے۔

ماننے والوں میں قبولیت کے مراتب

لیکن ماننے والوں میں ہر ایک اس سے اپنی اپنی قابلیت و صلاحیت کی حد تک مستفید ہوا۔ جس سے درجات و مراتب کا فرق پیدا ہوا اور اسی فرق کے سبب ماننے والوں میں کوئی صدیق و نازوق بنا اور کوئی ذوالنورین، کوئی اسد اللہ ہوا، اور کوئی سیف اللہ کوئی عیسیٰ صفت ہوا، اور کوئی ابراہیمی نقش پر کوئی محدث ہوا، اور کوئی محدث، کوئی حکیم بنا اور کوئی

فقیر کوئی صالح بنا اور کوئی شہید غرض اپنی اپنی صلاحیتوں کے فرق سے، جسے جو بننا تھا وہ اس عام روحانی سوزش و تپش اور نورانی آب و تاب سے بن گیا، عطار نور و حرارت میں کوئی فرق نہ تھا۔

منکروں کے تاثرات

پھر اس فیضان عام سے نہ صرف ماننے والے ہی اثر پذیر ہوئے بلکہ منکر اور کٹر سے کٹر معاند بھی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے آفتاب نبوت کے فیض سے محروم نہیں رہے کسی قوم نے اس دین سے تمدن کا فائدہ اٹھایا اور کسی نے مذہب کی اصلاح و ترمیم کا دنیا کی قوموں نے اپنے اپنے تمدنوں اور قومی و ملکی دستوروں میں آفتاب نبوت کی شعاعوں سے ترمیمیں کیں۔ تمدنی قوانین بدلے۔ مذہبی عقیدوں میں فرق پیدا ہوا۔ مشرک سے مشرک انسان بھی توحید کا نام لسنے لگے۔ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا، جو اندلس کی اسلامی تعلیمات کا اثر تھا۔ ہندوؤں میں سکھ اور آریہ ورت پیدا ہوا جس نے توحید کا نام لینا شروع کیا۔ لوہقر نے اندلسی یونیورسٹیوں کی اسلامی تعلیم سے یورپ کے تمدن میں انقلاب برپا کیا۔ منکر سے منکر قومیں بھی نبوت کی قوت قدسیہ کی قائل ہو گئیں۔ عیسائیوں نے اپنی ریاستوں کے دھارے بدل دیئے۔ شاہیت سے عوامیت آئی۔ شخصیت سے جمہوریت ہو گئی۔ تقریباً خواص رابطہ عوام کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ تشدد اور عدم تشدد کا فرق اور محل استعمال کھلا تشدد کی جنگ کے ساتھ ذہنی اور عصبی جنگ کے نقشے بھی بنے۔ مدنی زندگی کے ساتھ ملی زندگی بھی کمزور دنیا کا دستور بن کر رہی۔ حکمرانی کا عنوان لیڈی کا چولہ پہنکر رہا۔ غرض تمدنی قومیں ہوں یا مذہبی قومیں، سب کی سب آفتاب نبوت کی کرنوں اور شعاعوں سے درجہ بدرجہ متاثر ہو کر رہیں اور ان کے اندرون میں اس روحانی سورج کی تاثیر شعوری اور غیر شعوری طور پر گھس کر رہی۔ اگر یہ اقوام ان ہی اصولوں کو انقیاد و طاعت اور تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کرتیں تو دنیا کے ساتھ آخرت بھی اس نور سے منور ہو جاتی، جو اصل مقصود تھی۔ لیکن ان کا یہ تاثر بلا مرضی مجبوری سے ہوا اور انہوں نے ہوا کا عام رُخ دیکھ کر ان تبدیلیوں کے سوا چارہ کار نہ پایا تو

ان کی دنیا سطحی طور پر اس روشنی سے روشن اور اس گرمی سے گرم ہو گئی ہے۔ مگر آخرت کی تاریکی زائل نہ ہو سکی۔ تاہم ماننے والوں کی طرح نہ ماننے والے بھی آفتاب نبوت کے فیضان سے بے تعلق اور بے اثر نہ رہ سکے۔ جس کی تفصیلی مثالیں گزر چکی ہیں اور اس طرح یہ فیض عام پورے عالم بشریت پر چھا گیا۔ جیسے مادی سورج دنیا کے ہر ذرہ پر چمک جاتا ہے۔

غیر ذمی روح اشیاء پر آفتاب نبوت کا اثر

پھر یہ فیضان عام نہ صرف عالم بشریت ہی تک محدود رہا، بلکہ جمادات اور حیوان و جنات تک بھی اس صدائے عالم کے اثرات پہنچے۔ جیسے مادی آفتاب کی روشنی اور گرمی کا اثر ان تک پہنچتا ہے۔ کتکریاں دست مبارک میں آئیں تو تسبیح پڑھنے لگیں، کھجور کے سوکھے تنے کو کچھ دن آفتاب نبوت کی صحبت و معیت کی گرمی ملی تو وہ عشق نبوی سے اتنا گرہا کہ عارفین کا ملین کی طرح فراق نبوی میں گریہ و بکا کرنے لگا۔ حدیبیہ میں کیکر کے درخت سے آفتاب نبوت کا بدن مبارک قریب ہو گیا تو وہ شجرۃ الرضوان بن گیا جس کو رب العالمین نے اپنے کلام مبارک میں سراہا۔ شجر و حجر میں سلام کرنے اور نبوت کی شہادتیں دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جانور اپنی اپنی فریادیں لانے لگے اور پیغمبر کے حق فیصلہ سے مطمئن ہو ہو کر جانے لگے۔ اونٹوں نے آکر قدم مبارک پر سر رکھا۔ رورو کر اپنے مالک کے ظلم و ستم کی فریاد کی اور مراد پا گئے۔ بھیڑیوں نے صداقت نبوی کی شہادتیں دینی شروع کر دیں۔ قربانی کے لئے جانور خود اپنے آپ کو پیش کرنے لگے۔ جیکہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سواونٹ کی قربانی فرمائی تو ذبح ہونے کے لئے ہر ایک خود آگے بڑھتا اور گردن جھکا کر دست مبارک سے ذبح ہونے کیلئے پیش قدمی کر رہا تھا۔

ع سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

چلتا پانی تسبیح الہی کرنے لگا۔ سفید کپڑا تسبیح خداوندی میں لگ گیا۔ ہر میٹھنیاں تسبیح میں مصروف ہوئیں۔ چرند پرند اپنی اپنی زبان میں تسبیح پڑھنے لگے۔ جنات کے وفود مواعظ نبوی

کی فرمائش لیکر آنے لگے اور متاثر ہو کر اسلام کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بادلوں پر نگاہ پاک پڑی تو وہ سایہ گسٹری کی خدمات انجام دینے لگے اور سر مبارک کیلئے دھوپ میں چھتری بن گئے۔

مکان اور فضا میں آفتاب نبوت کے آثار

پھر نہ صرف اس جہان کے ایمان و اشخاص یعنی جہاد و نبات اور جن و حیوان ہی اس آفتاب روحانی سے روشن ہوئے بلکہ وہ مکان اور خلا بھی جس میں گھر اور گھر والے جاگزیں ہیں۔ آفتاب نبوت سے گرمائے غیرتہ رہے جن کے یہ اشخاص مکین اور باشندے ہیں پس جیسے مادی آفتاب سے فضا روشن اور گرم ہوتی تھی۔ ایسے ہی روحانی آفتاب سے بھی وہ معنوی روشنی اور گرمی حاصل کر رہی ہے جو عبادت الہی کی روشنی ہے۔ اولاً اس وجہ سے کہ جو بھی طاعت و عبادت کوئی ذمی روح یا غیر ذمی روح انجام دے گا۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی جگہ اور مکان ہی میں واقع ہوگی۔ لا مکان میں نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں مکان طرف عبادت اور وسیلہ طاعت بن جائے گا۔ اور سب جانتے ہیں کہ وسیلہ مقصود کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس لئے اگر عبادت مقدس فعل ہے اور ضرور ہے تو اس کے طرف کا مقدس ہونا بھی ضروری ہے۔ جیسے عطر اگر خوشبودار ہے اور بلاشبہ ہے تو اس کے شیشے اور کنسر کا خوشبودار ہو جانا بھی قدرتی ہے۔ اس دلیل سے مکان عبادت کا مقدس ہو جانا واضح ہو گیا۔ چنانچہ اس اصول پر شریعت نے مساجد کو خیر البقاع (ساری جگہوں میں پاکیزہ ترین جگہ) فرمایا وہ پاکیزہ ترین عمل یعنی عبادت کی جگہ ہے اور بازار کو شر البقاع (ساری جگہوں میں بدترین جگہ ہے) کہا کہ وہ عموماً دنگہ فساد اور جھگڑوں جیسے ناپاک عمل کی جگہ ہے۔ جس سے مکان کے خیر و شر ہونے کا معیار واضح ہو گیا کہ وہ عبادت ہے اور عبادت بلاشبہ آفتاب نبوت کا اثر ہے جس جس موضع میں عبادت اور اطاعت خداوندی ادا کی جائے گی۔ بلاشبہ اس موضع اور مکان کو بھی آفتاب نبوت سے متاثر کہا جائے گا۔ اس لئے واضح ہو گیا کہ مکین ہی نہیں خود مکان بھی آفتاب نبوت کی روشنی اور گرمی سے اثر پذیر ہے۔

پھر یہ مکان نہ صرف واسطہ عبادت ہونے کی وجہ سے مقدس بن گیا ہے بلکہ براہ راست

خود بھی عبادت گزار اور بلا واسطہ آفتاب نبوت سے یہ معنوی روشنی اور گرمی لئے رہا ہے۔ چنانچہ جس راستہ سے حضور گذر گئے، وہی مقدس بن گیا۔ جائے ولادت مقدس، جائے وفات مقدس، جائے دفن مقدس اور زیارت گاہ خلاق۔

بقامیکہ نشان کف پائے تو بود

سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہ بود

زمین کے گڑھوں اور قبروں تک سے قرآن خوانی کی آوازیں آنے لگیں۔ زمین کے جس خط کو کسی غلام نبوی سے بھی نسبت ہو گئی، وہ بھی مقدس بن گیا۔ زمین کے جس حصہ پر کسی بھی عبد صالح نے عبادت کا وظیفہ ادا کر لیا تو وہ خط سرکاری گواہ بن گیا اور قیامت کے دن اپنے عابد کے بارہ میں اس کی گواہی معتبر اور مقبول ہوگی۔ گویا عدالت و پارسانی جو گواہوں کے مخصوص اوصاف ہیں، اس خط کے نصب میں آگئے جو اس کے مقدس ہو جانے کی واضح دلیل ہے جس بیت کو صاحب نبوت سے دور کی بھی نسبت ہو گئی، وہی بیت اللہ (اللہ کے گھروں) میں شمار ہونے لگا۔ عالم کی ساری مسجدیں، ساری خانقاہیں، سارے مدارس سارے وہ ادارے جن میں خدائی احکام کی تنفیذ و اجراء عمل میں آئے، ساری مجالس و عظ و تذکیر سارے مقامات مذاکرہ علم و عمل ساری مقدس پہاڑیاں اور وادیاں جو کسی نہ کسی صاحب اہام، صاحب وحی کی طرف منسوب ہوں، درحالیکہ ہر صاحب وحی و اہام اور ہر صاحب کشف و منام خواہ وہ اگلوں میں ہو، پچھلوں میں، بالآخر خاتم النبیین کی طرف منسوب اور خاتم ہی کے فیض سے ستفیض ہے۔ ان نسبتوں کے سبب مقدس اور عبادت گزار شمار ہوں گے کہ انہیں کسی نہ کسی واسطہ سے آفتاب نبوت سے نسبت حاصل ہو گئی، حرم کعبہ، حرم مکہ، حرم مقدس، حرم مدینہ، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد خیف، مسجد نمرہ وغیرہ وغیرہ، پھر قبر مبارک میں وہ بقعہ جس میں جسم مبارک محفوظ ہے، وہ عرش سے بھی افضل ہے کہ اس سے جسم لطیف لگا ہوا ہے، پھر پہاڑوں کے سلسلہ میں جبل طور، جبل نور، جبل حراء، جبل ثور، جبل احد، وادی سینا، وادی آدم، دریاؤں میں یحون و یحیون اور نیل و فرات وغیرہ، کنوئیں میں بیزمزم اور مدینہ کے مشہور سات کنوئیں، بیر آریس، بیر خاتم، بیر بضاعتہ وغیرہ اور تمام

وہ مبارک خطے جن میں ان مقدسین کی کوئی نسبت لگی ہوئی ہے یا وہ ان کے نام لگے ہوئے ہیں پھر تمام وہ مشاہد و آثار اور عالم کے تمام مقامات مقدس اسی لئے مقدس ہوئے کہ انہیں آفتاب نبوت سے کوئی نسبت و مناسبت حاصل ہے پس کوئی مقام تو وہ ہے جسے شریعت نے نام لیکر صاحب نسبت کہا اور اس کا بالفعل مقدس ہونا خود متعین کیا۔ جیسے مقامات مذکورہ اور بعض وہ ہیں جنہیں نیک انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر طرف عبادت قرار دیا۔ یعنی جو انسان جہاں بھی عبادت کر لے وہ جگہ مقدس اور اس کے حق میں گواہ بن جائے گی اور چونکہ یہ صلاحیت ہر خطے میں ہر وقت ہے اس لئے گویا سارے جہان کے تمام خطوں کو بالقوت مقدس فرما دیا۔ اس حقیقت کو حدیث ذیل میں ارشاد فرمایا گیا کہ

جعلت لی الارض مسجداً مری لئلا ساری زمین جائے عبادت اور
وطہونرا ۛ ذریعہ پاکی بنا دی گئی ہے۔

اس صورت میں زمین کا کونسا خطہ باقی رہ جاتا ہے جو بالفعل یا بالقوہ بالخصوص یا بالعموم آفتاب نبوت کی روشنی اور گرمی سے بے تعلق کہا جائے۔ حاصل یہ کہ جہاں بھی آفتاب نبوت کی کوئی شعاع اور کرن پہنچ گئی وہی خطہ روشن اور گرم ہو گیا۔ بالواسطہ بھی اور بلا واسطہ بھی اور ظاہر ہے کہ مکان عالم کی ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ کوئی بھی مکانی شے اس کے گہرے سے باہر نکلی ہوئی نہیں اور جب وہ خود ہی کل کا کل آفتاب نبوت سے مستفید ہے تو اس کے احاطہ کی کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جو اس کے نورانی اثرات سے الگ یا بے تعلق رہ جائے؛ اس سے واضح ہو گیا کہ جس طرح مادی سورج کا حسی فیضان دنیا کے ہر خطے میں پہنچا ہوا ہے کہ مکان اور مکین کا کوئی فرد اس سے محروم نہیں اسی طرح اس روحانی سورج کا معنوی فیضان بھی ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے جس سے قضا اور مکان اور ان کے مکینوں کا کوئی فرد بچا ہوا نہیں ہے۔ البتہ بعض کو آفتاب نبوت نے خود اپنے انتخاب سے نام لے کر بالفعل نورانی کہا ہے اور بعض کو مطیع انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر بالقوہ نورانی بتلا دیا ہے۔

آفتاب نبوت کے اثرات زمانہ پر

پھر جس طرح مادی سورج کا فیضان مکان اور مکانی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ اسکی روشنی اور گرمی زمانہ کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے اسی طرح آفتاب نبوت کی فیض رسانی بھی مکان اور مکانیات سے گزر کر زمانہ اور زمانی اشیاء تک پھیلی ہوئی ہے جس دن پر نگاہ پڑ گئی وہی دن مقدس ہو گیا جس رات پر نگاہ جا پڑی وہی رات پاکیزہ ہو گئی۔ وہ ساعتیں وہ مہینے وہ سال، وہ حصہ زمانہ جو آفتاب نبوت کی کسی نسبت کے نیچے آ گیا، وہی مقدس مقبول اور مبارک بن گیا اور اسی طرح جو اشیاء زمانہ کے گھرے میں آ گئیں، وہ بھی مبارک ہو گئیں جس کی صورت یہ ہے کہ جس طرح کائنات کے ذرہ ذرہ کو مکان نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے اور کوئی جسمانی چیز ایسی نہیں جو مکان اور جگہ سے مستغنی ہو، بقول فلاسفہ کل جسم فلد حیث طبعی (ہر جسم کیلئے طبعی طور پر کوئی نہ کوئی جگہ قرار اور مکانی ظرف ضروری ہے) اسی طرح عالم کی کوئی شے زمانہ کے احاطہ سے بھی باہر نہیں ہو سکتی، یعنی زمانہ بھی مکان کی طرح کائنات کو گھرے ہوئے ہے، بلکہ زمانہ کا احاطہ مکان کے احاطہ سے بھی بڑھا ہوا ہے کیونکہ مکان تو صرف موجودات کو (جو پیدا ہو چکی ہے) اپنے احاطہ میں لے لئے ہوئے ہے، غیر موجود اشیاء یعنی معدومات سے مکان کا کوئی تعلق نہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ جو چیزیں ابھی پیدا نہیں ہوئیں، وہ فلاں مکان میں بند ہیں، لیکن زمانہ موجودات کے ساتھ ان معدومات کو بھی اپنے احاطہ میں لے لئے ہوئے ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، کیونکہ زمانہ فقط حال ہی کو نہیں کہتے جس میں موجود اشیاء سمائی ہوئی ہیں، بلکہ ماضی کو کہتے ہیں جس میں گندمی ہوئی اشیاء بھری ہوئی ہیں، ہر مرنے والی شے کو کہتے ہیں کہ وہ ماضی ہو گئی یعنی زمانہ ماضی میں چلی گئی، پھر زمانہ ہی کا حصہ مستقبل بھی ہے یعنی آئندہ زمانہ جس میں وہ چیزیں سمائی ہیں جو ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئیں، پس ماضی کے احاطہ میں پیدا ہو کر گزر جانے والی اشیاء گھری ہوئی ہیں اور مستقبل کے احاطہ میں ناپید شدہ اشیاء گھری ہوئی ہیں اور حال کے احاطہ میں صرف وہ اشیاء گھری ہوئی ہیں جو پیدا ہو کر موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ حال میں گھری ہوئی موجودات

سے گزری ہوئی ماضی کی اشیاء اور آنے والی مستقبل کی اشیاء کہیں زائد ہیں اس لئے زمانہ حال کی گرفت بہ نسبت ماضی و مستقبل کے بہت کم ہے اور سب جانتے ہیں کہ مکان کے احاطہ میں صرف وہی اشیاء آئی ہوئی ہیں جو حال کی گرفت میں ہیں۔ ماضی و مستقبل کی اشیاء سے مکان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے واضح ہو گیا کہ مکان کا احاطہ زمانہ کے احاطہ سے بہت پھوٹا اور مختصر ہے اور اس کے احاطہ میں بہ نسبت زمانہ کے احاطہ کے بہت کم چیزیں آئی ہوئی ہیں جو مکان اور زمانہ کے احاطوں میں فرق کی کھلی دلیل ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ کائنات کی وہ اشیاء جو مکان کی گرفت میں آئی ہوئی ہیں خود تو رات دن متحرک ہیں مگر مکان ساکن ہے اور ان اشیاء کو گھیرے ہوئے اپنے مقام پر ساکن اور غیر متحرک ٹھہرا ہوا ہے لیکن زمانہ ان اشیاء کو گھیرے ہوئے خود حرکت میں ہے اور زمانی اشیاء ساکن ہیں کوئی شے خود حرکت کر کے ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ میں نہیں جاتی بلکہ زمانہ خود ان پر سے گزرتا اور آتا جاتا رہتا ہے۔ ماضی گزر رہی اور پیچھے کو جا رہی ہے۔ گویا بعید ہو رہی ہے مستقبل آ رہا ہے اور اشیاء سے قریب ہوتا جا رہا ہے اور حال ان دونوں حالوں کے درمیان ایک موہوم سا نقطہ ہے جو دونوں طرف رخ کئے ہوئے ہے اس لئے قرآن حکیم نے زمانہ کو اشیاء سے قریب آتا ہوا اور بعید ہوتا ہوا کہا کہ زمانہ کو گویا متحرک کہا ہے اور اشیاء کو ساکن فرمایا۔

اقترب للناس حسابہود
 ہونی غفلة معرضون
 لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا مگر یہ
 لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔
 ایک جگہ فرمایا۔

اقتربت الساعة وانتق القمر
 اور زمین کو فراش فرمایا۔
 قیامت قریب آگئی اور قمر شق ہو گیا۔
 جو اس کے ساکن ہونے کی علامت ہے کیونکہ فراش حرکت نہیں کرتا۔ صاحب فراش اس پر حرکت کرتا ہے۔ بہر حال کائنات کا ذرہ زمانہ و مکان کی گرفت میں ہے مگر مکان ساکن ہے اور مکانی اشیاء متحرک ہیں اور زمانہ خود متحرک ہے اور زمانی اشیاء ساکن ہیں مگر اس فرق کے باوجود کہ زمانہ کا احاطہ مکان سے

وسیع تر اور متحرک تر ہے دونوں کا یہ قدر مشترک اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مکان و زمان کائنات کے ذرہ ذرہ کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں اب غور اس پر کیجئے کہ یہ زمان اور مکان باوجود اپنی بے انتہا احاطی وسعتوں کے دونوں کے دونوں مل کر خود آفتاب کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جیسے مکان اور مکانی اشیاء آفتاب سے منور اور گرم ہوتی ہیں۔ ایسے ہی زمانہ اور زمانی اشیاء بھی آفتاب سے گرم اور منور ہیں۔

زمانہ کا وجود آفتاب سے

بلکہ زمانہ مکان کی نسبت زیادہ سے زیادہ آفتاب کی گرفت میں ہے۔ کیونکہ مکان صرف آفتاب سے متاثر ہے آفتاب کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ لیکن زمانہ کا تو وجود ہی آفتاب سے ہے کیونکہ زمانہ نام ہی آفتاب کی گردش کا ہے۔ وہ طلوع غروب کرے تو رات دن بھی نہ بنیں اور رات دن نہ ہوں تو وقت اور زمانہ بھی نہ ہو۔ اس لئے زمانہ گویا آفتاب کی اولاد اور اس سے پیدا شدہ مولود نکلا تو زمانہ کا مکان کی بہ نسبت آفتاب سے زیادہ متاثر ہونا قدرتی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات اور دن گرم بھی ہوتے ہیں اور منور بھی، دن کا گرم اور روشن ہونا تو سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن رات کا موسم گرم یا میں گرم ہونا آخر آفتاب کے سوا کس کا اثر ہے اور پھر ستاروں کی روشنی سے کسی حد تک منور ہونا گویا ہر ستاروں کا اثر ہے لیکن خود ستاروں کی روشنی درحقیقت آفتاب کی روشنی ہے۔ فلاسفوں کے دعویٰ کے مطابق چاند ستارے بعض شفاف قسم کے اجسام ہیں جن میں خود روشنی نہیں۔ ان میں یہ چمک دمک آفتاب کے تعابلی سے آتی ہے۔ اس لئے رات کا ستاروں سے منور ہونا بالواسطہ سورج ہی سے منور ہونا ہے۔ پس دن بھی اور رات بھی سورج سے گرمی اور روشنی دونوں چیزیں لے رہے ہیں۔ اس لئے زمانہ بھی آفتاب کے فیض سے محروم نہیں کہ آفتاب ہی سے بتا بھی ہے اور اسی سے آثار بھی لیتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت بھی اپنا زمانہ خود بناتا ہے۔ وہاں مادی سورج کی حتی گردش سے حتی رات اور دن بنتے تھے کہ سورج نکل آیا تو دن ہو گیا سورج چھپ گیا تو رات

ہوگئی۔ ایسے سورج کی جھلکیاں رات اور دن کو بتاتی رہتی ہیں۔ یہاں روحانی سورج کی شرعی نقل و حرکت سے شرعی رات اور دن بنتے ہیں۔ جب یہ روحانی سورج طلوع کرتا ہے تو شرعی دن ہو جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور دونوں میں ہزاروں مصالح مخفی ہیں۔ دن سورج کے افادہ کا وقت ہے اور رات خود اس کے استفادہ کا جیسے مادی سورج رات میں نکاہوں سے اوجھل ہو کر نبضِ حدیثِ عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے اور طلوع کی اجازت چاہتا ہے۔ گویا سجدہ نیاز سے نیا نور اور نور کی نئی زندگی لے کر آتا ہے اور دن کو نور بخشنے کی تیاری کرتا ہے اور افادی شان سے طلوع کرتا ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت راتوں میں عام نکاہوں سے اوجھل ہو کر قیام لیل اور سجدہ ہائے عبودیت کے لئے عرش تک پہنچتا ہے اور آئندہ کے افادات کیلئے نئی روحانی قوتیں لگے پھر دن میں طلوع کرتا ہے تاکہ خلق اللہ کی رہنمائی فرمائے۔ فرق اتنا ہے کہ مادی سورج غروب ہو کر زمین کے نیچے جاتا ہے اور عرش کے پچھلے حصہ کے سامنے ہو کر بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ لیکن روحانی سورج غروب ہو کر زمین سے بالاتر بلکہ آسمانوں سے بھی گزر کر حتیٰ کہ عرش کے بالائی حصہ تک پہنچ کر رب العرش العظیم کو سجدہ کرتا ہے اور وہاں سے نئی سے نئی روحانی زندگی لیکر پھر عالم کی طرف لوٹتا ہے تو دن ہو جاتا ہے اور ان قوتوں سے افادہ کا وقت آ جاتا ہے۔ گویا دن اس کی اجتماعی اور جلوت کی زندگی کا ظہور ہے اور رات اس کی دل جمعی اور انفرادی یا خلوت کی زندگی کا ظہور ہے۔ بہر حال جیسے طلوع و غروب سے روحانی سورج شرعی دن اور رات بناتا ہے اور اس طرح روحانی آفتاب کا بنایا ہوا زمانہ بھی مادی آفتاب کے بنائے ہوئے زمانہ کے دوش بدوش قائم ہے۔

آفتاب نبوت کے ایام

اب اگر آپ مادی سورج کے بنائے ہوئے زمانہ پر غور کریں تو نظر آئیگا کہ وہ کل زمانہ جو سورج سے بنتا ہے۔ حقیقاً صوف دن اور رات راتیں ہیں۔ اس لئے پوری دنیا کی کل عمرات دن سات رات یعنی ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ البتہ یہ ہفتہ چونکہ لوٹ لوٹ کر بار بار آتا رہتا ہے،

تو اس کی تکرار کی حد تک دنیا اور دنیا کی قوموں اور دنیا کے بڑے بڑے حوادث کی عمریں دراز ہو جاتی ہیں اور ہزاروں برس کی کہلائی جاتی ہیں۔ مگر ان لمبی سے لمبی عمروں کا حاصل ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔

سات دن کا ہفتہ یوم السبت (شنبہ) سے شروع ہو کر یوم الجمعہ پر ختم ہو جاتا ہے اور یہی ہفتہ پورے دنیا کی اصل عمر ہے۔ گو مکرر ہوتا رہے اگر دنیا کی عمر یہ ہفتہ رکھنا منظور نہ ہوتی یا بالفاظ دیگر ہفتہ مہر سے زائد عمر ہوتی۔ سورج کو گردش دینے کے بجائے ایک سمت سے سیدھا چلا کر ہمیشہ آگے ہی کی طرف خط مستقیم پر دوڑاتے رہتے۔ وہ کبھی غروب نہ ہوتا اور مشرق و مغرب میں بار بار گھوم کر ایک ہی دائرہ میں چکر نہ کھاتا رہتا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں صرف ایک دن بتا جو ہزاروں سال کی برابر ہوتا اور اس سے رات کا واسطہ بیچ میں نہ آتا۔ مگر اس صورت میں وہ تمام تغیرات و حوادث اور ان کی بے انتہا مصالح و ہارات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے اول بدل میں پہاں میں فوت ہو جاتیں۔ زمانوں کی کوئی حد بند ہی نہ ہوتی۔ کوئی مدت معین نہ ہو سکتی، کوئی حساب نہ بن سکتا، نہ چینیے بنتے نہ سال نہ سنہ پیدا ہوتے نہ تاریخ اور اس طرح دنیا کی تاریخ ہی نہ بن سکتی، جس سے عبرتوں اور مصلحتوں کے سارے کارخانے درہم برہم ہو جاتے۔ ایسے سورج کی چال میں بجائے مستقیم حرکت کے دورانی حرکت اور گردش رکھی گئی جس سے طلوع و غروب پیدا ہوا۔ اس سے رات اور دن بنے تاکہ وہی رات اور دن لوٹ لوٹ کر زمانہ کی مقدار میں بناتے رہیں اور ان تمام مصالح کائنات کا وجود ہوتا ہے۔ جو اس لیل و نہار کے انقلاب سے وابستہ ہیں۔ نیز طبائع میں اس لیل و نہار کی تجدید سے تجدید پیدا ہوتا رہے تاکہ طبیعتیں روزانہ تازہ بتازہ اور نوبہ نوبہ کو سعی و عمل کے میدانوں میں دوڑتی رہیں اور عالم کے مصالح نمایاں ہوتے رہیں گو اس طریق سے عالم کی عمر کل ایک دن نکلتی ہے جو لوٹ لوٹ کر بار بار آسکتا ہے اور عالم کی عمر دراز ہو سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں حساب قائم کرنے اور حوادث کی عمریں متعین کرنے میں دشواریاں لاحق ہو جاتیں گویا سارے انسان ایک ہی دن کی پیدائش ہوتے ایک ہی دن موت کا ہوتا، ایک ہی دن شادی بیاہ کا ہوتا، ایک ہی دن عمر کے ہر حادثہ کا، تو امور زندگی میں تمیز کرنا ہی دشوار ہو جاتا، اس لئے دن اور رات کی سات

گردشیں رکھ کر عالم کی ہر ایک ہفتہ کر دی گئی اور سات ناموں کے سات دن نضدہ سے گئے اور ان کے تھوڑے سے مہینے متعین کئے۔ بارہ رخصتیں گئے تاکہ مہینوں کے ساتھ دنوں کا اور دونوں کے ہاتھ ساعتوں اور گھنٹوں کا تعین باسانی ممکن ہو جائے۔

شاید اس لئے قرآن حکیم نے دنیا کی تخلیق اور پیدائش کے سلسلے میں ایک دن کے بجائے سات دن کا ذکر کیا ہے۔ چھ کا صراحتہ اور ایک کا اشارہ فرمایا۔

ان ربکم اللہ الذی خلق السموات
والارض فی ستۃ ایام ثم استوی
علی العرش
بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے
آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر
عرش پر متمکن ہو گیا۔

اس آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ چھ دن کائنات کی تخلیق کے ہیں اور ایک دن استواء علی العرش کا ہے یوم الفراع کہنا چاہیے اور وہ ان چھ کے علاوہ ہی ہو سکتا ہے اور بعد ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ تخلیق عالم کے چھ دن ناقص اور ناتمام تو مراد ہو ہی نہیں سکتے کہ ستہ ایام کا لفظ مطلق رکھا گیا ہے اور مطلق سے فرد کمال ہی مراد ہوتا ہے اس لئے یہ چھ دن بلاشبہ کمال دن مراد ہوئے اور چھ دن کی تکمیل کے بعد جو وقت آئیگا اسے ہی ساتواں دن کہا جاویگا اور وہی استوار کا دن ہے اس لئے اس آیت سے دنیا کی تخلیق کے سلسلے میں مجموعہ عمل و فراع کے دن سات ہی نکلتے ہیں۔ چھ صراحتاً اور ایک کنایہ اور یہ ایک دن یقیناً چھ کی تکمیل کے بعد ہی کا دن ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ لفظ ثم اس چھ کی بعدیت کی واضح دلیل ہے تو تخلیق عالم اور اس سے فراع کی مجموعی مدت نص قرآنی کی روشنی میں وہی ایک ہفتہ ہو گیا۔ نیز احادیث میں جبکہ مخلوقات دنوں پر تقسیم کی گئی ہیں اور ان کی تخلیق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوئی تو چھ دن تو اس روایت سے ثابت ہوئے اور ایک دن یوم السبت کا ذکر صراحتہ دوسری حدیث میں اچھا ہے جس کا تذکرہ آگے آئیگا۔ سنے زمانہ کے سات ایام جس طرح آیت سے نکلے گو عدد داہی سہی اسماء سہی ایسے ہی احادیث سے بھی نکلے مگر تفصیلاً اور اسماء۔

ہفتہ دنیا پر اقوام عالم کا اجماع

پھر یہ ہفتہ دنیا کی مدت جیسے قرآنی صراحت، دلالت اور حدیث سے ثابت ہوتی ہے ایسے ہی اجماع اقوام سے بھی ثابت شدہ ہے جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اتفاق ہے یہود کے یہاں یوم السبت (شنبہ کا دن) واجب التعلیم اور یوم عید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوم الراحة ہے جس میں حق تعالیٰ نے تخلیق عالم سے فراغت پا کر راحت پائی یعنی اتوار کے دن سے شروع ہو کر جمعہ کے دن تخلیق عالم پوری ہوئی تو شنبہ کا دن یوم الراحة ہوا اور کسی مہم کام سے فارغ ہو کر جب راحت کی ساعتیں آتی ہیں تو وہ قدرتنا خوشی کی گھڑیاں ہی ہوتی ہیں۔ ایسے یہ دن خوشی کا بھی ہونا چاہیے اور عید و تہوار کا بھی جس سے ہفتہ کا ثبوت نص حدیث یہود کے یہاں نکلا۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (اتوار) کو واجب التکریم دن کہا اور عید مقرر کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن عالم کی تخلیق کا آغاز ہوا اور جن ساعتوں میں کسی امر مہم کا افتتاح کیا جاتا ہے تو وہ وقت خوشی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ امور مہمہ کے افتتاح کے وقت جلے کرتے ہیں، کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں تو تعمیر کے اس افتتاح پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کسی تعمیر کے مکمل ہونے پر جب اس کے استعمال کا آغاز کرتے ہیں تو عادتاً اس میں خوشیاں منائی جاتی ہیں ایسے جبکہ اتوار کا دن عالم کی تخلیق کے افتتاح کا دن تھا تو وہی دن یوم عید ہونا چاہیے۔ اس سے نصاریٰ کے یہاں بھی سات دن کا ثبوت ملا۔

مسلمانوں نے کہا کہ جمعہ کے دن تخلیق کائنات کی تکمیل ہوئی اور پورا عالم مکمل بن کر تیار ہو گیا۔ اور جن ساعتوں میں کوئی مہم حد کمال کو پہنچتی ہے تو وہ وقت بنائے والوں اور استعمال کرنے والوں کیلئے انتہائی خوشی کا ہوتا ہے۔ اس لئے جمعہ اس قابل ہے کہ اسے خوشی اور عید کا دن قرار دیا جائے اس سے بھی وہی سات دن ثابت ہوئے۔ رہا یہ کہ اس ہفتہ میں ایک دن ہر قوم کے یہاں خوشی اور عبادت کا دن ہے تو اس میں کسی قوم کا انتخاب کردہ دن خوشی کے لئے موزوں اور عبادت کے لئے مناسب ہے۔ سو غور کیا جائے تو شبے بنا کر فراغت و راحت کی ساعتوں کا پالینا کی تکمیل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ خود اپنی راحت و فراغت کی گھڑی سے تعلق رکھتا ہے اور

اسی راحت پر خوش ہو لینا شے کی تکمیل کی خوشی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک مستقل خوشی
 ہے جو نفس شے کے آغاز و انجام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ ایسے یہود کی خوشی درحقیقت
 تخلیق عالم کی تکمیل پر نہ ہوئی بلکہ اسے بنا کر فارغ ہو جانے پر ہوئی جو بنانے والے کی راحت
 کی خوشی ہے۔ ایسے شے پر خوشی کے دو ہی درجے نکلتے ہیں یا اس کا افتتاح یا اس کا
 اختتام یعنی یوم آغاز اور یوم تکمیل، ایسے نصاریٰ اور مسلمین کی خوشی درحقیقت عالم کی خلقت پر
 ہوئی نہ کہ اس سے فراغت پر کہ وہ تخلیق سے زائد ایک شے ہے۔ اس لئے اگر یہ خوشی عالم
 کی خلقت سے متعلق ہے اور بلاشبہ اس سے ہے تو معقول خوشی درحقیقت نصاریٰ و
 مسلمین ہی کی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن پھر ان دونوں خوشیوں میں اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی
 خوشی فطرت سے زیادہ قریب اور زیادہ مطابق ہے۔ کیونکہ کسی شے کے آغاز پر خوشی ضرور ہوتی
 ہے۔ مگر اس وقت خود شے کا وجود نہیں ہوتا یا کامل نہیں ہوتا اس لئے یہ خوشی اگر ہوتی ہے
 تو شے کے ارادہ پر ہوتی ہے نہ کہ خود شے پر کہ وہ ابھی ہے ہی نہیں بناں شے پر خوشی وہی ہو
 گی جو شے کے موجود ہو جانے پر ہوگی اور شے کا موجود کہلانا اس کی تکمیل پر ممکن ہے نہ کہ قبل
 از تکمیل۔ ایسے مکمل خوشی اور اقرب الفطرت خوشی مسلمانوں کی خوشی ثابت ہوتی ہے۔ جنہوں
 نے اس دن کو عید منیا جو تخلیق عالم کی تکمیل کا دن ہے یعنی یوم جمعہ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے
 کہ یوم جمعہ کو عید منلما اور خوشی کے ساتھ یوم عبادت ٹھیرانا منسار حد او مدی بھی تھا۔ کیونکہ حدیث
 صریح میں فرمایا گیا ہے کہ یوم جمعہ کے بارہ میں یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا منجانب اللہ امتحان
 لیا گیا کہ ہر ایک قوم ہفتہ میں ایک دن یوم عبادت مقرر کرے جو اس کی روحانی خوشی کا دن ہو۔
 یہود نے یوم السبت (شنبہ) مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم اللاحہ ہے۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (یکشنبہ)
 مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم الافتتاح ہے اور مسلمانوں نے یوم جمعہ مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم تکمیل ہے
 اور تکمیل ہی پر خوشی منائی جاتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے منافع دکھلانے کے قابل ہو جائے۔ ایسے
 شریعت اسلام میں عید الفطر کو خوشی کا دن رکھا گیا کہ روزوں کی تکمیل کی حد آخر ہے۔ عید الاضحیٰ خوشی
 کا دن رکھا گیا کہ مناسک حج کی تکمیل کی حد آخر ہے۔ ٹھیک اسی طرح یوم جمعہ کو یوم عید رکھا گیا کہ تخلیق
 عالم کی حد آخر کا دن تھا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا جمعہ کو یوم تکمیل ہونے کے عید منانا

مناقشہ شریعت کے مطابق تھا۔ چنانچہ اسے خود اہی شریعت نے قبول کر لیا اور شریعت بنادیا
 مہر حال جہاں اس سے ہر قوم میں ایک ایک دن یوم عید ثابت ہوا۔ وہیں ان کے یہاں ایام کی
 تعداد کا سات دن ہونا بھی ثابت ہوا اور واضح ہو گیا کہ زمانہ کی اصل مدت فی الحقیقت سات ہی
 دن ہے۔ جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اجماع ہے۔ پھر یہ ساتواں دن یعنی یوم استواء یا یوم الفراع
 بھی عالم ہی سے متعلق ہے۔ کیونکہ یہ استواء علی العرش تدبیر و تصرف کے لئے تھا۔ جس سے
 عالم کی بقا ہے۔ ایسے چھ دن اگر عالم کے حدود کی تکمیل کے لئے تھے تو ساتواں دن عالم کی
 بقا کی تدبیر کے لئے تھا۔ ایسے ساتواں دن بھی عالم کی تخلیق ہی سے متعلق تھا نہ کہ یوم الراحة
 تھا۔ جیسا کہ یہود کہتے ہیں کہ پس قطع نظر اس سے کہ راحت کے شائبوں سے حق تعالیٰ منزہ اور
 مقدس ہے۔ راحت طلبی واقعی کے بھی خلاف ہے یہ ساتواں دن اگر فراع تھا تو تخلیق عالم
 سے فراع کا تھا نہ کہ عالم سے فراع کا۔ اندر میں صورت جب عالم کی کل مدت سات دن ہوئی اور
 یہی مدت تخلیق عالم پر صرف ہوئی تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کل کا کل زمانہ تخلیق عالم پر صرف
 کر دیا گیا۔ ایسے اگر ہم مجموعہ عالم کی کل عمر ہی سات دن رکھیں اور اسی مدت کو پورا زمانہ کہیں تو بعید
 از قیاس نہیں ہو سکتا۔ فرق اتنا ہے کہ تخلیق عالم پر سات دن بلا تکرار کے گزرے، جس سے تخلیق
 کی مدت محدود رہی اور بقا عالم پر سات دن تکرار کے ساتھ گزرے ہیں۔ جس سے عالم کی
 عمر دراز ہو گئی ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اور کتنی دراز ہوگی۔ یہ بحث الگ ہے جس سے ہمارے
 موضوع کا کوئی تعلق نہیں کہ اس عالم کا ایک دن ہمارے اس عالم کے ہزار برس کے برابر ہے۔
 اور وہ ایک دن اس سورج کی گردش سے نہیں بنتا بلکہ کسی اور گردش سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ لیکن
 اس سے ہمارے اس دعویٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زمانہ کی کل مدت ایک ہفتہ ہے جو سات دن
 کا ہوتا ہے۔ خواہ دن بڑا ہو یا چھوٹا۔ مہر حال حاصل مدعا یہ نکلا کہ مادی رات دن مادی سورج بنا ہے
 اور اس کے طلوع و غروب سے زمانہ بنتا ہے جس کے کل سات دن اور سات لائیں ہیں۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت نے اپنے روحانی طلوع و غروب سے جو زمانہ بنایا وہ بھی سات
 دن اور سات راتوں کا ہے۔ یہی سات دن اور سات راتیں لوٹ لوٹ کر اسلام اور اس کے کاموں پر
 آئی رہتی ہیں جس سے اس کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور یہ سات دن اساسی اور بنیادی ہیں جس کے اسلام

کا کوئی نہ کوئی عظیم حادثہ اور فطری انقلاب متعلق ہے گویا ان ایام سے ایسے فطری حوادث اور واقعات متعلق ہیں جو اصولی طور پر دنیا میں لوٹ لوٹ کر آتے رہیں گے اور دنیا کے ہم امور کی تشکیل کرتے رہیں گے۔ ایسے یہ شرعی ایام کا ہفتہ نوعی طور پر کسی ایک قرن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکرار کے ساتھ اسلام کے ہر ہر قرن پر آنا سہے گا۔ سولے یوں بھوکہ آفتاب نبوت نے جب سے پہلا طلوع کیا جس کو ہم جہانی طلوع کہتے ہیں یعنی آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے اسلام کا پہلا دن بنا جسے ہم یوم ولادت کہیں گے پھر اس نے روحانی حیثیت سے طلوع کیا۔ (جیکہ آگے نبوت ملی) تو اسلام کا دوسرا دن بنا جسے ہم یوم البعث کہیں گے پھر اس نے روحانی پھیلاؤ کی حیثیت سے طلوع کیا جیکہ آپ نے قوم کو جمع کر کے پیغام سنایا اور اپنی نبوت کا اعلان کیا، تو یہ اسلام کا تیسرا دن بنا جسے ہم یوم الدعوت کہیں گے پھر آفتاب نبوت سے استوار اور تکین کی حیثیت سے طلوع کیا جس سے اس کی روشنی جاؤ کے ساتھ دلوں پر پڑ سکے (جیکہ آپ نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کو مستقر بنایا) تو اس سے اسلام کا چوتھا دن بنا جسے ہم یوم الهجرة کہیں گے پھر اس نے تشدد و مدافعت کی تیز روشنی کے ساتھ طلوع کیا۔ (جیکہ آپ کو قتال اور جنگ کی اجازت دی گئی) تو اس سے اسلام کا پانچواں دن بنا جسے ہم یوم القوت کہیں گے پھر اس نے ظہر و اقتدار کی چھت سے طلوع کیا۔ (جیکہ مکہ اور دوسرے لفظوں میں عرب آپ کے دست مبارک پر فتح ہوا) تو اس سے اسلام کا چھٹا دن بنا جسے ہم یوم الشکوت کہیں گے پھر اسکی تکمیل مقصد اور اختتام کار کی حیثیت سے طلوع کیا (جیکہ آپ پر یہ آیت کریمہ ایوم اکملت لکم دینکم و انزل ہونی) تو اس سے اسلام کا ساتواں دن بنا جسے ہم یوم الاکمال کہیں گے اور اسی کا نام یوم الوداع اور یوم الآخر بھی رکھا جاسکتا ہے۔ پس جس طرح مادی آفتاب نے سات دن بنائے۔ یوم السبت، یوم الأحد، یوم الاثنين، یوم الثلاثاء، یوم الأربعاء، یوم الخميس، یوم الجمعة؛ جو دنیا کی پوری عمر میں کہ وہی لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں اور دنیا اور اس کے حوادث کی عمر دراز ہوتی رہتی ہیں، ایسے ہی آفتاب روحانی نے بھی سات ہی دن بنائے۔ یوم الولادة، یوم البعث، یوم الدعوة، یوم الهجرة، یوم القوت، یوم الشکوت، یوم الاکمال؛ یہی سات دن اسلام اور اسلامی جہالت پر لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں جن سے اسلام کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور اس کی تاریخ بنتی رہتی ہے گویا تاریخ اپنے

کو دوہراتی رہتی ہے اور عالم کے حوادث باہم مشابہ اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے رنگ میں ہو پیدا ہوتے رہتے ہیں گو ہر دور میں رنگ ان کا جدا جدا ہو۔

یہاں سوال ہو گا کہ یوم ولادت لوٹ کر کہاں آتا ہے۔ ایسے ہی یوم بعثت اور یوم فتح مکہ یوم اکمال وغیرہ تو وہ ایام ہیں جو دور نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں یہ بعد کے قرون میں یکے لوٹ سکتے ہیں کہ ان کا تکرار تسلیم کیا جائے؟

جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ یہ ایام اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دور نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن اگر ان کی عمومی روح کو دیکھا جائے تو یہ ایام معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت کے ہر دور میں آئے اور آتے رہیں گے کیونکہ جسمانی ولادت شریفی کی روح مرکزی شخصیت کا تعین ہے جس سے اصلاح کا کام لیا جائے، روحانی ولادت (بعثت) کی روح نصب العین کا تعین ہے جسے عالم میں چلایا جائے۔ دعوت کی روح نصب العین کا اعلان ہے جس سے عالم کی اصلاح متعلق ہو، ہجرت کی روح مستقر اور فتنے سے دور مرکزی مقام کا تعین ہے جس سے نصب العین دلوں تک پہنچ سکے۔ قوت کی روح نصب العین کو طاقت ور بنانا ہے تاکہ دل اسکے سامنے جھک سکیں شوکت کی روح غلبہ و اقتدار ہے جس سے نصب العین کی مغلوب و مقہور ہو جائے، اکمال کی روح نصب العین کی تکمیل ہے جس سے کسی کو گریز کا موقع باقی نہ رہے اگر ان سات ایام کی مذکورہ ارواح اور اصول حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو گا کہ یہ ایام دور نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ بطفیل نبوت ہر قرن میں ہر ایام اور اجتماعی نصب العین کے لئے ان ہی اصول کی اہم الفاظ دیکھا نہیں ایام کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اگر کسی انحطاط کے دور میں خود پورے اسلام یا اس کے کسی دینی یا سیاسی شعبہ کو کسی تحریک کی صورت میں اٹھایا جائے گا تو کونئی مجدد و تجدید کے لئے کھڑا ہو تو اسے انہی سات مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ مرکزی شخصیت کا تعین، نصب العین کا تعین، نصب العین کی اشاعت، نصب العین کے لئے مرکزی مقام کا تعین، نصب العین کے لئے وسائل قوت کی فراہمی، نصب العین کے لئے حصول غلبہ و اقتدار، نصب العین کی علمی اور عملی تکمیل اور جبکہ یہی سات باتیں ان سات ایام کی اصولی روح ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصب العین کو ان سات دنوں سے گزرنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں مثلاً تجدید و احیائے دین کے لئے کونئی

مقدس شخصیت کھڑی ہو، وہ کام کو ابتدائی خاکہ سے شروع کرے پھر اس کی معنویت سمجھائے، پھر اس سے دینی انقلاب رونما ہو، پھر اس پر دل ٹھیریں اور مطمئن ہوں۔ پھر اس کا غلبہ ہو اور آخر کار مقصد کی تکمیل ہو کر مجدد کا کام ختم ہو جائے۔ اس صورت سے ایک مجدد کو بہر حال اس شرعی سے گزرنا پڑا۔ گویا وہ ایک دن پیدا ہوا۔ ایک دن نمایاں ہوا، ایک دن اس نے دعوت دی، ایک دن مستقر بنایا، ایک دن وسائل قوت مقصد فراہم کئے، ایک دن غلبہ حاصل کیا۔ اور ایک دن مقصد مکمل کر کے قوم کے ہاتھ میں دیدیا تو وہی سات دن ولادت بعثت دعوت ہجرت قوت فتح اور اکمال اس پر سے گزر گئے۔ پس اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ یہ ایام اپنی اصولی اور کلی حیثیت سے دور نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی کسی نصب العین کو تحریک کی صورت میں لایا جائے گا اور رجال کار کھڑے ہوں گے تو انہیں انہی سات دنوں سے گزرنا پڑے گا۔ اور یہی سات مرحلے کسی اصولی مہم کے آغاز و انجام اور ارتقاء کے لئے ضروری ہوں گے۔ اس لئے حاصل مدعا یہ نکل آیا کہ آفتاب نبوت نے بھی مادی آفتاب کی طرح اپنا زمانہ خود بنایا اور وہ بھی سات ہی دن کا ایک ہفتہ ہے۔ جو قیامت تک لوٹ کر آتا رہے گا جس سے اسلام اور اس کے کلی اور جزوی مقاصد کی تبلیغ و تحریک ان ایام سے گزرتی رہے گی اور اسلام کی عمر دراز ہوتی رہے گی۔ ورنہ اس کی اصلی عمر وہی سات دن ہیں جنہیں ہفتہ نبوت کہنا چاہیئے۔

آفتاب نبوت کی مقدس راتیں

ہاں پھر جیسے مادی آفتاب میں دنوں کے ساتھ راتوں کا آنا بھی حکمت و مصلحت تھا چنانچہ اس کے طلوع سے دن بنتے تھے اور غروب سے راتیں اور اس لئے طلوع و غروب کی منبریں رکھی گئیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کے بنائے ہوئے ہفتہ میں بھی دنوں کے ساتھ راتوں کا وجود عین حکمت و مصلحت تھا اور اس لئے یہاں بھی طلوع و غروب رکھا گیا تاکہ طلوع سے شرعی دن بنیں اور اس کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر شرعی راتیں نمایاں ہوں۔ پس جیسے تبصریح ہفتہ نبوی، مادی آفتاب غروب ہو کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور آنے والے دن کے لئے

طلوع کی اجازت چاہتا ہے، اسے اجازت ملتی ہے۔ اور وہ اس اذن و اجازت کی روشنی اور طاقت سے طلوع ہو کر عالم کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت بھی بارگاہِ خداوندی میں پہنچ کر روع و وجود، قیام و تشہد اور ذکر و فکر کے ذریعہ رب العرش سے کمالات ظاہر و باطن کا نور لمحہ بلغم ترقیات کے ساتھ حاصل کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ طلوع ہو کر دن بنا لے اور آئینوں کے درمیان حاصل کردہ نور سے عالم کو منور کرے۔ پس وہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور عرش کے مالک سے اجازت خواہی ہوتی ہے اور یہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور رب العرش سے آئندہ کی رفتار اور گرفتار کے بارہ میں اذن طلبی کی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ مادی سورج غروب کے وقت زمین کے نیچے جاتا ہے اور شاید عرش عظیم کے نچلے حصہ کے سامنے ہو کر سجدہ عبودیت بجالاتا ہے اور یہ روحانی سورج غروب کے وقت زمین ہی نہیں آسمانوں سے بھی بالا ہو کر عروج کرتا ہے اور عرش کے اوپر والے حصہ کے سامنے رب العرش کے آگے بھکتا ہے یعنی آپ کی روحانیت کو عروج ہوتا ہے اور وہ مخلوق سے منقطع ہو کر خالق میں محو اور مستغرق ہو جاتی ہے۔ مادی آفتاب کا عروج زمین کے دائرہ میں ہے اور روحانی آفتاب کا عروج آسمانوں کے دائرہ سے اوپر لامکان میں ہے۔ مادی سورج میں مادیات کی طرف آنا عروج اور عرشیات کی طرف جانا نزول ہے اور یہاں روحانیت کی طرف بڑھنا عروج اور مخلوقات کی طرف آنا نزول ہے۔ یعنی اپنے بلند و بالا مرتبہ سے فروتر ہو کر مخلوق میں ملنا اور اس کی اصلاح کرنا نیچے اترنا ہے اور چڑھنا نہیں ہے۔ بہر حال یہ غروب اور راتیں بنانا بھی نبوت کی مختلف شانوں کے لحاظ سے ضروری تھا۔ پس نبوت کے ایام آفتاب نبوت کی افادی شانوں کا ظہور ہیں جن میں وہ کائنات کو علم کی روشنی اور اخلاق کی گرمی پہنچاتا ہے اور نبوت کی راتیں آفتاب نبوت کی استفادی شانوں کا ظہور ہے جن میں علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حق تعالیٰ سے حاصل کر کے اس کے اونچے درجات خود طے کرتا ہے تاکہ افقِ انسانیت پر طلوع کر کے ساری کائنات کو علم و اخلاق سے چمکا دے۔

مگر جیسے مادی آفتاب کے غروب سے سات راتیں بنتی ہیں ایسے ہی روحانی آفتاب نے بھی نگاہوں سے عاجل ہو کر باغیبت کے مقام پر پہنچ کر ہفتہ نبوت کی سات ہی راتیں بنائیں جو

انفرادی ترقیات کے لئے ضروری تھیں پس آفتابِ نبوت کا ایک غروب تو دنیا سے رخصت ہو کر پردہ کر لینا ہے۔ وہ آخری اور انتہائی غروب ہے اور ایک جزوی غروب ہے جو حیاتِ ناسوتی میں پیش آتا ہے۔ سو اس کیفیت اس عالم سے غیبت یا عالمِ بالا کی طرف کمال توجہ ہے۔ جس کے معنی اس عالم سے جگانِ طور پر پردہ کر لینا ہے اور جیسے ہفتہ زمانہ کی ابتداءات سے ہوتی ہے اور دن اسی میں سے کھینچ کر نکال لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہفتہ نبوت کے زمانہ کی ابتدا بھی رات ہی سے ہوتی ہے جس میں سے دن نہ نکال کر اپنا روشن چہرہ دکھلاتا ہے پھر پھر آفتابِ نبوت کے ابتدائی طلوع (بعثت) سے پہلے جو رات آئی وہ ذاتِ نبوی کی پیغمبرانہ استعداد کی پہلی رات تھی جو چند راتوں کا مجموعہ ہے جس میں کثرتِ عبادت آپ کا جذبہ تھا۔ تختِ الیالی ذواتِ العددہ (آپ کئی راتوں میں عبادت میں منہمک اور مستغرق ہوئے) اور انہی سے آخر کار وہ سچے خوابوں کی رات آئی جس میں نبوت کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی اور جواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کے پو پھٹنے کی طرح واقعہ نہ کر سائے آجاتا۔ اے لیلۃ البدایہ کہنا چاہیے کیوں کہ اسی کے لئے حدیث اول مابدی۔ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لویا الصادقة (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی ہے) میں بدایہ اور اولیت کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے جس سے بدایہ کا لفظ لیا گیا۔ اس رات کے بعد آفتابِ نبوت طلوع ہو گیا اور شریعت کا پہلا دن نکلا۔

اس کے بعد آفتاب ہو کر عالمِ غیب کی طرف بڑھا تو وہ رات آئی جس میں آفتابِ نبوت میں اس مشاہدہ کا نور بھرا گیا کہ وحی الہی کا مجموعہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر لایا جا رہا ہے۔ اسکے جلو میں ملائکہ کی مقدس جماعتیں نازل ہو رہی ہیں اور عالمِ غیب کی برکتیں سمٹ سمٹ کر قلب مبارک پر اتر رہی ہیں۔ اسی رات کا نام لیلۃ القدر ہے۔

پھر آفتابِ نبوت نے ایک اور غروب کیا تو وہ رات آئی جس میں ایک اور مشاہدہ کا نور آفتابِ نبوت میں بھرا گیا اور وہ یہ کہ حوادثِ عالم کی حدود اور مقدرات میں متعین ہو رہی ہیں۔ عمریں رزق اور مخلوق کے تقدیر ہی حصے مشخص کئے جا رہے ہیں اور دفترِ قضاء و قدر میں مادی اور روحانی نظاموں کے خاکے بن بن کر ملائے اعلیٰ میں پہنچ رہے ہیں۔ اس رات کا نام لیلۃ البراءة ہے۔

پھر آفتاب نبوت کا ایک اور غروب ہوا اور وہ رات آئی جس میں اجتماعی امور کی عظیم استعداد کا نور آپ میں بھرا گیا اور اس کی مرکزیت کی قوتوں کا مشابہ قلب صافی میں ڈالا گیا تاکہ حج کے دنوں میں اس اجتماعیت کبریٰ کا ظہور ہو۔ اس رات کا نام لیلة العرفہ ہے۔

پھر یہ روحانی سورج ایک دفعہ اور غروب ہو کر عالم غیب میں پہنچا تو وہ رات آئی جس میں ان ساری روحانی قوتوں کی تجدید اور بار بار کی تقویت سے ان کو قومی ترہوتے رہنے کی طاقت عطا کی گئی۔ اس رات کا نام لیلة الجمعة ہے۔

پھر آفتاب نبوت نے ایک اور غروب کیا جس میں ان تمام عطا کردہ روحانی اور مادی نظاموں کے مخالف فتنوں کے مشابہ کی قوت عطا کی گئی تاکہ نظام کے منافی امور کے دفاع کی قوت ذہن میں قائم ہو۔ اس رات کا نام لیلة الفتن ہے جس کے بارے میں حدیث میں اشارہ کیا گیا۔ ماذا انزل اللیة من الفتن ایقظوا صواحب الحجر رب کاسیة فی الدنیا عاریة فی الاخرة الخ (آج کی رات کتنے فتنے نازل ہوتے نظر آ رہے ہیں اے حجروں کے رہنے والیوں (ازواج مطہرات) جاگو اور اطاعت و عبادت میں لگو۔ لباس و زینت کی نمائشوں میں مت الجھو) دنیا میں بہت سی پھینٹے اور ٹھنٹے والیاں آخرت میں تنگی ہوں گی۔

پھر آفتاب جہاننا نبوت نے ایک اور غروب کیا اور وہ رات آئی جس میں اس آفتاب کی گردشوں کے تمام عروجی مقامات دکھلا کر بالآخر نور مطلق کے عالم میں مستغرق ہو نیکاشرف دیا گیا جس میں نور نبوت اپنی اتہمائی شدت و قوت پر پہنچ گیا اور نورانیت کا وہ مقام رفیع سامنے لے آیا گیا جس تک اگلوں اور پھلوں میں سے کسی تارے کی پہنچ نہ ہو سکی تھی اور خصوصیت سے آپ کو عبودیت کے مقامات طے کر کے عبداللہ کا رفیع المنزلت خطاب بھی عطا کر دیا گیا اور آخر کار ہر قسم کی روحانی، اخلاقی اور سیاسی نظاموں کا وہ خاکہ دکھلا دیا گیا جس کے مطابق زمین پر اس آفتاب نبوت کی روشنی میں ایک نظام صالح برپا کرنا منظور تھا۔ اسی رات کا نام لیلة الاسراء اور لیلة المعراج ہے۔ اسے ہم لیلة النہایۃ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں قربات نبوت کو اتہام تک پہنچا دیا گیا۔ یہ ساتوں راتیں نبوت کے ساتوں دنوں کی ساتھ لازم ملازم ہیں اور جس طرح ایام نبوت لوٹ لوٹ کر ہر دور میں آئے اور آتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی یہ راتیں بھی ہفتہ نبوت کی تکمیل کے لئے مکرر

کرا آتی رہتی ناگزیر ہیں کیونکہ یہ رائیں گواہی سطح کے لحاظ سے دور نبوت کے ساتھ مخصوص نظر
 آتی ہیں لیکن اپنی اصولی روح اور عمومی مفاد کے لحاظ سے وہ اسلام کے ہر دور اور ہر دور کے
 ہر مفاد کے لئے عام ہیں کیونکہ لیلۃ البدایۃ کی روح ذہنی استعداد کی تکمیل ہے۔ لیلۃ القدر کی روح
 ذہنی استعداد کا انبساط اور رگ و پے میں اس کا اثر جانا ہے۔ لیلۃ البراءۃ کی روح حوادث عالم
 کے اندازوں سے ذہنی ہم آہنگی ہے۔ لیلۃ العرفۃ کی روح ان حوادث کی اجتماعی شانوں کی ذہنی
 نشینی ہے۔ لیلۃ الجمعہ کی روح ان ذہنی قوتوں کی تجدید ہے۔ لیلۃ الفتن کی روح اشارہ راہ کے
 فتنوں اور مواقع کے دفعیہ اور سد باب کے طریقوں کو ذہن آشنا بنانا ہے اور لیلۃ المعراج کی
 روح تقرب الی اللہ کے اہمائی مقامات سے روحانی اور ذہنی شیفتگی اور توجہ الی الخلق کے مقامات
 سے قلبی وابستگی کی تکمیل ہے ظاہر ہے کہ ہر زعم و قائد اور ہر مصلح و مناد کو اپنی قائدانہ زندگی اور اپنی
 ذہنی پختگی کیلئے ان ساتوں مرحلوں سے گزرنا طبعی ہے جس کے بغیر چارہ کار نہیں کہ وہ اولاً اپنی ذہنی
 قوتوں کو میسے تاکہ جو اصولی خاکہ دنیا کے سامنے لائے۔ وہ منضبط اور مرتب ہو اور اس کی تاثیر
 مضبوط ہو جو صحیح ترتیب ہی سے مکمل ہوتی ہے پھر ان میں ذہنی انبساط پیدا کرے جس سے
 تفصیلی پروگرام بنے پھر دنیا کے واقعات کو سامنے لائے تاکہ نفسیات کے مطابق کام آگے
 بڑھے پھر اجتماعی رنگ کو سمجھے کہ صحیح معاشرہ بنا سکے پھر ہمہ وقت اپنی ذہنی قوتوں کو بار بار تازہ
 بنا کر رہے کہ اس کے عمل میں عزم و ثبات پیدا ہو پھر اپنی فریادگشتوں پر کڑی نظر رکھے تاکہ
 مخاطبوں کو حرف گیری کا موقع نہ ملے اور کام میں اٹکاؤ پیدا نہ ہو پھر اپنی ذہنی قوتوں کی تکمیل کی طرف
 بھی ہمہ تن متوجہ رہے کہ دوسروں کے بنانے میں خود اپنے اندر کسی بگاڑ کا اندیشہ نہ رہے
 اور جبکہ یہ حقیقتیں ہی ان سات راتوں کی روح ہیں جن سے کسی مصلح و مناد کو چارہ کار نہیں تو اس کا
 قدرتی نتیجہ ہی نکلتا ہے کہ یہ سات راتیں ہر مصلح ہر مبلغ ہر قائد اور ہر لیڈر پر فطرۃً گذرنی ضروری ہیں
 ورنہ کار اصلاح پورا نہیں ہو سکتا پس شرعی دنوں کی طرح یہ شرعی راتیں بھی لوٹ لوٹ کر قیامت
 تک آتی رہیں گی اور ہفتہ نبوت اپنے دن رات سمیت حرکت اور تکرار میں رہے گا جس سے واضح
 ہو گیا کہ جس طرح مادی آفتاب نے اپنی گردش سے ایک ہفتہ بنایا جو پورے عالم کی عمر تھا جسے ہفتہ
 دنیا کہنا چاہیے اسی طرح آفتاب روحانی نے بھی اپنی تشریحی نقل و حرکت سے ایک ہفتہ بنایا جو

پورے اسلام کی عمر تھا جسے ہفتہ نبوت یا اس کی اندرونی عمومیت کی جہت سے اُسے ہفتہ اسلام کہا جاتا ہے۔ ہفتہ دنیا کے تکرار سے دنیا کی عمر دراز ہوتی ہے اور اس ہفتہ اسلام کے تکرار سے اسلام کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ اس سے معاشی زندگی مکمل ہوتی ہے اور اُس سے معاشی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

نظام زمانی

ہاں پھر جبکہ آفتاب نبوت کے بنائے یہ ایام انہی مادی ایام پر منطبق ہیں یہ نہیں کہ آفتاب نبوت نے کوئی زمانہ اس زمانہ سے الگ کسی اور عالم میں بنایا ہے بلکہ انہی ایام کا رخ پھر کر انہیں مادی سے روحانی کر دیا ہے اور جہاں بھی آفتاب نبوت کی نسبت ان ایام اور ان کی راتوں میں لگتی گئی ہے وہی مقدس اور مقبول ہوتے گئے ہیں نیز جن جن اوقات کو آفتاب نبوت نے اپنے روشن اعمال و وظائف کا ظرف بنایا ہے وہی پاک اور مطہر ہوتے چلے گئے ہیں۔ ایسے یہ ہفتہ نبوت تو ایک کل زمانہ ہے جو پورے مادی زمانہ پر حاوی ہے یعنی جیسے مادی آفتاب کا بنایا ہوا کل زمانہ ہے جس میں وقت کی لاکھوں کروڑوں ساعتیں آئی ہوتی ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا یہ بنایا ہوا اسلام کا ہفتہ کل زمانہ ہے جس میں کروڑوں ایمانی دن اور مقبول ساعتیں لاکھوں ایام اور ہزار ہا مہینے اور سال شامل ہیں جس سے واضح ہوا کہ مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب کا بھی ایک نظام ہے کہ اس ہفتہ اسلام میں اپنے اپنے محل اور موقع پر ضمنی رات اور دن آتے رہتے ہیں۔ مہینے اور سال شروع اور ختم ہوتے رہتے ہیں، ساعتیں اور دقیقے اپنی اپنی جگہ وضع ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح کل زمانہ ہی نہیں بلکہ اس کے ضمن میں جزوی اوقات بھی اس نظام کے تحت مقدس ہوتے گئے ہیں اور انجام کار آفتاب نبوت نے اس مادی آفتاب کے پورے ہی زمانہ پر قبضہ کر کے اُسے اپنے نظام میں لے لیا ہے۔ مثلاً کہیں تو آفتاب نبوت نے اپنے وظائف کے لئے نظام شمسی کو اپنایا ہے جو بلا واسطہ مادی آفتاب کا قائم کیا ہوا نظام ہے اور کہیں نظام قمری کو اختیار کیا ہے جو بلا واسطہ مادی آفتاب کا برپا کیا ہوا نظام ہے۔ مثلاً لیل و نہاری یعنی رات و دن کی عبادتوں میں جن میں گھنٹے اور منٹ صرف ہوتے ہیں۔ آفتاب نبوت نے نظام شمسی کو معتبر قرار دیا تو سورج کے حسی نظام میں اپنا روحانی اور معنوی نظام داخل کر کے اُسے

اپنا ایسا ہے۔ جیسے نمازوں کے اوقات کا حساب آفتاب کی نقل و حرکت سے متعلق ہے بعض نمازوں کے اوقات اس کے طلوع و غروب سے متعلق ہیں۔ جیسے فجر و مغرب، بعض کا تعلق اس کی مقدار حرکت سے ہے۔ جیسے ظہر و عصر بعض کا تعلق اس کے آنا سے ہے جیسے عشا کہ غروب شفق سے اس کا وقت آتا ہے یا اسی طرح صبح و شام کے اذکار نظام شمسی سے ہی متعلق ہیں۔ جیسے تسبیحات صبح و شام کہ یہ اوقات ذکر و نماز کا وقت ہو جانے سے مقدس بن گئے ہیں اور زمانہ کا ایک بڑا حصہ آفتاب روحانی کے نظام میں داخل ہو گیا۔

ادھر اسی نظام کے تحت ماہ و سال کی عبادتوں میں نظام قمری کا اعتبار کیا ہے جو بالواسطہ سورج ہی کا نظام ہے کیونکہ چاند میں سورج ہی کا نور کام کرتا ہے۔ چنانچہ حج کے مہینوں کا تعین یعنی شوال، ذی قعدہ اور عشرہ ذی الحجہ (تقریباً ڈھائی ماہ) وجوب زکوٰۃ کے لئے بارہ ماہ روزوں کے ایام کا ایک ماہ یا چلہ کشتی مثلاً اربعین موسمی کا سوا ماہ یا مدت ایلا کے چار ماہ یا عدت طلاق کے تین حیض گویا تین ماہ یا عدت وفات زوج کے چار ماہ دس دن لیکر آفتاب نبوت نے زمانہ کے ایک اور عظیم حصہ کو گھیر لیا ہے۔

پھر اسی نظام روحانی کے ماتحت مخصوص عبادتوں کے مخصوص ایام جیسے اخیر عشرہ رمضان کی دس راتیں یا اول عشرہ ذی الحجہ کے دس دن یا دوسرے عشرہ ذی الحجہ کے ابتدائی تین دن جنہیں ایام تشریفی کہتے ہیں یا ہر ہفتہ کے پیر اور جمعرات کا دن جن میں بنی آدم کے اعمال اور پرچہ چھائے جاتے ہیں یا ایام جمعہ کہ انہیں نظام قمری سے لیکر نظام روحانی میں شامل کر لیا گیا اور زمانہ کے ایک اور حصہ پر آفتاب نبوت کا قبضہ اور نظام قائم ہو گیا۔

پھر اسی روحانی نظام کے ماتحت وقت کی بہت سی ساعتیں اور گھنٹیاں ادھر لے لی گئیں۔ جیسے ساعت شب قدر ساعت جمعہ اور ہر رات دن میں ایک ساعت جس میں قبولیت دعا کا وعدہ دیا گیا ہے یا نمازوں کی جماعت کھڑے ہونے کی گھنٹی یا جہاد شروع کرنے اور یلغار کر کے بڑھنے کی ساعت یا دو مسلمانوں کے محبت سے ملنے اور مصافحہ کرنے کی ساعت یا تہجد میں اٹھنے اور نماز پڑھنے کی ساعت جن میں حق تعالیٰ نے اپنی خوشی اور بعض ساعتوں میں اپنی غمی کی خبر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے اور ایام اور گھنٹے اور بعض ساعتیں محض ایسے مقدس بن گئے کہ

وہ مختلف عبادتوں کیلئے بطور نظر کے لئے گئے ہیں اور اس طرح زمانہ کے ایک اور بڑے حصہ پر آفتابِ نبوت کا نظام قائم ہو گیا اور یہ اوقات اس کے اوقات کہلائے گویا مادی چاند سورج کے نظام کی ساتھ ساتھ ایک مستقل اور متوازی نظام آفتابِ روحانی کا بھی اس میں سمویا گیا ہے۔ پھر اسی روحانی نظام اوقات کے تحت آفتابِ روحانی نے بعض ایسے مقبول اوقات کی بھی اطلاع دی ہے جو کسی ایک مقررہ ساعت میں نہیں آتے اور متعین بھی نہیں ہیں مگر ہر ساعت میں ان کے آنے کا احتمال تیار کر ایک حد تک پورے ہی زمانہ کو مقدس بنا دیا ہے جیسا کہ حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ

الا ان لربكوفى ايام دهر کم
 نفعات الافتعروا لها
 اگاه ہو کہ تمہارے ان رات دن کے اوقات
 میں تمہارے پروردگار کی طرف سے مقبولیت
 کی کچھ ہوا میں چلتی ہیں۔ دیکھو ان کی جستجو میں لگے رہو اور انہیں ڈھونڈھتی
 رہو۔ (ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت سے وہ مقبول گھڑیاں نکل جائیں اور
 تم محروم کے محروم رہ جاؤ)۔

اس حدیث نے زمانہ کی ہر ساعت میں عبادت کے سبب تقدس اور مقبولیت کا
 احتمال پیدا کر کے گویا سارے زمانہ ہی کو روحانی نظام کے تحت میں لے لیا اور مقدس بنا دیا ہے
 اور ظاہر ہے کہ عبادت آفتابِ نبوت سے کنکشن کا ثمرہ ہے۔ ایسے یہ پورا زمانہ عبادت کا ظرف
 ہو جانے کی وجہ سے آفتابِ نبوت کا بنایا ہوا زمانہ کہلائیگا اور اس کا ہو جائیگا بلکہ عملی طور پر دیکھا
 جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لمحہ اور ہر منٹ ذکر و طاعت میں مصروف رہتا تھا
 یعنی آپ نے اپنی سیرت پاک سے کل زمانہ کو عملاً مقدس بنا کر دکھا دیا۔ چنانچہ ارشادِ حدیث
 ہے کہ

کان یدکو اللہ علی کل احیاند
 اور فرمایا۔
 آپ ہر لمحہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔

کان دائم الفکرۃ حزیناً
 آپ تمام اوقات شکر اور غمگین سے رہتے
 تھے (ضعف خداوندی اور فکر آخرت میں)

ہر حال زمانہ کے یہ وہ حصے ہیں جو شریعت نے خود اپنے انتخاب اور اپنے اختیار سے اپنے نظام میں مل کر اپنے لئے خاص کر لئے، خواہ تعین کے ساتھ یا بلا تعین عمومی احتمال کے ساتھ لیکن اسی کے ساتھ وقت کے وہ طویل و عرض حصے جو شریعت نے تخصیص کے ساتھ خود منتخب نہیں کئے۔ ز تعین خاص سے ز احتمال عمومی سے بلکہ ان میں نبی آدم کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے انہیں عبادت و طاعت کے لئے بطور ظرف کے منتخب کر سکتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان اوقات میں بھی روحانی نظام میں شامل ہو جانے اور مقدس بن جانے کی صلاحیت ہے مگر وہ عباد صالحین کے انتخاب و اعمال سے ظاہر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ان مقدس وظائف سے انہیں معمور کر لیں۔ اس میں نوافل، تلاوت، اذکار، جہاد، ہجرت نیز اخلاقی قدروں کا استعمال اور ساری ہی اختیاری طاعات آجاتی ہیں جنہیں انسان ان غیر مقررہ اوقات میں باذن خداوندی اپنے اختیار سے خود بھی مقدس اور مقبول بنا سکتا ہے اور اس طرح زمانہ کا ایک اور بڑا حصہ نظام روحانی کے تحت میں آجاتا ہے اور اس طرح تقریباً کل زمانہ بالفعل اور بالقوت عباداتی افعال کا ظرف بن جائے کیونکہ سے مقدس اور آفتاب روحانی کے نظام میں شامل ہو جانے کی وجہ سے پاک اور مقبول ہو جاتا ہے جس میں کچھ عبادتیں یا شریعت انجام دہی جاتی ہیں اور کچھ باذن شریعت بندہ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے۔ ایسے زمانہ کی ہر ساعت طرف عبادت بن جانے کے سبب خواہ وہ بالقوت بنے یا بالفعل اور بانتخاب شرعی بنے بانتخاب عباد مقدس بن کر آفتاب نبوت کی ساعت ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ ساری گفتگو عبادات میں تھی کہ وہ جس زمان و مکان میں واقع ہوتی ہیں۔ اس زمانہ اور مکان کو ظرف عبادت ہو جانے کی وجہ سے مقدس بنا دیتی ہیں اور اس طرح وقت کا ایک عظیم حصہ آفتاب روحانی کے نظام میں شامل ہو جاتا ہے لیکن انسان کے ساتھ ایک عبادت ہی تو نہیں عبادات اور معاشرت کے افعال کا بھی ایک عظیم لشکر لگا ہوا ہے جسے کھانا پینا، سونا، جاگنا، انا، چلنا، پھرا، پہننا، اوڑھنا، لینا، دینا، ملنا، جلنا، ہنسنا، بولنا، رہن، بہن، محبت، عداوت، دوستی، دشمنی، صلح، جنگ، معیشتہ و معاشرت وغیرہ اور ان میں بھی انسانی زندگی کے وقت کا ایک بڑا حصہ صرف ہوتا ہے جو یقیناً عبادت میں مصروف نہیں ہوتا اور ایسے بظاہر آفتاب نبوت کے اثرات سے محروم

رہ جانے کے سبب بدستور غیر مقدس رہ جاتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس میں بھی آفتاب نبوت کے زمانہ کا وہی شرعی نظام سمایا ہوا ہے اور وہ اس طرح کہ گویا افعال فی نفسہ عبادت نہیں مگر اسلاک نے انہیں بھی حسن نیت اخلاص اور اتباع سنت کے راستے سے عبادت بنا دیا ہے۔ ایسے جو شخص بھی شرعی نیت سے انہیں انجام دے گا۔ وہ عبادت بن جائیں گے اور زمانہ کے جس حصہ میں بطور عبادت واقع ہوں گے۔ اسی کو مثل شرعی اوقات کے مقدس اور مقبول بنا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد عمر کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں بچتا کہ وہ اس روحانی نظام سے باہر رہ جائے اور آفتاب نبوت کے تعلق سے بے نیاز یا محروم رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جس طرح مادی آفتاب کا نظام تنویر و وضو فاشانی پورے زمانہ پر حاوی ہے۔ ایسے آفتاب نبوت کا نظام روحانی بھی پورے زمانہ پر پھیلایا ہوا ہے۔ وہاں مادی سورج کی ٹکونی نقل و حرکت سے حتیٰ نور کا نظام بنتا ہے۔ اور یہاں روحانی سورج کی تشریحی نقل و حرکت سے معنوی نور کا نظام بنتا ہے اور جس طرح وہ نظام انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ اسی طرح یہ نظام بھی اس کی پوری زندگی پر پھیلایا ہوا ہے۔

آفتاب نبوت کے بنائے ہوئے زمانہ سے موسموں کا ظہور

پھر جیسے آفتاب کی چال سے دن اور رات بنتے ہیں۔ ایسے ہی اس چال کی مختلف وضعوں اور ہیئتوں سے موسموں اور فصلوں کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ وہ خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی جانب کو ہوا کر چلنے لگتا ہے تو سردی کی آمد ہوتی ہے اور فصل خریف آجاتی ہے اور اگر شمال کی طرف ہو کر محور قنار ہوتا ہے تو گرمی آتی ہے۔ موسم بہار شروع ہوتا ہے اور فصل ربیع کی آمد ہو جاتی ہے۔ پھر ان فصلوں اور موسموں کے اثرات کائنات اور کائناتی اشیاء کے مزاجوں اور نفوس پر پڑتے ہیں۔ موسم بہار میں مزاجوں میں اوجھار اور قوتوں میں امنگ ہوتی ہے اور موسم خزاں میں طبائع میں سُستی نبات و حیوان پر پڑنے لگی اور جماد و معدنیات میں پیوست و خشکی کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر انہی مختلف فصلوں کے تقاضوں سے مختلف پھل پھول غلے میوے اور مختلف جڑی بوٹی پیدا ہوتی ہے۔ جن کی تاثیرات جانداروں کے مزاجوں میں نمایاں ہوتی ہیں جس سے تمام موالید اور پیدا شدہ چیزوں میں آفتاب مادی کی تاثیرات نمایاں ہیں۔ یعنی وہ مکان اور زمان ہی میں موثر نہیں۔ بلکہ اعیان میں بھی موثر ہے اور ہر زمانی اور مکانی شے بلکہ اس کے اندرون تک میں بھی اس کی تاثیر پہنچی ہوئی ہے خواہ وہ جماد ہو یا

نبات۔ حیوان ہو یا انسان۔

پھر موسموں کے تقاضے سے جب فضا آسمانی سے بارشیں اترتی ہیں تو زمین کی طرح سمندر اور اس کی مخلوقات میں بھی زندگی آتی ہے۔ ابرنیاں برتا ہے تو سمندری سینپ بیچ موتی پیدا ہوتے ہیں اسی سے لعل بدخشانی کی نمود ہوتی ہے۔ اسی معدنیات میں جیرے اور نیلم پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے مادی آفتاب کی تاثیر جو فضا اور زمین کے نیچے اس کے جوف تک میں نمایاں ہے۔ عرض آسمان کے نیچے تو اور فضا زمین کی سطح، جوف زمین، سمندر کی سطح اور اس کی گہرائیوں میں آفتابی تاثیر ایسا کام کرتی رہتی ہے جس سے عالم کی مصالح برقرار ہیں اور جہالوں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس آفتاب روحانی کی شرعی چال سے جیسے روحانی زمانہ، روحانی دن رات اور روحانی ہفتے بنتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے روحانی فصلوں اور موسموں کا بھی شرعی نظام کے تحت ظہور ہوتا ہے اور وہ موسم اور فصل نمایاں ہوتے ہیں جن سے مختلف مادی اور اخروی امور کا تعلق ہے۔ نبی کا قرن پاک یعنی خیر القرون۔ مجددوں کی تجدید دین کے زمانے اصلی، واقیہ کے غلبہ صلاح و رشد کے اوقات روحانی ایام میں موسم بہار کا درجہ رکھتے ہیں۔ قلوب میں انبساط ہوتا ہے تخم سعادت کے نشوونما پانے کی گھڑیاں نمایاں ہوتی ہیں اور ہر قلب میں شجرہ ایمان کے اگ لگنے اور برگ و بار لانے کی قریبی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر کس و ناکس اپنے ضمیر میں ایک خیر محسوس کرتا ہے اور ایمان و عمل صالح خود بخود سعید قلوب میں ابھر آتے ہیں۔ گویا تھوٹ کو بھی اگر خیر کا تخم دل میں گر جائے تو وہ سچ کو کونپل لے آتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں تناور تناور درخت بن جاتا ہے۔ ان زمانوں سے دوری ہوتی ہے تو وہی اس روحانیت کی موسم خزاں ہوتی ہے جس میں دل کلاٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ دین کے لحاظ سے سرد بہری پیدا ہو جاتی ہے علمی اور عملی قوی مضحمل اور سست پڑ جاتے ہیں، فتنوں کا ظہور ہوتا ہے اور امانت گھٹ جاتی ہے۔ اخلاق فاضلہ گم ہو جاتے ہیں اور اخلاق روتہ کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ کفر و بغاوت او بھرتی ہے، سرکشی اور بے حیائی نمایاں رہتی ہے۔ عرض کسی رات دن میں

سیر وانیہالی وایاماً اس زمین میں راتوں اور دنوں مامون ہو کر چلو

پھر و۔

امنین

کا ظہور ہوتا ہے جو دورِ امانت ہوتا ہے اور کسی زمانہ میں۔

فی یومِ نحسٍ مستمرٍ اور (ایسے دن میں جو ہمیشہ نحس ہوگا)

فی ایامِ نحسات اور منحوس دنوں میں

کا ظہور ہوتا ہے جو دورِ فتن ہوتا ہے پہلا موسمِ روحانی بہار کا ہے اور یہ دوسرا روحانی خزاں کا۔ پس اگر مادی آفتابِ سردی کا موسم لانا ہے جس میں فصلِ ربیع کی آمد ہوتی ہے اور وہ پھل پھول کا زمانہ ہے تو یہی شرعی فصلِ ربیع کا بھی وقت ہوتا ہے جسے آفتابِ نبوت اپنے روحانی تصرف سے برپا کرتا ہے جس میں روحانی پھل پھول اگتے ہیں یعنی سردی کی لات لمبی رات ہوتی ہے تو تہجد اور قیامِ لیل نیند کے متوالوں کیلئے بھی آسان ہو جاتا ہے اسی لئے حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ

الشتاءِ ربیعِ المؤمنِ سردی کا موسم مومن کیلئے فصلِ ربیع کا زمانہ ہے

یا اسی لئے زمانہِ نبوی کو خیر القرون فرمایا گیا جس میں نورِ نبوت اور نورِ صحابیت چمک کر خیر و شر کا راستہ واضح کر دیتا ہے اور زمانہِ تابعین کو خیر کہا گیا مگر دوسرے درجہ میں گویا یہ سب موسمِ بہار کے اعلیٰ و ادنیٰ حصے ہیں جن میں خیر اور روحانیت دنیا پر غالب ہوتی ہے بعد کے قرونِ خزاں کے ہونے تو مجددوں کو مثل ابرار ان کے بھید یا جاتا ہے جس سے دلوں کی مردہ زمین پھر زندہ اور سری بھری ہو جاتی ہے پھر جیسے مادیات میں ہر موسم کا پھل پھول الگ الگ ہوتا ہے کسی موسم میں آم کسی میں سیب و سنترہ اور کسی میں انگور و انار اور خرما وغیرہ ایسے ہی ان روحانی فصلوں کے گل و گلزار اور پھل پھول بھی الگ الگ ہیں کسی موسم میں آفتابِ نبوت کی تاثیر سے شرعی پھل پھول اگتے ہیں کسی مجدد کے دور میں قرآنی تجلیات دیا تات کے رنگ میں ہوتی ہے کسی دور میں سیاسی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہیں کسی دور میں عمل کی فراوانی ہوتی ہے اور کسی دور میں علم و استدلال اور حجت و برہان کی افزائش ہوتی ہے کسی دور میں رنگِ تجدیدِ صوفیانہ ہوتا ہے اور کسی میں مشکلمانہ کسی دور میں املاءِ حدیث کا دور دورہ ہوتا ہے اور کسی میں فقہ و فقہ کی گرم بازاری غرض مختلف زمانوں میں مختلف روحانی فصلیں آتی ہیں اور اپنے مناسب حال پھل پھول اور برگ و بار لاتی ہیں اور یہ سب کچھ آفتابِ نبوت ہی کی مخفی تاثیرات و تصرفات کا ثمرہ ہوتا ہے جیسا کہ مادی موسموں میں مادی آفتاب

ہی کی مختلف تاثیرات نمایاں ہوتی ہیں۔ عرض آفتابِ نبوت نے جس ساعت پر اور اس کی جس وضع اور فصل پر اپنا نورانی سایہ ڈال دیا یا وہی ساعت مقدس ہوگی اور اس طرح آفتابِ نبوت کا مستقل روحانی نظام ان رات دن کے سارے دوروں اور گردشوں پر پڑا ہوا ہے جس سے اس کی تاثیرات کی ہمہ گیری اور عموم فیضان واضح ہو جاتا ہے۔

نام زد ایام

پھر ظاہر ہے کہ مادی آفتاب کے بنائے ہوئے یہ دن اور رات جبکہ طرف ہیں جن میں مختلف کاروبار اور مہمات امور بھی واقع ہوتے ہیں جن میں بہت سے ایسے تاریخی بھی ہوتے ہیں جو عام دنوں کے لحاظ سے امتیازی شان اور شہرت عام رکھتے ہیں یعنی مادی لوگ جب انہیں اپنے کسی اہم اور اجتماعی کام کا ظرف ٹھہرا لیتے ہیں تو یہ ایام اہم شخصیتوں یا ان کے اہم کردار و عمل کی طرف منسوب ہو کر انہی کے نام زد ہو جاتے ہیں۔ انہی کے دن کہلاتے ہیں اور ان دنوں کو اجتماعی طور پر بطور عید کے منایا جاتا ہے۔ جیسے مقتدرایان مذاہب کی پیدائش یا وفات یا ان کے کسی تاریخی کارنامہ کے ایام کو انہی حوادث کی طرف منسوب کر کے لوگ انہیں بطور ”ڈے“ کے مناتے ہیں اور یہ ایام تاریخی طور پر انہی شخصیتوں کے ایام کہلانے لگتے ہیں۔ جیسے ہندوؤں میں ”کرشن ڈے“ یا مسلمانوں میں ”حسین ڈے“ یا عیسائیوں میں ”یوم مسیح“ بڑا دن یا سیسیوں میں ”گاندھی ڈے“ یا ”ٹک ڈے“ وغیرہ یا جیسے سیاسی جماعتوں کی آزادی کی جدوجہد کے کامیاب ہونے کے دنوں کو ”یوم آزادی“ کہہ کر بطور جشن کے مناتے ہیں۔ یا یوم جمہوریت کا نام دے کر دستور کی حکومت کا جنم دن مناتے ہیں یا سیاسی کشمکش کے زمانہ میں رضا کاروں کی مظلومانہ موت پر ”یوم شہداء“ کے نام سے دن منایا جاتا ہے۔ آگے بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے دن کو ”یوم جشن“ یا سال کے پہلے دن کو یوم سالگرہ کہہ کر منایا جاتا ہے اور اکثر اس تک کا تاریخی سن بھی بطور یادگار اسی دن سے شروع کیا جاتا ہے یا سلاطین و امراء کی عمر کے پہلے دن کو ہر سال یوم سالگرہ کہہ کر بطور جشن کے منایا جاتا ہے۔ عرض دن بنانا تو آفتاب کا کام ہے مگر کسی اہم اور عظیم کام یا شخصیت کے اقتساب کی وجہ سے اُسے مادیت پسند لوگ اپنا لیتے ہیں اور اپنے کام سے موسوم کر کے

سال بہ سال اُسے شہرت دیتے رہتے ہیں۔

لیکن حقیقت پر غور کیا جائے تو کسی عمل کے لئے دن کی ایسی تخصیص اور انتساب کے ساتھ اُسے یوم اجتماع قرار دینا اصل حق نبوت اور آفتاب نبوت کا ہے کہ یہ تخصیص فی الحقیقت دین ہی کے دائرہ کے لئے وضع ہوئی ہے۔ مادی دنیا نے اس کی نقالی یا سرقرہ کر کے حکومتوں یا حکومتی کاموں یا حکومتی شخصیتوں کے لئے اسکا استعمال شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ تخصیص دینی کاموں یا دینی شخصیتوں میں بھی دین کی اجازت کے بغیر جائز نہ تھی چہ جائیکہ دنیوی کاموں اور شخصیتوں کیلئے یہ شرعی طریق عمل سرقرہ کیا جائے۔ یہ سرقرہ اگر دینی وضع کے امور میں رنگ دین کیا جائے اور اسے بطور رسم و رواج استعمال کیا جائے اور اس رنگ سے ان ایام کو دینی باور کرایا جائے تو یہ ایسے مذموم ہوگا کہ یہ ایک شرعی حق میں تصرف اور مصرف کی تبدیلی ہے اور اگر خالص دنیوی قسم کے امور میں استعمال کیا جائے تو یہ دینی ایام کے حقوق میں مداخلت ہوگی جو یقیناً بے جا ہے۔

ہاں اگر ان ایام کو آفتاب نبوت اجتماعی حیثیت دے کر کسی شرعی مہم کے لئے بطور یادگار اپنے نظام میں لے آئے تو تشریحی ہوگا۔ جیسے رمضان کے تیس دن کے روزوں کے بعد یکم شوال کو "یوم الفطر" کا نام دے کر بطور ڈے کے منایا جانا تجویز کیا اور اُسے نماز کی عبادت سے معمور کر دیا گیا یا جیسے موسم حج میں مناسک کے ذیل میں ابراہیمی قربانی کے یاد کے طور پر دسویں ذی الحجہ کو یوم النحر کہہ کر بطور ڈے کے رکھا گیا اور اُسے نماز اور قربانی کی عبادت سے معمور کر دیا گیا تاکہ ادا شکر کی علامت ہو یا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے یوم نجات یا یوم آزادی کو جو محرم کے عشرہ اولیٰ کا آخری دن تھا۔ یوم عاشوراً کہہ کر بطور یوم خاص کے رکھا گیا اور اُسے ابتداءً فرض روزہ سے اور بعد میں نفل روزہ کی عبادت سے معمور کیا گیا تاکہ اس خوشی کی یاد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے یا جیسے حج جیسی عظیم اجتماعی عبادت کے یوم افتتاح کو "یوم الترویہ" کہہ کر ایک امتیازی شان دیدی گئی تاکہ اس عبادت کے افتتاح کی اہمیت و عظمت قیامت تک نمایاں ہوتی رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پس یہ وہ ایام اللہ ہیں جن کی تذکیر و ذکر ہو با یشام اللہ اور یاد دلائے ایام اللہ کو

کی روشنی میں خاص طور پر کیجاتی ہے۔ پس مذکور ایام اللہ دنیا کی تذکیر اہل دنیا ڈے مناکر کرتے ہیں اور ان ایام اللہ کی تذکیر اہل اللہ ڈے مناکر کرتے ہیں مگر ڈے معین کرنا اور منانا حقیقتاً حق شریعت

کا ہے۔ اہل دنیا نے نظام دین کے متوازی دنیوی نظام بنا کر ڈے متعین کر کے مداخلت فی الدین کا ثبوت دیا ہے۔ جیسا کہ اہل دین کے جاہل طبقہ نے دین اور اہل دین کے نام سے از خود ڈے متعین کر کے ان کے منانے کی عیدیں منالیں۔ جیسے گیارھویں کا دن، دسویں کا دن، تیج کا دن، بری کا دن یا فلاں بزرگ کا دن، صدیق ڈے، فاروق ڈے وغیرہ متعین کر کے دین کے رنگ میں مداخلت فی الدین کی ہے اور یہ چیز پہلے کی بہ نسبت زیادہ قبح ہے کہ دین میں التباس اور تلبیس پیدا کرتی ہے۔

بہر حال مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب نے اپنا زمانہ خود بنایا۔ لیل و نہار خود وضع کے مادہ و سال خود تیار کئے، موسم اور فصول خود بنائے۔ ان میں نسبتیں خود ڈالیں اور اس طرح پورے زمانہ کے مادی نظام کے دوش بدوش اپنا ہم گیر روحانی نظام قائم کر دیا جس سے اس کا فیضان عام مکان سے لے کر زمان تک اور زمان کے سال سے لے کر ماہ و ہفتہ و ساعت تک سب پر منظم طریق پر چھایا ہوا ہے جو آفتاب نبوت کی عالمگیر وسعتوں اور عمومیت فیضان کی کھلی دلیل ہے۔ اور یہ عمومیت مادی آفتاب کی ان عرض کردہ شباهتوں سے جب پایہ ثبوت کو پہنچی تو بلاشبہ سراج منیر کی ولالت کے نیچے اگر اس آیت کا مصداق ہو گئی۔ فَللّٰہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

آفتاب نبوت اور اجتماعیت کبریٰ

مزید غور کرو تو آفتاب نبوت کا یہ طلوع و غروب جس سے نبوت کے رات دن بنے صورتاً طلوع و غروب ہے۔ ورنہ درحقیقت عروج و نزول ہے جس کی محض صورت طلوع و غروب کی ہے۔ پس آفتاب نبوت نے اگر اس عالم شہود سے عالم غیب کی طرف رخ کیا جسے ہم نے غروب سے تعبیر کیا تھا تو وہ حقیقی غروب نہیں بلکہ عروج تھا مقامات قرب کی طرف اور اگر اس نے عالم غیب سے پھر عالم شاہد کا رخ کیا جسے ہم نے طلوع کہا تھا تو وہ درحقیقت طلوع نہیں بلکہ نزول تھا خلق خدا کی طرف تاکہ وہ غیبی نور سے فیضیاب ہو۔ اس لیے یہ طلوع و غروب حقیقی نہیں بلکہ بمعنی عروج و نزول ہے۔ حقیقی طلوع ایک ہی ہے اور وہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری ہے اور حقیقی غروب بھی ایک ہی ہے اور وہ آپ کی عالم بالا کی طرف تشریف

برسی ہے۔ ایسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آفتاب نبوت کے طلوع سے جو دن نکلا وہ ۶۳ برس کا ایک ہی دن تھا جس میں یہ عروج و نزول ہوتا رہا اور اس لئے حقیقی رات اگر ہے تو وہ ولادت و بعثت سے قبل کا زمانہ ہے جس میں نجوم نبوت لاکھوں کی تعداد میں چمکتے رہے اور وہ آدم علیہ السلام سے لیکر زمانہ ولادت نبوی تک کا زمانہ ہے جو تقریباً سات ہزار برس ہوتا ہے گویا سات ہزار برس کی ایک روحانی لمبی رات عالم پر گزری جس کے بعد دن نکلا اور وہ دن ۶۳ سال کا تھا اس دن کے اگر سات حصے کئے جائیں تو نو نو برس کے سات حصے ہوتے ہیں جس کے یہ معنی ہونگے کہ خاتم نبوت کے ۹ برس پچھلی نبوتوں کے ایک ہزار برس کی برابر ہوتے ہیں۔ ان نبوتوں نے ایک ایک ہزار برس کے دوروں میں جو کام انجام دیئے وہ خاتم النبیین نے ۹ برس میں انجام دیدیئے ولادت شریفہ سے بعثت تک پچالیس سالہ مدت گو نبوت کی مدت نہیں کہلاتی مگر مبادی نبوت اور نبی کی پاک فطرت کے ظہور کی مدت ضرور ہے جسے متعلقات نبوت ہی میں سے سمجھنا چاہیئے

میر حال صبح صادق کے بعد طلوع آفتاب کا سب سے بڑا فیض روزِ روشن کا وجود ہے جو صرف آفتاب کے ساتھ مخصوص ہے اور اس میں کوئی ستارہ بلکہ سارے ستارے مل کر بھی اسکے مہیم و شریک نہیں ظاہر ہے اس صورت میں جو دن کی خصوصیات ہیں وہ بھی آفتاب ہی کی ساتھ مخصوص ہو سکتی ہیں نہ کہ ستاروں کے ساتھ اگر ہوں گی تو رات کی خصوصیات ہو سکتی ہیں نہ کہ دن کی، سورات کی خصوصیات یہ ہیں کہ لوگ جسمانی حیثیت سے آرام کرتے ہیں عام کاروبار اور اجتماعی امور جیسے تمدنی معاملات، لین دین، میل جول، عمومی معاشرت، نظام ملت، دفتری اور سیاسی مہمات، قومی معاہدات، بین الاقوامی معاملات، جنگ و جہاد، ملکی فتوحات، ملتوی رہتی ہیں معاملات کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اہل و عیال کے واجبی حقوق، عزیز و اقارب یا اور آگے بڑھ کر پڑوسیوں کے حقوق کچھ ادا کئے جاتے ہیں اور اُسے ہی بہت کچھ سمجھا جاتا ہے، ان روحانی لوگ روحانی طور پر اگر خدا پرستی میں لگتے ہیں تو انفرادی طور پر خلوت گزینی کے ساتھ قرآن عبودیت ادا کرتے ہیں، ورنہ اجتماعی عبادتوں کا محل، عادت اور عامتہ رات نہیں ہوتی، اسی لئے قرآن حکیم نے دن کو معاشاً فرمایا اور رات کو سکنا بتایا، دن کاروباری اور میل جول کی زندگی کا وقت ہے اور رات سکون اور یکسوئی کا وقت ہے۔ بالفاظ دیگر دن اجتماعیت، کا زمانہ ہے اور رات انفرادیت اور انقطاع کا

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع سے قبل جبکہ لمبی روحانی رات تھی مذہب عالم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں انفرادیت بلکہ انقطاعیت کا رنگ غالب تھا۔ تنہا تنہا عبادت کرنا اصل تھا۔ دین میں کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی۔ کوئی اجتماعی رنگ نہ تھا۔ مخلوق سے الگ تھلگ رہ کر ہی خالق کی یاد ممکن سمجھی گئی تھی۔ گوشہ گیری، ریہائیت، خلوت گزینی، عبادت کی اصل تھی۔ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں، لقم و دق، سیابانوں اور دریاؤں کے کناروں پر پہنچ کر ریاضتوں میں مشغول رہنا ہی روحانیت جانتے تھے۔ انہیں بسلسلہ تکمیل روحانیت دنیا کے شہری اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ مذہب کے معنی ہی صرف بندہ اور خدا کے درمیانی رابطہ کے تھے۔ ملک الگ اور دین الگ تھا۔ ہر ایک دائرہ کے رجال کا الگ الگ تھے جو گویا قومی تجربہ کے طور پر مخصوص ہو جاتے تھے۔ مخلوق رسی اور میل جول کے رشتے منافی روحانیت سمجھے جاتے تھے۔ کسی مذہب میں نکاح اور عورت سے استغناء خلاف روحانیت تھا۔ تو روحانی ترقی کی پہلی پڑھی ترک نکاح تھا۔ کسی مذہب میں شہری زندگی منافی روحانیت تھی۔ ایسے گھر باہر زمین جائیداد اور تعلقات سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھنا ہی سب سے بڑی عبادت تھی کسی مذہب میں کھانے پینے پہننے اور ڈھننے کی نعمتوں سے مستفید ہونا خلاف روحانیت تھا۔ ایسے لہذا نہ ترک کر کے جنگل کے تپوں اور بنا پستی پر گذر بسر کرنا، لباس کے بجائے لنگوٹی کی ایک دھجی بندھ لینا یا کھانے کمانے میں بھیک پر گذر کر لینا ہی سب سے بڑا زہد و تقویٰ اور تواضع و انکساری کی روح سمجھا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر تعذیب روحانی کے بجائے تعذیب جسمانی، مذہب تھی۔ ایسے خودکشی کر لینا۔ اپنے کو پہاڑوں سے گرا کر ہلاک کر لینا، دریاؤں میں ڈوب کر مر جانا۔ آگ چاروں طرف جلا کر بیچ میں اپنے کو تپانا۔ اور کباب بنانا۔ کانٹوں اور کیلوں پر بیٹھ کر بدن کو پھید ڈالنا ہی دینی ریاضت سمجھی جاتی تھی۔ جس کا حاصل تعذیب جسمانی کے ساتھ ہی مخلوق سے انقطاع اور اپنے کو سارے بشری تقاضوں سے خالی کر لینا نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ دور روحانی رات کا تھا اور رات میں انفرادیت ہی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ مگر اجتماعت کا یکسوئی ہی کا غالب ہوتا ہے۔ نہ کہ ذات البینی معاملات کا باقی اس سے انبیا وقت یا شارع الہیہ پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ یہ سب کچھ تنگیوں اور دینی احکام میں انقطاعیت اور انفرادیت اس وقت کی جہتوں کا تقاضا تھا۔ انسانی قومیں جنہی قومی موقی ہیں۔ اتنا ہی شدید میلان دنیا اور لذائذ

دنیا کی طرف ہوتا ہے اور اس سے اٹھانے کے لئے آنا ہی سخت مجاہدہ اور ریاضت اُن سے کرایا جاتا ہے کہ اس کے بغیر ایسے قومی نفوس روحانیت کی طرف نہیں آسکتے۔ اہم سابقہ اپنی نفسانی قوتوں کے لحاظ سے اس قدر شدید اور ان کی جبلتیں اور طبیعتیں اس درجہ دنیا کے جاہ و مال کی الفت میں غرق تھیں کہ اگر کسی حد تک بھی انہیں دنیوی شوکت و دولت اور لذات دنیا میں ٹھیل دی جاتی تو ان کے منحرف نفوس دین کو یکسر خیر باد کہہ کر دنیا کے محض ہی پر آکر رکتے اور کبھی بھی انہیں دین حق سے لگاؤ نہ ہوتا۔ پس ان کا دین کسی طرح بھی بغیر اس کلی یکسوئی اور انقطاع لذات کے ختم نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت کا دین دنیا کے تمدن کے دوش بدوش نہیں چل سکتا تھا اور اس وقت کی دنیا کا کوئی ایک طبقہ بھی دین اور دنیا دونوں کا جامع نہیں ہو سکتا تھا۔ دین کا حامل وہی طبقہ ہوتا تھا جو دنیا سے کلی انقطاع کر کے رہبانیت کے ساتھ گوشہ گیری اختیار کرے۔ ایسے دین کو دنیوی شوکت سے الگ کر کے ملکیت ایک طبقہ کو دیدی جاتی تھی اور روحانیت کا حامل دوسرا طبقہ بنتا تھا۔ جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ گرجاؤں، زاویوں، صومعوں اور مندروں میں محبوس رہتا تھا۔ اُسے ان زاویوں سے باہر نکلنے ہی خطرہ تھا کہ شیاطین اس کا دین اچک لیں گے اور ان کے تمدن اور سامانوں کے قریب پہنچ کر اپنے دین کو کسی طرح بھی نہ سمجھا لیں گے۔ پس نفوس کی کمزور روحانیت اور قومی ترین نفسانیت اس انفرادیت اور انقطاعیت کا سبب ہوتی تھی نہ کہ معاذ اللہ انبیاء کی قوت روحانی کی کمی یا دین کا نقص۔ ایسے جتنا بھی ان کی طبیعتیں طبعاً دین برداشت کر سکتی تھیں، اتنا دین ان کے لئے اتارا جاتا تھا جس میں جامعیت نہ ہوتی تھی کہ طابع ہی جامع نہ تھیں جو جامع دین کا تحمل کر سکتیں۔

لیکن جو ہی آفتاب نبوت نے طلوع کیا اور روحانیت کا دن نکل آیا تو قدرتی طور پر انفرادیتیں ختم ہو کر اجتماعیتوں میں تبدیل ہونے لگیں کیونکہ اجتماعی دین میں طبعاً یکسوئی کا وقت ہونا ہی نہیں بلکہ جلو توں اور اجتماعی کاموں کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے جب آفتاب نبوت کا نور چمکا تو طبیعتیں جماعتی دین اور اجتماعی روحانیت کی طرف مائل ہونے لگیں اور اپنی خاموش پکار سے ایک ایسا دین مانگنے لگیں جس میں دین کے ساتھ دنیا سے انقطاع نہ ہو۔ دیانت کے ساتھ سیاست اور نظم ملت بھی جمع شدہ ہو اور انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت بھی مخلوط ہو کیونکہ دنیا کی آخری امت، ظاہر ہو چکی تھی جو

پچھلی اقوام و اہم کے تجربات علمی طور پر سامنے رکھتی تھی ابتدائی قوتوں کی افراط کے رد عمل کا قدرتی تقاضا تھا کہ آخری قوم مزاج میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال رکھتی ہو، نہ اس کے نفسانی قوی ایسے ہیجان میں آئے ہوئے ہوں کہ وہ دنیوی لذات کے ساتھ دین اور روحانیت کے تصور ہی سے بھل گئے لگے اور نہ ایسی متعسف اور زاہد تنگ نظر ہو کہ دنیا اور اس کی لذات کے مادے ہی اس میں سے ختم ہو چکے ہوں بلکہ اس میں قوائے نفسانی اور قوائے روحانی کا ایک ایسا معتدل امتزاج تھا کہ وہ دین کے ساتھ دنیوی شوکت کو اور دنیوی شوکت کے ساتھ روحانیت کو جمع کرنے کی اہل ہو چکی تھی۔ وہ تخت سلطنت پر بیٹھ کر درویش بھی رہ سکتی تھی۔ جیسے خلفاء راشدین اور صلحاء سلاطین نے کی اور وہ درویشی کی گلیم اور تھکرت کی تلیم بھی کر سکتی تھی جیسا کہ انہوں نے کر کے دکھلائیے۔ ایسے ملک و دین تو ام کر دئے گئے اور ایک ایسی جامع اور کامل نبوت بھیجی گئی جو جلال و جمال، مہر و قہر دیانت و سیاست کی یک آن حامل تھی اور اس کامل امتزاج دین و دنیا کے سبب انہیں استخلاف فی الارض کا منصب عطا کیا گیا نہ انہیں کورامک بلا دین کو دیا گیا اور نہ کورادین بلا شوکت کے دیا گیا چنانچہ دین بے شوکت کے بارہ میں اعلان ہوا کہ

لادھبائید فی الاسلام اسلام میں گوشہ گیری اور انقطاعیت نہیں
لذات لباس و طعام کے بارہ میں بتلایا گیا کہ وہ دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔
قل من حرم ذینۃ اللہ التی آپ ضرور کہتے کہ اللہ کی زینت اور پاک رزق
اخرج لعبادہ والطیبات من کو کس نے حرام کیا جسے اللہ نے بندوں کے
الرزق: لے پیدا فرمایا ہے۔

بتلایا گیا کہ گھر گھرتی ہونا دین و روحانیت کے منافی نہیں بلکہ معین دین ہے۔
النکاح سنتی فمن دغب عن نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت
سنتی فلیس منی: سے اعراض کیا۔ وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔
گھر بار رکھنا اور زمین جائیداد کا حاصل کر لینا دین کی ضد نہیں ہے جو اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔

واللہ جعل لکم من بیوتکم اور اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے

سکنا :

وجہ سکون بنایا ہے

اور آخر کار صاف اعلان کر دیا گیا کہ آج کے دن دین اور ملک جمع کر دئے گئے۔ جیسے دو بڑے ڈال بچے پیدا آتے ہیں اور بڑے ہوئے پیدا ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی جدا نہیں کر سکتا اور کر دیا جائے تو دونوں ضائع ہو جائیں۔

المک والذین توامان
اللہ امرنی بہن الجماعت
والسمع والطاعة والهجرة
والجهاد (تفسیر ابن کثیر)

ملک اور دین جوڑواں بچے ہیں اللہ تعالیٰ
نے مجھے ان چیزوں کا حکم فرمایا۔ جماعت
سمع و طاعت ہجرت اور جہاد کا

پھر اسی مسئلہ جنتہ ومن لہو یعرف
امام زمانہ فخدمات میتہ
جاہلیتہ الجہاد ماض الی
یوم القیمتہ :

امام ڈھال ہے جس نے امام وقت کو
نہیں پہچانا۔ اس نے موت جاہلیت کی
پائی۔ جہاد قیامت تک جاری رہنے والا
ہے۔

پھر عبادات بھی جماعتی رکھی گئیں۔ نماز باجماعت ہونی جس کے لئے امام ضروری ہے حج
باجماعت ہوا جس کے لئے امام ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا نظم جماعتی ہوا جس کے لئے امام یا اس کے
قائم مقام کا وجود ضروری ہے۔ سفر جماعتی ہوا جس کے لئے امیر کا انتخاب ضرور ہوا۔ تدبیر منزل جماعتی
ہونی جس کیلئے امیر خانہ کی ضرورت ہونی۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن
سر عیلتہ :

تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنے ماتحتوں
کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا۔

دنیا داری اور دینداری کی تفریق اٹھ گئی اور بتلا دیا گیا کہ ہر دنیا دار اپنی یورپی دنیا سمیت دیندار
ہو سکتا ہے اور ہر طبیعی اپنے تمام امور طبعیہ کو نیت و اتباع کے رشتہ سے باندھ کر شرعی بن سکتا
ہے، یعنی امور طبعیہ کو امور شرعیہ بنا دیا گیا ہے۔ کھانا کھانے، بیوی کے پاس جانے، پڑ کر سونے
اور قضاے حاجت کرنے کو موجب اجر بتایا گیا۔ جبکہ وہ طریق سنت پر جو عبادت۔ مریض بیمار پر
مشاعت جنازہ، میت کو غسل دینا، تعزیت اموات، تجہیز و تکفین کی شرکت عبادت قرار پائی، بیوی کی

خدمت، عیال کی تربیت، غلاموں کی خبر گیری، یتیموں پر شفقت، مظلوموں کی حمایت، سرکشوں کو دبانا، قاتلوں سے قصاص، چوروں کو سزا، شراب خوردوں کی تعزیر، جوئے بازوں کی پاداش، مفسدوں سے جنگ، عبادت و دین قرار پائی، تجارت، صنعت و حرفت، ملازمت دیانت کا جزو بن گئی، بین الاقوامیت، بین الاوطانیت، عالمی قومیت، عالمی تنظیم یعنی خلافت روس دین بن گئے، امام شوریٰ، عسکریت، اصول دین ہوئے، بھیک مانگ کر انفرادیت کو قائم رکھنے کی کوشش مذہب قرار پائی۔ یہ علیٰ یادِ سفلیٰ سے بہتر قرار دیا گیا۔ ہر وہ چیز عبادت اور قربت و طاعت بتائی گئی جس میں ایک کو دوسرے سے سہارا لگے، قول سے ہو یا عمل سے۔ اخلاق سے ہو یا اشارہ سے اور اعلان کر دیا گیا کہ

والله في عون العبد ما كان الله تعالى في عون العبد
 العبد في عون اخيه
 کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

البتہ ان سب چیزوں کی شرعی حدود قائم کی گئیں اور بتایا گیا کہ اسلام فطری قوتوں کو پامال کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے وہ بر قوت سے کام لے گا شہوت ہو کہ غضب سمیت ہو یا ملکیت سب سے مل کر ہی انسانیت بنتی ہے اس لئے ان کا بقا انسانیت کا بقا ہے جبکہ وہ بتلائی ہوئی حدود اور مقرر کردہ نظام کے اندر اندر رہے پس اس ملی و اجتماعی نظام کے سبب اس دین کی شکل بادشاہت کی ہی ہو گئی اور تمام لوازم حکومت اسکے اندر شامل ہو گئے جس کی وجہ اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ یہ نور آفتاب نبوت کا نور تھا اور جیسے آفتاب آخری یار ہے جس کے بعد کسی ستارے کی نورانیت نہیں چلتی اس لئے اس کا نور اور دین بھی آخری دین تھا۔ جسے قیامت تک باقی رہنا تھا اور دوامی بقا، انفرادیت کے ساتھ نہیں ہو سکتی کیونکہ افراد سب گذشتہ اور رفتی ہوتے ہیں اگر یہ دین انفرادی ہوتا تو افراد کے گذرنے سے ختم ہو جاتا جیسا کہ پچھلے ادیان انفرادی تھے جو افراد کے گذرنے سے گزر گئے اور ہر پچھلے دین کے گزر جانے پر نیا دین آیا۔ اس لئے ان میں سے کسی دین کو بھی بقا، دوام حاصل نہ ہوئی۔ لیکن یہ دین جب کہ آخری دین تھا تو اسے اجتماعی رکھا گیا جو افراد سے نہیں، اصول اور جماعت سے برپا ہوا۔ سنت اور جماعت اس میں اصل ہوئے

نہ کہ محض افراد ایسے افراد گذر گئے۔ مگر جماعتی نظام اور اصول قائم رہے۔ جو افراد کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دین باقی رہا اور تاقیام قیامت باقی رہیگا۔ بہر حال اس سے واضح ہے کہ جیسے مادی رات کی خصوصیت انفرادیت اور انقطاعیت ہوتی ہے اور دن کی اجتماعیت اور کاروباری میل جول۔ ایسے ہی روحانی رات کی خصوصیات بھی دینی انفرادیتیں اور رہبانیتیں تھیں اور جب آفتاب نبوت کے طلوع ہونے پر دن نکل آیا تو وہ انقطاعیتیں خود بخود ختم ہو کر اجتماعی زندگی کا دور دورہ اچانک سامنے آگیا۔ جو دن کی روشنی ہی میں سامنے آسکتا تھا جس میں دین و ملک نے بیک وقت جمع ہو کر جماعتی تنظیم اور اجتماعی نظام کی صورت نمایاں کر دی اور ایسے اسلام کا نظام اجتماعی دنیا کے لئے انقلاب آفرین دور ثابت ہوا جس نے ذہنیوں میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔

جامع انقلاب

چنانچہ آفتاب سے جہاں روشنی و گرمی کے فیوض عالم کو پہنچتے ہیں اور ایک ہنچ پر ہزاروں ہزار سال سے یکساں پہنچتے آ رہے ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ وہیں آفتاب میں تغیر آفرینی اور انقلاب انگیزی کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ جس سے وہ اشیا کی ماہیتیں اور حقیقتیں تک بدل ڈالتا ہے گویا سارے سیاروں میں وہ ایک انقلابی سیارہ ہے جو ماہیتوں کو تبدیل کر دیتا ہے اور دنیا پر اس کے اثرات انقلابی رنگ میں پڑتے ہیں کہ مثلاً ستارے اگر جڑی بوٹیوں میں رس اور نلی میں گودا پیدا کرتے ہیں تو یہ ایک مثبت اثر ہے۔ جو خالی ظرف میں بھر جاتا ہے کوئی چیز بدلتی نہیں۔ لیکن سورج انہیں پگھلا کر یا خشک کر کے معدوم بھی کر دیتا ہے۔ جس سے شے ہی نہیں رہتی۔ چاند بلا شہرہ سمندر کو تہ و بالا ضرور کر دیتا ہے۔ مگر اس سے سمندر کی صرف ہیئت بدل جاتی ہے۔ ماہیت نہیں بدلتی لیکن سورج اس کی کیفیات اور خواص تک کو بدل ڈالتا ہے۔ اس کڑوے سمندر کو گرا کر مانسوں بنا دیتا ہے۔ جس سے کڑوا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ سمندر سفلی ہے مگر اُسے آفتاب گرا کر اور اس سے مانسوں اٹھا کر اس کے ایک حصہ کو علوی کر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جائے اور عالم میں شریں پانی بن کر برس پڑے سمندر سیال ہے۔ مگر سورج اُسے مانسوں بنا کر بادلوں

کی شکل دے دیتا ہے اور دن کو رات، یہی سورج ہواؤں پر اثر ڈالتا ہے تو نسیم کو صرصر اور ہوائے سرد کو ہوائے گرم بنا دیتا ہے۔ غرض ترک و خشک، خشک کو تر، خام کو پختہ اور پختہ کو خام، بہاؤ کو ٹھیراؤ اور ٹھیراؤ کو بہاؤ۔ سکون کو حرکت اور حرکت کو سکون۔ مُردنی کو زندگی اور زندگی کو مردنی سے بدل دینا اور شے کے اندرون کو منقلب کر دینا بلاشبہ انقلابِ مابیت ہے جو سورج ہی کا کام ہے جس میں کوئی سارہ اس کا ہم پلہ نہیں۔

ٹھیک اسی طرح نجوم ہدایت انبیاء علیہم السلام نے اقوامِ عالم کی اصلاح فرمائی اور ان کے پاکیزہ اثرات سے دنیا نے اللہ کا راستہ دیکھا۔ لیکن صرف اس انداز سے کہ ان کی جہلتیں اپنی جگہ باقی رہیں انہیں کچھ مغلوب یا مستور کر کے دین کی رسوم انہیں اڑھا دی گئیں یعنی شاق شاق ریاضتوں ترک دنیا، ترک لذت اور ترک آسائش و راحت سے اس جہلت کو دبائے رکھا تو وہ کسی حد تک دین پر لگے رہے۔ اگر وہ اس دین پر رہتے ہوئے ذرا بھی اپنی رہبانیت کو ترک کر دیتے تو اسی وقت اُن سے دینی جذبات رخصت ہو جاتے۔ بالکل اس طرح جیسے دشمن کو کسی مکان میں بند کر کے اس سے بچاؤ اختیار کر لیا جائے اور نفس سے اس فرصت میں کچھ روحانی کام لے لیا جائے، لیکن اس کا ردِ عمل قدرتی طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ اگر ذرا بھی قید خانہ کا قفل کھل جائے اور وہی جہلت نفسانی اور طبعی مزاج او بھر کر روحانی مزاج کو پھر درہم برہم کر ڈالے لیکن آفتابِ نبوت نے تکمیلِ انسانیت کے لئے نفسانیت کو بند یا محسوس کرنے کے بجائے اُسے بدستور قومی رکھا اور بند بھی نہیں کیا مگر اُسے اپنا لیا اور اس سے روحانیت کی خدمت لی اور ان طبعی تقاضوں کو پامال کرنے کے بجائے انہیں شرعی بنا دیا اور ٹھکانے لگا دیا کہ وہ خود روحانیت کے خادم بن گئے اب وہی شہوت، بجائے اس کے کہ زہی ہو کر اُسے پامال کیا جاتا، عقل و شرع کے سامنے اُسے جھکا دیا گیا اور اس کے تمام طبعی افعال کو صحت نیت اور ثواب طریق سے شرعی بنا دیا گیا یعنی وسیلہ دین بنا کر انہیں طبعی سے شرعی کر دیا۔ اس لئے ایک مومن کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، دوستی و دشمنی، معیشت و معاشرت، مباشرت و مجامعت جبکہ بقصد دین اور بطرز سنت نبوی ہو دین ہو جاتا ہے اور معاشرت کے یہ تمام گوشے دین کے شعبے بن جاتے ہیں۔ گویا اس تشریحی انقلاب سے عادتِ عبادت اور دنیا دین بن جاتی ہے پس آفتابِ نبوت کی پیش کردہ

روشنی اور عملی پروگرام نے ان سب طبعی تقاضوں کی مابینوں کو بدل کر انہیں شرعی و دینی بنا دیا اور ایک عظیم دینی انقلاب پیا کر دیا۔ اس لئے ایک مومن کو آج شہوت و غضب، حرص و ہوس، بخل و طمع، حق و حسد، محبت و عداوت وغیرہ کو مٹانے یا بند کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ بطور زندگی کو رکھنے لگا دینے اور اپنا لینے کی ضرورت ہے تو وہی قولے طبعی جو فساد کی طرف لے جاتے ہیں صلاح و رشد کی راہ چل پڑیں گے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے آج کے دور میں ربانیت بدن سے ہٹ کر قلب میں آگئی یعنی نیت و خیال اور قوت فکر یہ کو اسلام کا رہبان بنا دیا کہ وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے صرف اللہ کی طرف بھج جائے اور جب ان قوموں ہی کا رخ اللہ کی طرف ہو گا تو ان سے صادر شدہ افعال بھی قدرتی طور پر اللہ ہی کے لئے ہو جائیں گے۔ خواہ بظاہر دنیوی نظر آئیں پس اور مسکوں کی رو سے انسان معطل ہو تو خدا تک پہنچے اور اسلام کی رو سے انسان انسان رہ کر خدا تک پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فعل ایک جہت سے حرام ہوتا ہے اور اس پروگرام کے تحت دوسری جہت میں حلال بلکہ عین طاعت و عبادت بن جاتا ہے۔ اگر ذکر چلنا حرام تھا جبکہ مقصد رضا نفس تھا۔ ولا تمش فی الارض مرحاً (زمین پر اکڑ کر مت چلو) لیکن وہی فعل طواف بیت اللہ میں حلال بن کر عبادت ہو گیا۔ جبکہ مقصد اعلا رکات اللہ اور رضا حق ہو گیا۔ وہی حرص حرام تھی جبکہ مفاد دنیوی کے لئے تھی اور وہی حرص حلال ہو کر موجب ثواب بن گئی جبکہ مفاد آخرت کے لئے استعمال میں آنے لگی۔ وہی لوٹ مار حرام ہے جبکہ نفس کی خاطر اور بمقابلہ مقبولان الہی ہو اور وہی لوٹ مار حلال ہے جبکہ جہاد میں دشمنان خدا کے مقابلہ میں ہو۔ وہی جھوٹ حرام ہے جبکہ فتنہ انگیزی کے لئے ہو اور وہی جھوٹ حلال بلکہ باعث اجسب ہے جبکہ دفع فتنہ اور اصلاح ذات البین کے لئے ہو۔ پس آفتاب نبوت نے ترفع، حرص، غارت گری، لوٹ مار وغیرہ جیسے طبعی جذبات کو بھی دل کے کسی کونہ میں بند رکھ کر تالا نہیں لگایا۔ کیونکہ تالا کھلنے پر اندیشہ تھا کہ وہ باہر نکلتے اور مزید قوت کے ساتھ نفس کو از سر نو فاسد کر دیتے بلکہ ان کے رخ کو بدل کر بجائے نفس کی خدمت گزاری کے رب العزت کی خدمت گزاری پر لگا دیا تاکہ وہ بندش اور آزادی میں ہمہ وقت عظمت حق کی راہ پر چلتے رہیں اور اپنی اپنی جگہ قائم رہ کر انسانیت کی صحیح خدمت انجام دیں پس نبوت کے اور ستاروں نے ذہنوں میں جذبات اور انسان کے نفس کو

قید و بند سے جکڑ کر نفس کو ان سے الگ کیا تاکہ نفس ان کے پھندے میں نہ پھنس سکے۔ اگرچہ وہ ان کے متعلقہ کاموں سے معطل بھی ہو جائے اور آفتاب نبوت نے ان قومی کو آزادی دے کر خود ان سے کام لیا اور اس طرح ان سے متعلقہ تمام کاموں کو عبادت بنا دیا۔ جس سے ذہنوں اور ذہنی قومی میں انقلاب عظیم پکڑ دیا۔ ترک و خشک اور سفلی کو علمی بنا دیا۔ طبیعت کو جو سفلی تھی، اسے علمی روحانیت میں تبدیل کر دیا۔ دنیا کو جو ناپاک تھی، پاک دین بنا دیا۔ ناسوتی زندگی کو جو خسارہ ہی خسارہ تھی، ملکوتی اور لاموتی زندگی بنا دیا۔ جو کمال محض ہے، غرض بشر کو بشر رکھ کر ملکوتی صفات و افعال سے آراستہ کیا۔ بشر کو بشریت سے نکال کر ملک نہیں بنایا کہ وہ بشریت کی ترقی ہوتی بلکہ بشریت کا انعدام ہوتا جو کمال نہیں۔ صرف ایک جزوی خوبی یا ایک نوع کی فنی مہارت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کنارہ کشی، گوشہ گیری اور خلوتی بن جانے کا نام نہیں بلکہ جلو تو کے بجوم میں رہ کر ہر قوت کو بتلائے ہوئے مصرف میں صرف کرنے اور اس کے واجبی حقوق ادا کرنے کا نام ہے اور یہی وہ آفتاب نبوت کا انقلابی کارنامہ ہے جو سابقین سے انجام نہیں پایا اور اسی کا نام اکمال دین ہے جس کے لئے ختم نبوت کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پس سابق نجوم ہدایت نے ان طبعی جذبات کو پامال کر کے یا انہیں مجبوس کر کے شرعی راہوں پر لگایا اور آفتاب نبوت نے انہیں باقی رکھ کر اونہی سے انسانی دین کو ترقی کرائی اور عین دنیا کو دین بنا دیا۔ اسلئے آج حتیٰ ترک دنیا کی ضرورت نہ رہی بلکہ دنیا کو خادم دین کی حیثیت سے باقی رکھ کر اسی کو ترقیات دینی کا راستہ بنا دینے کی ضرورت ہے۔ قدیم مذاہب شہری زندگی چھڑا کر خدا رسی تک لاتے تھے اور اسلام شہر بسا کہ خدا تک پہنچاتا ہے اور نجوم ہدایت نے وسائل تمدن، وسائل معاش، ازدواج و اولاد اور گھر بار اور تمام وجوہ معاشرت چھڑا کر یا جنگلوں میں بٹھا کر جمال خداوندی دکھلایا اور آفتاب نبوت کے اس تمدن شہری آباد کاری اور تزوج و توالد ہی کو آئینہ جمال حق بنا دیا جس کو سامنے رکھ کر ہی حق نظر آئے۔

اسی طرح اور نجوم ہدایت کی روشنی ہر لٹائی بھڑائی ملک گیری اور چڑھائی سے الگ تھلگ کر کے خدا کا چہرہ دکھلاتی ہے اور آفتاب نبوت اعلاء کلمۃ اللہ کی جنگ ہی کو افضل ترین عبادت بنا کر اس کے ذریعہ مشابہ حق کرتا ہے۔ غرض وہاں ترک دنیا حتیٰ ہے اور یہاں ترک دنیا عقل

اور معنوی ہے۔ وہاں نفس امارہ کی ہمتیں برسر کار نہیں آسکتیں جبکہ دشمن کے سامنے جائے کا اصول سامنے رکھا گیا ہے اور یہاں نفس کی اندرونی ہمت و قوت اپنا پورا کام کرتی ہے جبکہ دشمن کے سامنے ڈٹ جانے اور اسے رام کر لینے کی پالیسی سامنے رکھ دی گئی ہے۔ غرض آفتاب نبوت نے رہبانیت کو عوامیت سے خلوت کو جلوت سے اور انقطاعیت کو اجتماعیت سے تبدیل کر کے پورے دنیا کا دھارا بدل دیا ہے۔ پس آج کی دنیا میں جبکہ ساری دنیا کی قومیں ایک پلیٹ فارم پر آگئی ہیں اور اجتماعیت و اشتراکیت کے جذبات برسر کار آچکے ہیں۔ آیا وہ ترک لذات گوشہ گیری اور رہبانیت کا اصول جذبات کو اپیل کر سکتا ہے یا مادیات کو ساتھ لیکر دینی راہیں قطع کرنے کا اصول دلوں میں جاگزیں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دلوں کی آواز دوسری ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اجتماعیت کبریٰ کا اصول ہی وہ فطری راہ ہوگا جس سے کوئی فرد بشر انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسی جامعیت اسلام کی طرف انبیائے سابقین نے بھی واضح اشارے فرمائے ہیں چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد فیض بنیاد اس بارہ میں صاف ہے۔

کیا قومی انسانی کو پامال کر دیا جانا امر معقول ہوگا کہ انسان میں شہوت باقی رہے۔ نہ غضب نہ حرص رہے نہ جذبات و حیات بالفاظ دیگر نہ انسان رہے نہ اس کی انسانیت دنیا میں فعل و عمل کی گرم بازاری ہے۔ اگر قومی ہی نہ رہیں تو عمل کیسے سرزد ہو اور عمل نہ رہے تو قوائے نفس و آفاق کے خواص و آثار کیسے نمایاں ہوں یا پھر ان قومی کو قائم رکھ کر انہیں اعتدال کے ساتھ ان کے صحیح مصرف میں صرف کیا جانا اور انسان کو مع اس کی انسانیت کے باقی رکھنا امر معقول ہوگا جس سے دنیا میں تخلیق الہی کے نئے نئے عجائبات نمایاں ہوں اور دنیا کی انفسی اور آفاقی کمون طاقتیں کھل کھل کر سامنے آتی رہیں جس سے انسان کی خلافت کبریٰ کا ظہور ہو۔ ظاہر ہے کہ عقلمند دنیا اس دوسری ہی صورت کو پسند کر سکتی ہے۔ کیونکہ قومی بشری کے پامال ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں بشری باقی نہ رہے اور جب نوع بشری ہی باقی نہ رہے گی تو یہ مذہب آخر خطاب کے کرے گا لیکن اگر انسان کا بقا ضروری ہے تاکہ مذہب کا خطاب صحیح ہو اور انسان کی بقا کے معنی اس کی طبعی اور خلقی قوتوں کا بقا ہے تو انسان کی انسانیت کے معنی یہی ہوں گے کہ اسکی قوتوں کا کسی صحیح ڈھنگ سے ظہور ہو تاکہ کامل انسانیت کا نقشہ کامل روحانیت پر ٹھیک ٹھیک

مطابق آجائے اور ان قوتوں کو ٹھکانے لگا کر ایک کامل الخلق انسان کو اس کی کامل مادی قوتوں کے ہجوم میں کامل الروح انسان بنا دیا جائے۔ اس لئے یقیناً آج کی دنیا اسی آخری اصول کی تصدیق کرے گی گو پہلے اصول کو جھٹلائے بھی نہیں۔ جب کہ وہ بطور معالجہ اپنے وقت پر کسی دور میں کارآمد بھی رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اس اصول کو محدود سمجھنے پر بھی مجبور ہوگی جس کے لئے بقار دوام نہیں ہو سکتی۔

اس انقلاب کا ثبوت تورات و انجیل سے

تورات کی کتاب استنار کے باب ۳۳ میں ہے کہ :-

”خدا سینا سے آیا۔ ساعیر سے طلوع ہوا اور فاران سے چمکا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دابنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔“

ظاہر ہے کہ خدا کے سینا سے آنے کے معنی نبوت موسوی اور شریعت تورات کا ظہور ہے۔ ساعیر سے طلوع ہونے کے معنی نبوت عیسوی اور شریعت انجیل کا ظہور ہے اور فاران سے چمکنے کے معنی نبوت محمدی اور شریعت قرآن کا ظہور ہے۔ جس کے جلوے بالآخر سارے عالم پر پڑے۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونا فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار مقدس صحابہ کا لشکر تھا چنانچہ سیرت ابن ہشام تاریخ طبری البدایہ والنہایہ تاریخ کامل ابن اثیر زاد المعاد تاریخ ابن خلدون وغیرہ کا فاتحین مکہ کے اس عدد پر اتفاق ہے۔ آتشیں شریعت کے معنی دین کے ساتھ سیاسی قوت اور اجتماعیت کے جمع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اس شریعت میں حدود و قصاص تعزیرات و کفارات و جہاد و قتال اور خلافت و امارت جزو دین کی حیثیت سے آئی اور الملک والذین تو امان (ملک اور یہ دین دو جوڑواں بپتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا) کا ظہور ہوا۔

یہ جامعیت یقیناً اون ادیان میں نہ تھی جو سینا اور ساعیر سے چمکے تھے۔

چنانچہ دین مسیح کے بارے میں تو خود مسیح ہی نے اعلان فرمادیا تھا کہ میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ اگر میری بادشاہت ہوتی تو میرے خادم لڑتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاتا۔

(انجیل یوحنا باب ۱۸/۳۳)

جس سے دین کے بارے میں جہاد و ملک کی صاف نفی ہے۔ اسی طرح حدود و تعزیرات کے بارے میں حضرت مسیح نے صاف اعلان فرمایا۔ ”تم سُن چکے ہو کہ کیا کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور دانت کے بدلہ میں دانت، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر ٹھانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔“

(انجیل متی باب ۵/۳۸)

جس سے حدود و تعزیرات کی صاف نفی واضح ہے۔ اسی طرح معاملات اور ثالثیوں اور عدالتی امور کے بارے میں ارشاد مسیحی ہے ”پھر بھیڑ میں سے ایک نے اس سے کہا، اے استاد میرے بھائی سے کہہ کر میراث کا حصہ مجھے دے۔۔۔ اُس نے (سُج) اس سے کہا، میاں کس نے مجھے تمہارا منصف یا بانٹنے والا مقرر کیا۔“

(انجیل لوقا باب ۱۲)

جس سے ثالثی عدالتی فیصلہ اور حکم ہونے کے منصوبوں کی نفی صاف مذکور ہے۔ ادھر شریعت موسوی میں سیاست تو تھی مگر دین کے ساتھ مخلوط ہو کر نہیں بلکہ اسے دنیوی قرار دے کر ملوکیت کا دائرہ نبوت کے دائرہ سے الگ رکھا گیا تھا۔ انبیاء کا کام ہدایت دینا اور ملوک کا کام اُسے جاری و نافذ کرنا تھا۔ خود سیاست میں دیانت یا دیانت میں سیاست کبھی ہوتی تھی کہ دونوں کا ملکر ایک رنگ ہونا اور مجموعہ کو دین پکارا جاتا۔ اسی کو انجیل نے باقی رکھا کہ پوپ کا حصہ

پوپ کے دو اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو اسی شرع فقط اسرائیلی مزاج کے مطابق تھیں جنہیں ایک ہی رہبانیت پسند طبقہ قبول کر سکتا تھا۔ ترقی پسند قومیں تنظیم ملت اور عالمیت مزاج اقوام کے در وکان میں کوئی سامان نہ تھا۔

اس انقلاب عمومی کا ثبوت قرآن سے

لیکن اسلام نے شریعت کو جامعیت کا رنگ دیکر ایک ہمہ گیر روشنی کی بنیاد ڈالی جس میں دین و ملک اور دیانت و سیاست مخلوط کر کے پیش کی گئی اور ایک بین الاقوامی دین پیش کیا جس کی روشنی میں اقوامی اور ہمہ گیر تھی۔ ایسے یہ دین بھی ہمہ گیر ہوا اور اس کی سیاست و خلافت بھی ہمہ گیر مومن دین کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد حق ہے کہ

هو الذي ارسل رسولا
بالهدى ودين الحق ليظهره
على الدين كله
اور دین کی سیاست و خلافت کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد نبوی ہے کہ

ان الله نزلني بالارض مشارقها
ومغارها وسيلغ ملك امتي
ما نزلني منها
اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے
کر دی (جسے میں نے دیکھا) اور عنقریب میری
امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک میری
نگاہوں نے دیکھا (یعنی مشرق سے مغرب تک)

چنانچہ اس روایت و مشاہدہ کی تفصیل اس حدیث میں فرمادی گئی کہ غزوہ خندق میں جب ایک بڑی چٹان خندق کھودتے ہوئے نکلی اور حضرت سلمان فارسی اور دوسرے صحابہ اُسکو توڑنے سے عاجز آئے تو حضور کو اطلاع دی تو آپ نے تشریف لاکر اس پر کدال سے ایک ایسی شدید ضرب لگائی کہ اس کا ایک بڑا حصہ ٹوٹ گیا پھر دوسری ضرب لگائی تو دوسرا حصہ ٹوٹا اور تیسری ضرب میں اُسے چکن چور کر دیا۔ ان تینوں ضربوں کی چوٹ میں ہر دفعہ ایک عظیم نور اور چاند نامہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ پہلی ضرب کی روشنی میں مجھے حیرہ کے محلات اور مدائن کسرنے (ایٹلان) دکھلائے اور حضرت

جبرائیل نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کی امت ان پر غالب آئے گی۔ دوسری ضرب کی روشنی میں مجھے روم کے سرخ مہلات نظر پڑے اور حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ آپ کی امت ان پر غالب آئے گی۔ اور تیسری ضرب کی روشنی میں مجھے صنعاء (اور یمن کا علاقہ) دکھلایا گیا اور حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ آپ کی امت اس پر غالب آئے گی۔

اس دور میں دنیا دو طاقتوں میں بٹی ہوئی تھی روم اور فارس، باقی ساری سلطنتیں ان ہی دو کے زیر اثر تھیں اسلام نے انہیں مغلوب کر کے اس وقت کی ساری دنیا پر اپنے مقتدرانہ اثرات قائم کئے اور نبوت کی پیشگوئی کا ایک بڑا حصہ پورا ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا اور آج کی دنیا تین بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے امریکہ، روس اور عرب ممالک اور موجودہ دنیا کا نقشہ صاف بتلا رہا ہے کہ آج کے دو عظیم بلاکوں امریکہ اور روس کے لئے یہ ممالک پانگ بنے ہوئے ہیں۔ ایسے یہ دونوں بلاک عرب طاقتوں کی چالپوسی یا ان کے ٹرے کے درپے ہیں۔ مگر یہ تیسرا بلاک طاقت پکڑتا جا رہا ہے اور بالآخر ان دو بلاکوں پر غالب ہو کر پوری دنیا پر چھا جائیگا چنانچہ ظہور مہدی کی حدیثوں میں یہی خبر دی گئی ہے کہ مہدی کے ہاتھ پر مشرق و مغرب کی طاقتیں ٹوٹیں گی اور ان کی حکومت قائم ہوگی اور ظاہر ہے کہ مہدی کا ظہور مکہ سے ہوگا اور شام کو وہ اپنا مستقر بنا کر وہیں طاقت جمع کریں گے جن سے روم و فارس برد آنا ہوں گے اور شکست کھا کر اسلام کی ایک ہی قومیت میں مدغم ہوں گے۔

فیکون الدین کلذہ اللہ اور بیظورہ علی الدین کلذہ کا ظہور ہو جائے گا جس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں اور ہم نے کسی دوسری جگہ اس کی تفصیلات واضح بھی کر دی ہیں۔

عرض آسمان نبوت کے تمام نجوم ہدایت لکرات کو دن نہیں بنا سکے یہ کام صرف آفتاب نبوت ہی کا تھا کہ اس نے طلوع ہوتے ہی پوری دنیا کو اپنی روشنی سے جگمگا دیا اور اس کی عالمگیر روشنی عالم کے کونہ کونہ میں پھیلی اور پھیل کر رہے گی کیونکہ اس میں دیانت و یاسات ملتا اور دین شوکت اور فروتنی یکمیل فرد و قوم تنظیم ملت اور نظام عالم طبیعت و عقل سب کچھ وحی کے نیچے جمع کر کے مجموعہ کے مزاج سے دین کی بنیاد استوار کی گئی ہے۔ اس لئے وہ عالم کے ہر طبقہ اور ہر مزاج کے لئے قابل قبول بن گیا جو ہمہ گیر می کی ابتدائی شان ہے۔

مومن کا ایمانی وجود اور اسکی ذات

اسکا راز یہ ہے کہ جس طرح آفتاب کون و مکان کو روشن اور گرم کر دیتا ہے مگر حقیقتاً روشن اور گرم صرف آفتاب ہی ہوتا ہے اس کے سوا دوسری اشیاء عارضی طور پر روشن اور گرم ہو جاتی ہیں اور نظریوں آنے لگتا ہے کہ یہ اشیاء روشن ہیں مگر بنگاہ حقیقت روشنی اور گرمی ایک آفتاب ہی میں ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو لگ جاتی ہے تو لگے رہنے کی حد تک وہ چیز بھی روشن اور گرم محسوس ہونے لگتی ہے۔ روزِ روشن میں درو دیوار کو ہم روشن اور گرم کہتے ہیں لیکن حقیقتاً دیوار روشن نہیں ہوتی۔ دھوپ روشن ہوتی ہے مگر وہ دیوار سے لگی ہوئی ہے۔ ایسے دیوار بھی روشن نظر آ رہی ہے۔ اگر مغرب کے وقت آفتاب اپنی دھوپ کو سمیٹ کر لچائے تو یہی دیوار جب بھی ہوگی مگر تاریک رہ جائے گی۔ اس سے واضح ہے کہ روشن دیوار میں روشنی خود لگا کر

دھوپ کی ہے اور روشن ہی ہے فی الحقیقت دھوپ نہ کہ دیوار اس کا کام آنا ہی ہے کہ دھوپ سے لگی رہے اور کنکشن صحیح رکھے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع ہو جانے کے بعد ایمان کی روشنی اور گرمی در حقیقت صرف خاتم الانبیاء کی ہے۔ وہی اصل مومن ہیں۔ وہی اصل میں مسور ہیں۔ ہم اور تم مومن کہلاتے ہیں اور صرف اس وجہ سے کہ اس آفتاب ایمان کی ایمانی دھوپ ہم پر پڑی ہوئی ہے تو ہم مومن کہلانے لگے۔ ورنہ حقیقتاً مومن صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ البتہ جب تک ہمارا کنکشن آپ سے صحیح ہے۔ اتباع و پیروی موجود ہے۔ ذہنی بھی اور خارجی بھی۔ ہم بھی مومن کہلائے جائیں گے۔ ورنہ یہ ایمان جو ہم میں نظر آتا ہے۔ محض پر توہ ہے ایمان محمدی کا مستقل ایمان نہیں اگر عیاذ باللہ وامن اتباع چھوٹ جائے اور آفتاب نبوت ہم سے کنارہ کر لے تو پھر بھی ہماری ذات تو باقی رہے گی مگر ایمان باقی نہ رہے گا۔ یعنی آدمی کہلائیں گے مومن نہیں کہلائیں گے۔ پس ہمارے مومن ہونے کے معنی یہ نکلے کہ ہم آفتاب نبوت کی ایمانی دھوپ اپنے اوپر اور اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہونے کہ مومن ہونے کی حیثیت سے ہم خود اپنے سے اتنے قریب

نہیں جتنے حضور اکرم ہم سے قریب ہیں۔ کیونکہ جب ہم مومن ہونے کی حیثیت سے اپنے کو پہنچوائیں گے تو اس کے سوا کیا کہیں گے کہ میں نبی کا غلام اور امتی ہوں یعنی شخصیت مقدرہ کی طرف ہی بست کر دیں گے یہ نہیں کہیں گے کہ میں موحس ہوں میں آخرت کا ماننے والا ہوں میں خدا کو ماننے والا ہوں کیونکہ یہ سب دعویٰ غیر مسلم بھی کر سکتے ہیں ہاں غیر مسلم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم مطیعان محمدی ہیں۔ یہ صرف مسلم ہی کر سکتا ہے جس سے واضح ہے کہ مسلم و غیر مسلم میں امتیاز اتباع محمدی و عدم اتباع محمدی سے ہے اور جبکہ ہماری حقیقت ہی یہ نکلی کہ ہم محمدی مطیع ہیں تو ہماری حقیقت میں پہلے حضور کا ذکر آیا ہے پھر ہمارے نفس کا ذکر آیا ہے تو حضور ہم سے اتنے قریب نکلے کہ ہم خود بھی اپنے سے اتنے قریب نہیں جیسا کہ دھوپ کے ٹکڑوں سے اگر کوئی پوچھے کہ تو کوا ہے تو وہ اس کے سوا کیا جواب دے سکتی ہے کہ آفتاب کا ایک پرتو کیونکہ اس سے الگ ہٹ کر دھوپ کا کوئی وجود ہی نہیں تو آفتاب دھوپ کے نفس سے اتنا قریب نکلا کہ خود دھوپ بھی اپنے نفس سے اتنی قریب نہیں ہے پس اسی طرح مومن سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے تو وہ اس کے سوا کچھ جواب نہ دے سکے گا کہ میں غلام محمدی ہوں گویا اس کے ایمانی وجود کے معنی ہی غلامی محمدی کے ہیں پس مومن اپنے وجود میں خود اپنے سے اتنا نزدیک نہیں کہ اس سے حضور اکرم نزدیک ہیں اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ فرمایا۔

النبي اولى بالمؤمنين
من انفسه و اولي واجد
بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیویاں اُن
کی مائیں ہیں۔

یہاں سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے جو اس زمانہ کے بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ مسلم و غیر مسلم بحیثیت دین کے سب ایک ہیں سب کا ایک ہی مقصد ایک ہی نیت اور ایک ہی منزل مقصود ہے۔ راستوں کا فرق ہے اس فرق سے اقوام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو واضح ہو گیا کہ بلاشبہ منزل مقصود اللہ تک پہنچنا ہے لیکن یہ پہنچنا راستہ ہی کی استقامت سے ممکن ہے۔ راستہ اگر غلط ہے تو وصول بہ منزل ناممکن ہے پس مذہب کا حق و باطل ابتداء مقصد کے اعتبار سے نہیں دیکھا جائیگا۔ راستہ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا جس کا معیار اتباع نبوت ہوگا کیونکہ راستہ نبی کی خبر کے بغیر متعین ہونا ناممکن ہے۔

خدا کا راستہ خدا ہی بتلا سکتا ہے اور خدا کا بتلانا پیغمبروں کے توسط سے ہے۔ ہر ایک انسان سے براہ راست خدا کلام نہیں فرماتا۔ ایسے راستے کے تعین میں پیغمبر ہی کا اتباع ناگزیر ہوگا اور راستہ متعین دوسرے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ ایسے وصول پر منزل کیلئے بیرونی نبوت لازمی ہو جاتی ہے اور جب مقصود اصلی منزل کے صحیح راستے سے منزل تک پہنچنا ہے۔ منزل کا دعویٰ کرنا یا اس کا اعلان کرنا نہیں۔ ایسے وہ اقوام جو مستند طریقہ پر نبوت کی بیرونی نہیں کرتیں۔ منزل مقصود کا محض دعویٰ کرتی ہیں۔ اس کا راستہ جانتی ہیں اور نہ منزل تک پہنچنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔

آفتاب نبوت کی بیرونی میں نجات کا انحصار

پس جیسے طلوع آفتاب کے بعد نور کا ملنا۔ بجز آفتاب کے کسی ستارہ سے ممکن نہیں اور جو بھی طلوع کے بعد کسی ستارہ کے نور کا ہمارا ڈھونڈے گا۔ وہ نور سے محروم رہے گا۔ ایسے ہی ظہور محمدی کے بعد جو بھی نجات کے سلسلہ میں کسی نجم نبوت کا ہمارا ڈھونڈے گا۔ وہ یقیناً نجات سے محروم رہے گا۔ نجات نام دعوائے مقصد کا نہیں وصول مقصد کا ہے اور بغیر نبی وقت کی بیرونی اور اتباع سبیل کے ناممکن ہے۔ اسی لئے آج جب کہ آفتاب نبوت طلوع ہو چکا ہے۔ دنیا کی نجات آخرت اور فلاح دنیا صرف اسی آفتاب نبوت کی روشنی سے مستفید ہونے اور اسی کے نیچے آکر کھڑا ہونے سے ممکن ہے۔ دن میں کسی اور ستارے کے نور کا ہمارا ڈھونڈنا نور سے محروم رہ جانا ہے۔ واللہ یقول الحق ویهدی السبیل ۛ

آفتاب نبوت اور خلافت

مگر ظاہر ہے کہ جب ظہور ختم نبوت بمنزلہ دن کے ہے کیونکہ وہی آفتاب نبوت کے طلوع کا زمانہ ہے تو اس سے خود بخود مفہوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں برس کی رات کے بعد آفتاب نبوت طلوع ہوا جس سے دن نکلا تو اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ آفتاب نبوت کے غروب کے بعد دن چھپے اور رات آجائے۔ پس جیسے آفتاب نبوت کا طلوع ولادت شریف تھی ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب وفات شریف ہے جس سے آپ نے اس جہان سے پردہ فرمایا ہے اور یہ سورج عالم غیب میں جا کر چھپ

گیں۔

سوال ہوتا ہے کہ آپ کے پردہ کر لینے سے کیا اسلام کی روشنی منقطع ہو گئی یا اس رات میں بھی روشنی کی کوئی صورت باقی رہی جس سے دنیا کا یہ اندھیرا اندھیرا نہ رہا، جواب یہ ہے کہ جس طرح مادی آفتاب غروب کے بعد بھی دنیا کو خالص اندھیرے میں نہیں چھوڑتا بلکہ تارے اس کے خلفاء ہیں جو اسی سے نور لیتے ہیں اور دنیا کو دیتے ہیں ان میں کوئی چاند ہے جو آفتاب سے اشرار اور اس کی صفات سے بہت قریب ہے۔ گویا اس کا خلیفہ اعظم ہے جس کا نور آفتاب ہی کی طرح پھیلتا اور نورانی سایہ (چاندنی) لیکر آتا ہے جو دھوپ کے مشابہ ہے اور دوسرے کسی تارے میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے چاندنی رات میں صرف چاند ہی کافی ہو جاتا ہے۔ دوسرے تارے اس کے سامنے ماند رہتے ہیں البتہ اسکے غروب کے بعد چھوٹے بڑے مختلف تارے مل کر کام کرتے ہیں جن کا مجموعی نور رہتا ہوتا ہے اور رات میں بھی کام بند نہیں ہوتا۔ بالخصوص جبکہ مشینی دور ہو تو مشینیں چلتی رہتی ہیں اور دن کا کام ہوتا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے غروب ہونے پر دنیا میں بلاشبہ اندھیرا چھا جاتا لیکن پھر بھی آفتاب نبوت کا نور منقطع نہیں ہوا اور اس نے غروب ہو کر بھی دنیا کو محض اندھیرا ہی میں نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ صحابیت کے روشن ماہ پاروں اور ستاروں کو اپنا خلیفہ بناتے ہوئے پہلے ہی سے فرما دیا تھا کہ

اصحابی كالنجوم بايهم
ميرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کا بھی دامن
اقتديتمو اهتديتمو
سنبھال لو گے۔ ہدایت پا جاؤ گے۔

پس جیسے ستاروں کا نور خود اپنا نہیں ہوتا بلکہ آفتاب ہی کا نور ان میں کام کرتا ہے اور ہر طرف کے مطابق اس نور کا رنگ اور خاصیت الگ الگ ہو جاتی ہے اسی طرح صحابہ ہیں نور علم و اخلاق خود اپنا ذاتی نہ تھا بلکہ وہ آفتاب نبوت کے نور علم عرفان ہی کی جلوہ گری تھی۔ البتہ ان کے قلوب و دماغ کی ساخت اور ظرف کی خصوصیات کے مطابق اس نور کا ڈھلاؤ ان میں ہوا تو رنگ الگ ہو گئے مگر وہ سب رنگ آفتاب نبوت ہی کے تھے کسی میں شجاعت کا غلبہ ہوا۔ جیسے خالد بن ولید اللہ کسی میں سخاوت کا غلبہ ہوا۔ جیسے عبدالرحمن بن عوف کسی میں سیاست کا غلبہ ہوا۔ جیسے عمر بن خطاب کسی میں زہد کا غلبہ ہوا۔ جیسے ابوذر غفاری کسی میں دانش و عرفان کا غلبہ ہوا۔ جیسے حضرت علی کسی میں تفقہ

کا غلبہ ہوا۔ جیسے ابن مسعود کسی میں اجتہاد کا غلبہ ہوا۔ جیسے عبادہ اربعہ کسی میں ملکیت عادلہ کی شان آگئی۔ جیسے امیر معاویہ اور کوئی جامع شہوں نبوت ہوا جو آفتاب نبوت سے اشرہ تھا۔ جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ وہ بمنزلہ چاند کے ہیں جو آفتاب نبوت کے بلا واسطہ خلیفہ اور ظل نبوت ہیں جو غلبہ رحمت میں رحمتہ للعالمین کے اشرہ اور نمونہ نبوت ہیں۔ اس چاند کا نورانی سایہ سورج ہی کے نورانی سایہ کے مشابہ دنیا میں پھیلا۔ جیسے چاندنی دھوپ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ فرق صرف رنگ اور کیفیت اور قوت و ضعف کا ہے۔ دوسرے صحابہ بھی بحیثیت مجموعی خلفا ہیں جو بڑے چھوٹے ستاروں کی مانند ہیں اور سب کے سب نجوم ہدایت میں گمان سے چاندنی اس طرح نہیں پھیلتی جس طرح چاند سے پھیلتی ہے۔ پس نبوت تو ختم ہو گئی مگر خلافت اس کے قائم مقام ہو گئی جو نور نبوت ہی سے مستفید تھی مگر روشنی اور تاثیر میں تفاوت اور فرق مراتب ناگزیر تھا۔ تاہم دنیا سے آفتاب نبوت کا نور کم نہیں ہوا بلکہ ہزاروں ستاروں کے مددوں سے جہن جہن کر ضرفشانی کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ یہ بات ضرور آئی مگر روشن رات تھی جسے لیلہا کنہا رہا اس کی رات بھی دن کی مانند ہے) کا مصداق کہہ سکتے ہیں۔ چاہیے اس لئے اسلامی عمل اس روشنی میں بدستور جاری رہا اور رہے گا۔ ماں پھر یہ رات بھی غیر معمولی طور پر لمبی ہے۔ نیز یہ سینکڑوں برس کی رات ہوگی جو یوم قیامت سے پہلے ختم نہیں ہوگی۔ البتہ جب آفتاب نبوت ہی مندر میں طلوع کرے گا تب ہی دن نکلے گا جسے یوم قیامت اور صبح قیامت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دن دنیا کی ان دونوں راتوں اور دن سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا جس میں ساری دنیا کی زندگی پوری کی پوری دہرا دی جائے گی تاکہ اولین و آخرین پر آفتاب نبوت کا فیضان عام ہوا نزل سے ہوتا آ رہا تھا۔ سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے چنانچہ اس دن ایک ہی جھنڈا بنام (لواء المحمد) ہوگا جس کے تلے سب انبیاء و ائم جمع ہوں گے۔ ایک ہی شفاعت کبریٰ ہوگی جس کے سایہ عاطفت میں تمام امتیں آجائیں گی ایک ہی دست مبارک ہوگا جو جنت کا قفل کھولے گا اور سب نجات یافتہ اقوام کو داخلہ جنت کا راستہ یلگا۔ جیسے نزل میں بھی یہی ایک زبان تھی جس کے نزل میں عہد الست کے رقت بلی پکارنے سے سب کی زبانوں پر بلی کا نعرہ بلند ہوا۔ پھر ایک ہی ذات تھی جس نے بلی کہہ کر اپنے عشق و محبت خداوندی کا ثبوت سب سے پہلے دیا اور اسی کی پیروی سب نے کی۔ گویا آپ ہی نے تعلیم توحید کے ساتھ قلوب کو عشق و محبت الہی کی گرمی سے گرمایا اور سب سے پہلے

عشقی اخلاق سے خلق اللہ کی تربیت کی یا مخلوق کے اندر عشق الہی کی دبی ہوئی آگ کو سلگایا اور ابھار دیا پھر دنیا میں ایک ہی ذات کا علمی معجزہ (قرآن) تھا جو پچھلوں کی کتابوں میں روح بن کر دوڑتا رہا۔

وانہ لفق ذہر الاولین اور اسی قرآن کی روح پچھلوں کی کتابوں میں بھی تھی۔

اور انگوں کے دلوں میں نور ہو کر چمکا پس ایک ہی آفتاب نبوت کی ضیا بارہمی تھی جو ازل اور ابد

میں نمایاں ہوتی رہی اور اولین و آخرین کو روشنی دکھاتی رہی جسے قیامت کے دن جمع شدہ اولین

و آخرین کے سامنے علی رؤس الالہ ہا دکھو لیا جائیگا۔ پس وہ دن بھی آفتاب نبوت کے طلوع

سے نمایاں ہوگا جس میں یہ ساری حقائق روشن کر دی جائیں گی۔

انحصارِ نجات

بہر حال کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے یہ نمایاں ہے کہ جس طرح مادی جہانوں میں رہ کر مادی

آفتاب سے چارہ کار نہیں۔ ایسے ہی روحانی عالموں میں بس کر روحانی آفتاب (آفتاب نبوت) سے

چارہ کار نہیں ہو سکتا۔ دن ہو یا رات واسطہ بلا واسطہ روشنی اسی کی کام کرتی ہے۔ ایسے یہ ماننا پڑے

گا کہ جیسے مادی عالم میں مادی آفتاب کے سایہ کے نیچے آئے بغیر مادی ظلمات اور ظلمانی آفات سے

نجات ممکن نہیں ایسے ہی روحانی جہانوں میں آفتاب نبوت کے دامن تلے آئے بغیر معنوی ظلمات

و آفات، جہل و ظلم، بشہات و شہوات اور فتنہ علم و عمل سے نجات ممکن نہیں، یعنی آفتاب

نبوت کے دور دورہ کے بعد اسکو چھوڑ کر کوئی دوسری روشنی اور ہدایت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ نجات کا

انحصار صرف اسی کی لائی ہوئی روشنی میں منحصر ہے۔

گو پچھلے مذاہب اور انبیائے سابقین کی تعلیمات اپنے اپنے وقت میں سچی اور حق تھیں لیکن

خاتم النبیین کے دورہ کے بعد ان میں نجات ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آفتاب طلوع ہو جانے

کے بعد کوئی روپوش شدہ ستاروں کو ڈھونڈنے اور ان کی روشنی میں راہ چلنے یا راہ پانے کا منصوبہ

باندھنے لگے تو اول تو آفتاب کی تیز روشنی میں لے کر کوئی ستارہ دکھائی ہی نہیں دے گا چہ جائیکہ اس

کی روشنی دستیاب ہو۔ اور اگر بالفرض آنکھوں نے گھور گھار کر آسمان کا کوئی ستارہ ڈھونڈھ ہی نکالا تو

آفتاب کے ہمہ گیر نور میں اسکی گرم شدہ روشنی سامنے نہیں آسکے گی کہ وہ اس میں راستہ طے کر

اور اگر بالفرض وہ اپنے خیال سے کسی حد تک اس میں بھی کامیاب ہو جائے تو پھر بھی وہ راستہ آفتاب ہی کی روشنی میں طے کریگا کہ اس گم شدہ ستارہ کی روشنی میں تو اسے خیالی راہ پیمائی کہیں گے کیونکہ اس جزوی روشنی کا تشخص اور الگ ہو کر نظر آنا سورج کی کلی روشنی میں ممکن ہی نہیں ایسے روشنی حاصل کرنے کا راستہ بجز آفتاب کے سامنے حاضر ہونے، دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس سے الگ رہ کر نجات ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم نے علی الاعلان دین کی قبولیت عند اللہ کا انحصار صرف آفتاب نبوت ہی کی روشنی میں (جس کا نام اسلام ہے) منحصر تھلا یا ہے۔ فرمایا:

ومن یتبع غیر الاسلام دیناً
فلن یقبل منه وهو فی
الآخرۃ من الخسرین ۛ

اور جو بھی (اسلام آ جانے کے بعد) اسلام کے
سوا کوئی دین ڈھونڈے گا تو وہ اس سے
قبول نہیں کیا جاوے گا اور وہ آخرت میں
گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں پہنچ کر سوال یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن نے نجات کو صرف اسلام میں منحصر کر دیا ہے اور دوسری طرف اسی کا یہ اعلان بھی ہے کہ یہ سب مذاہب اپنے اپنے وقت میں سچ اور برحق تھے، جن کی سچائی پر آج بھی ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ مذہب اسلام پر ضروری ہے تو پھر ان پر عمل کرنے اور انہیں دستور زندگی بنانے سے کیوں روکا جاتا ہے، درحالیکہ وہ مسلمہ طریق پر حق تھے اور اب بھی ان میں سے کلیتہً حق نکل جانے کا اعلان نہیں کیا جا رہا ہے غور کیا جائے تو اشکال کا حل بھی اسی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے اور وہ اس طرح کہ اسلام میں نجات کا انحصار مذاہب سابقہ کے بطلان یا ناحق ہونے کی بنا پر نہیں، بلکہ ان کے منسوخ کر دینے جانے کی بنا پر ہے اور نسخ کے معنی ابطال کے نہیں، بلکہ انتہا مدت کے ہیں یعنی اس سابقہ شریعت کی مدت ہی اتنی تھی اور وہ اتنے ہی وقت کے لئے آئی تھی، آخر خود قرآن وحدیث میں بھی تو نسخ موجود ہے اور آیتوں یا روایتوں نے بعض آیات و روایات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ معاذ اللہ غلط یا باطل تھیں، بلکہ ایسے کہ ان کے حکم یا تلاوت کا وقت ہی اتنا تھا، وہ وقت گزر گیا تو ان کا عمل بھی ختم ہو گیا، اسی طرح سابقہ شریعتوں کا مقررہ وقت اور دورہ پورا ہو جانے کے بعد ان کا حکم اور عمل بھی ختم ہو گیا، نئے وقت نے نئے حالات اور نئے ذہن پیدا کر

دیئے جو نئے احکام کے متقاضی تھے۔ ایسے سابقہ ہدایتیں باوجود حق ہونے کے اب کارآمد نہ رہیں تو ان کی قانونی حیثیت ختم کر دی گئی اور نئے احکام لے آئے گئے۔ پس ان کی دستوری حیثیت کو ختم کر دیا جانا ان کے غلط ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ وقت مقررہ ختم ہو جانے اور موافق حال نہ رہنے کی بنا پر ہے۔

یہ ایسا ہی جیسا کہ ایک حاذق طبیب اپنے مریض میں مادہ کاہججان محسوس کر کے اولاد میں بیس دن اے منفع پلائے پھر اُسے ترک کر کے نو دنوں میں تین سہل پلائے اور پھر انہیں بھی ترک کر کے نو دن تبریہ کا نسخہ استعمال کرائے اور پھر اُسے بھی ترک کر کے ایک مہینہ مقویات کھلائے اور پھر انہیں بھی چھڑا کر روزمرہ کی غذا پر لگا دے جو عادت ہر صحت مند انسان بارہ مہینہ کھاتا ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ دس بیس دن میں منفع کا پھر ادینا اور نو دن کے بعد سہل کے نسخہ کا ترک کر دینا اور پھر نو دن کے بعد تبریہ ترک کر دینا اور آخر کار مقویات کے نسخوں کو بھی منسوخ کر دینا ان سب نسخوں کے غلط ہونے کی بنا پر تھا اور گویا طبیب نے اپنی دانست میں غلطی کی تھی جس سے وہ نادام ہوتا رہا اور ان غلط نسخوں کو پھر اتار دیا؟ نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ طبیب نے اپنے اپنے وقت پر تیار کیے صحیح استعمال کرائے لیکن ہر نسخہ ایک مقررہ وقت کیلئے تھا اور وقت کی تحدید اس لئے تھی کہ اس مریض کی طبیعت کی تبدیلیاں اور صحت کی طرف اس کے رخ کے مائل ہوتے رہنے کے یہ اوقات طبعی تھے جیسے جیسے وقت گزرتے رہتے پر مریض کی طبیعت بدلتی رہی اور متبادل نسخے اس کی صحت کی استعداد کو تدریجاً آگے بڑھاتے رہے ایسے ایسے سابقہ نسخے منسوخ ہوتے رہے اور اسی جگہ نئے نسخے لیتے رہے اور جب ان متبادل نسخوں سے اصل صحت حاصل ہو گئی تو سارے نسخے مریض کے حق میں ختم کر کے اصل عندیہ پر اس کا قرار و استقرار عمل میں آگیا۔ پس یہاں نسخوں کے غلط یا باطل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح عالم بشریت دنیا کے تغیرات سے ایک مریض نفس کی مانند ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معالج ہیں کسی روحانی طبیب نے اسے روحانی منفع پلایا تاکہ اخلاقِ ردیہ کا مادہ پک کر قابلِ اخراج ہو جائے کسی نے سہل دیا کہ مادہ اخراج ہو جائے کسی نے تبریہ کا نسخہ دیا کہ سہل سے پیدا شدہ گرمی خارج ہو جائے کسی نے مقویات دے کر روح میں قوت

آجائے اور کسی نے اصل فطری غذاؤں سے علاج کیا کہ بقاریات بھی ہو اور دفع مرض بھی ہو جائے پھر اس عالم بشریت کے اعضاء مختلف اقوام میں اور ہر قوم کا مرض جداگانہ ہے جیسے ہر عضو کی بیماری اس کے ہی مناسب حال الگ الگ ہوتی ہے اور جیسے ہر مرض کے ماہر ڈاکٹر جدا جدا ہوتے ہیں جو خاص اسی عضو کا علاج کرتے ہیں اسی طرح دنیا میں یہ اطباء نے روحانی دانیار علیہم السلام) مختلف اقوام اور مختلف خطوں میں تشریف لائے اور اسی قوم کے مخصوص امراض کے لئے مخصوص قسم کے نسخے ساتھ لائے جن سے قومیں حسب استعمال دوا شفا پاتی رہیں جو درحقیقت اس عالم بشریت کی صحت تھی اس لئے عالم بشریت ان اطباء نے روحانی کے مختلف المزاج نسخے استعمال کر کے صحت مندی کی طرف بڑھتا رہا اور جو نسخہ اپنی تاثیر دکھلا کر ان اعضاء بشریت کو صحت کی طرف بڑھتا رہا کہ اگلا نسخہ اگلا عمل کرے تو وہ سابقہ نسخہ نیا نسخہ آنے کے بعد ختم ہوتا رہا اور نیا اس کی جگہ سنبھالتا رہا پس نیا نسخہ چونکہ اپنا عمل اس استعداد پر کرتا تھا جو پہلا نسخہ یہاں چکاتا تھا اس لئے پہلے نسخہ کو غلط نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ اپنے وقت میں ایسے ضروری اور صحیح اور مناسب وقت تھا کہ اس کی کارفرمائی کے بغیر نئے نسخہ کی کارفرمائی ظاہری نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ان سابقہ نسخوں کی منسوخی کے معنی ان کے باطل ہونے کے نہ ہوں گے بلکہ موقت ہونے کے ہوں گے جس کا ختم ہو جانا خاتمہ وقت پر ضروری اور لوازم علاج بدن سے تھا جو اس کے صحیح اور جزو طب ہونے کی دلیل ہے نہ کہ باطل و خارج از طب ہونے کی پس یہ نہیں کہا جائے گا کہ سابقہ نسخہ کی تبدیلی میں طبیب کو ندامت کے ساتھ رجوع کرنا پڑا اور اس نے اپنی غلطی محسوس کر کے نسخہ بدلا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ لائق ہے کہ ذہن میں پہلے ہی سے اس نسخہ کا وقت آنا ہی تھا جب سابقہ دوا اپنا کام کر چکی اور اس سے صحت کا ایک خاص درجہ آپہنچا جو مقصود تھا تو طب نے اسے چھڑا دیا کہ اب اسکا استعمال مریض کے موجودہ مزاج کے لئے مضر تھا یہی صورت شرائع سابقہ اور شرائع مابعد کی بھی تھی کہ حکیم مطلق کے علم اذلی میں ان سابقہ مذاہب کے شرعی نسخوں کی نفع رسانی کا مقررہ وقت پورا ہوتے رہنے پر اصول طب کو بدستور باقی رکھ کر یہ شرعی نسخے بدلے جاتے رہے جبکہ وہ انبوالی دنیا کے مزاج اور اسکی ترقی پذیر ذہنیت کے حسب حال نہ رہے تھے ایسے نسخہ شرائع کے معنی تغلیظ شرائع یا ابطال مذاہب کے نہ ہوں گے بلکہ انتہائی ندامت کے ہوں گے جو تبدیل

ذہنیت کے معیار سے ہوتی رہی ہے۔

خود اسلام میں بھی کتنی ہی شرائع اپنے ابتدائی اوقات میں اس رنگ کی ذہنیتیں جس پر وہ آخر کار آکر رکھیں اور ٹھہر گئیں۔ مثلاً ابتداء اسلام میں نماز میں نفل و حرکت سلام و کلام اور رُخ کا ہیرا پھیر اور مخاطب و مکالمہ سب جائز تھا۔ لیکن جیسے جیسے ذہنیت تربیت یافتہ ہو کر ترقی یافتہ ہوتی رہی اور اس حد پر آگئی کہ نماز کی شائستگیوں کو اٹھا سکے۔ ویسے یہ سب آزادیاں بتدریج منسوخ ہوتی گئیں اور وہ ترقی یافتہ ہیئتہ آخر کار آکر پائیدار اور برقرار ہو گئی۔ جواز سے شرع حقیقی کی نگاہ میں متعین تھی تو کیا یہ کہا جائے گا کہ نماز کی یہ ابتدائی صورتیں معاذ اللہ باطل تھیں؟ نہیں ورنہ ان کا اجرا و نفاذ ان پر اجر و ثواب کا وعدہ اور ان کے حق میں قبولیت عند اللہ کا وعدہ کیوں ہوتا؟ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس وقت کی قوم اور ابتدائی ذہنیت کے لئے وہ کافی ضرورت تھیں۔ مگر خود نامہ تمہیں کہ فی الحقیقت ذہن ہی تھی قوم کا ابتداء میں نامتساہ تھا۔ جتنا جتنا تھی قوم کا مزاج اور ذہن اسلامی رنگ کے لحاظ سے شائستہ بخیرہ اور پختہ ہوتا گیا۔ اتنی اتنی وہ آخری اور مطلوب ہمتیں آ کر قائم ہوتی گئیں جو پہلے سے علم الہی میں طے شدہ تھیں۔

اس حقیقت کو واضح کر کرنے کے لئے یہ مثال کافی ہوگی کہ ایک نوپید بچہ کے لئے قدرت نے ماں کے دودھ کی غذا تجویز کی۔ جب وہ دو برس کا ہو گیا اور کچھ دانت نکل آئے تو شیر خوار ہی منسوخ کر کے ہلکی غذائیں رکھیں جو بچہ ہضم کر سکے۔ جب پکے دانت نکل آئے اور ثقیل و سخت غذائیں ہضم کرنے کی قوت اسے مل گئی تو یہ بھی منسوخ ہو کر آخر کار وہی غذائیں آگئیں اور باقی رہ گئیں جو عادتاً سارے انسان استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ کہا جائے گا کہ معاذ اللہ نوپید بچہ کے لئے شیر خوار ہی تجویز کرنے میں قدرت نے غلطی کی تھی جسے دو برس کے بعد منسوخ کرنا پڑا پانچ سال بچہ کے حق میں ہلکی پھلکی نرم غذاؤں کی منسوخی اسلئے عمل میں آئی کہ وہ غلط تھیں؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ بچہ کے حالات کے لحاظ سے یہ منسوخ شدہ غذائیں لیتے ہی لیتے اوقات کے لئے رکھی گئی تھیں۔ جب وہ وقت اور حال گزر گیا اور بچہ کی ابتدائی حالت تبدیل ہو کر قوت حد کمال پر آگئی تو وہ غذائیں بھی گزر گئیں اور وہی کامل غذائیں آگئیں جو ایک پختہ انسان کے لئے ہوتی ہیں اور مرتے دم تک رہتی ہیں۔ آپ اسی طرح عالم بشریت کو بھی سمجھ لیں کہ اس پر بھی ایک دور طفل کا گذرا ہے جو آدم و نوح علیہما السلام کے درمیان کا

زمانہ ہے۔ اس لئے اس وقت کی تعلیم و عبادت بھی مختصر اور ہلکی پھلکی تھی تعلیم کے درجہ میں صرف اشیا کے نام سکھلا دیئے گئے جو آدم علیہ السلام کو تعلیم کئے گئے تھے۔

اور عبادت کے درجہ میں فقط ایک وقت کی نماز اور وہ بھی صرف بصورت سجدہ بتلا دی گئی۔ جیسے بچوں کو ابتداء میں چیزوں کے نام ہی بتلائے جاتے ہیں کہ یہ آسمان ہے۔ یہ زمین یہ روٹی ہے اور یہ پانی وغیرہ اور عبادت کے سلسلہ میں کسی ایک آدھ وقت بھی بچہ کو اگر مسجد میں لے آتے ہیں تو اس کے حق میں اُسے ہی بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور بطور حوصلہ افزائی کے کہا کرتے ہیں کہ ماشاء اللہ بچہ بڑا نمازی ہو گیا ہے مگر جیسے جیسے یہ عالم بشریت جوانی اور قوت کی طرف بڑھتا رہا اور اس کے ذہنی اور دماغی قومی قومی ہوتے گئے۔ ویسے منضبط شریعتیں اترتی رہیں اور اصول کی بقا کے ساتھ احکام اور عملی پروگرام میں حسبِ مزاج بشریت تبدیل ہوتی گئی اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ پہلے احکام غلط تھے۔ اس لئے وہ بدل دئے گئے۔ جیسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم غلط تھی۔ ایسے اسے منسوخ کر کے انتہائی تعلیم لائی گئی یا مثلاً بچہ ابتداء میں تتلانی ہوئی زبان سے بولتا ہے اور جمل جمل کمر آتی جاتی ہے۔ زبان صاف ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر یہی تتلا بچہ زمانہ کا زبردست فصیح و بلیغ اور قادر الکلام خطیب بن جاتا ہے اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ تتلا پن بچہ کے حق میں غلط تھا۔ اس لئے قدرت نے اُسے زبان کی صفائی بخشی بلکہ یہ کہا جائیگا کہ تتلا پن نو عمر بچہ کی ابتدائی ساخت کا قدرتی تقاضا تھا اور صاف کلامی پختہ عمر کی زبان اور اس کے قومی کی ترقی کا قدرتی نتیجہ ہے جو اپنے اپنے وقت ضروری اور موزوں تھا۔ اسی طرح شریعتوں کا ابتدائی دور اپنی ذات اور اپنی تعبیر کے لحاظ سے ابتدائی حالت میں تھا کہ عالم بشریت ہی ابتدائی حالت میں تھا۔ جیسے عالم بشریت تکمیل قومی کی طرف بڑھتا رہا۔ اسی طرح اس کی شریعتیں اور شریعتوں کی تعبیریں بھی کامل و مکمل ہوتی گئیں۔ اب اگر اس ترقی پذیر رفتار سے اس کی شریعت اور اس کی تعبیر اپنی کسی ایسی آخری حد پر آجائے کہ اسکے بعد ترقی ممکن نہ ہو جس سے پچھلی شریعتیں اور تعبیریں متروک اور منسوخ ہو جائیں تو یہ تیسخ یا تبدیل معاذ اللہ کسی احساس غلطی کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ بلکہ حالت کی ترقی پذیر رفتار کا قدرتی تقاضا شمار ہوگا۔ پس دین اگر اول سے آخر تک ایک ہی رہے۔ لیکن اس کے نشوونما کے لحاظ سے اس کے شرعی لباس بدلتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب نشوونما مکمل ہو جائے تو لباس کی پیمائش

ایک حد پر اگر رک جائے تو اس میں کیا قباحت اور کیا عقلی پیچیدگی ہے کہ اُسے ماننا خلافِ عقل یا خلافِ طبع سمجھا جائے آخر ایک نوپید بچہ کا پیدائش کے وقت لباسِ بالشت بھرے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جیسے جیسے بچہ بڑھتا رہتا ہے سابقہ لباس منسوخ ہو کر نئی نئی پیمائش کا لباس آتا رہتا ہے یہاں تک کہ بچیس تیس برس کی عمر میں جب اس کا نشوونما مکمل ہو جاتا ہے تو لباس کی پیمائش بھی ایک خاص حد پر اگر رک جاتی ہے اور وہ آخری پیمائش بالآخر عمر بھر قائم رہتی ہے تو جس طرح یہ تبدیلی کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی احوال و عوارض کی بنا پر ہوتی ہے ایسے ہی دین کے شرعی لباس یعنی شرائع کی تبدیلی بھی دین کے قد و قامت کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے معاذ اللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی اور جیسا کہ تدریجی ترقی اور پیالے تبدیلی کے بعد اختتام نشوونما پر آخری پیمائش قائم و دائم ہو جاتی ہے جس میں پھر تبدیلی نہیں ہوتی پس دین کی تکمیل کے بعد قدرتاً یہ تبدیلی بند ہو کر آخری پائیدار حالت آجاتی قدرتی ہے جو پھر تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اس سے صاف واضح ہے کہ شریعتوں کی تبدیلی دنیا کی اقوام کی ذہنیاتوں کے تفاوت سے ہوتی اور اس وقت تک ہوتی رہی جب تک کہ انسانی معاشرہ کا مجموعی مزاج حد کمال پر نہیں آگیا۔ ذہن اور مزاج کی تکمیل ہونے ہی قدرتی بات تھی کہ دین بھی کامل کر دیا جائے۔ شریعت بھی ناقابلِ تبدیل بھیجی جی جائے۔ قوانین احکام اور پروگرام بھی ناقابلِ تنسیخ آثار دیئے جائیں۔ سو وہی آخری اور قائم و دائم دین اور آخری شریعت اور آخری آئین و قانون خاتم النبیین کا دین و آئین ہے جس کے بعد نہ نیا دین آئے گا نہ دین میں کمی بیشی ہوگی۔ اس کے بعد بھی سابقہ منسوخ شدہ شرائع میں نجات تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی تبرید کے نسخہ کے بعد لوٹ کر پھر منفع کے ابتدائی نسخہ میں شفا و صحت تلاش کرنے لگے یا کامل الغذاء انسان اپنی بقا کے لئے لوٹ کر پھر ماں کا دودھ پینے لگے ایک چھوٹے انسان بدن کی راحت و زینت کے لئے لوٹ کر پھر وہی اپنی پیدائش کے وقت کا بالشت بھر کا کرتہ پہننے کی کوشش کرنے لگے یا ایک فاضل اور مہتمی طالب علم پھر سے لوٹ کر صرف و نحو کی ابتدائی کتابوں سے علم کی تلاش میں لگ جائیں یا ایک قادر الکلام خطیب پھر سے لوٹ کر بچپن کی تلافی ہوئی زبان بولنے میں فصاحت و بلاغت کا تخیل باندھنے لگے تو جیسے ان لوگوں کو اس ترقی معکوس کے تخیل پر احمق کہا جائے گا ایسے ہی دینِ کامل اور شریعت خاتم النبیین کے دورِ دورہ کے

بعد ابتدائی شراعی میں نجات ڈھونڈھنے والے کو بھی اسی قسم کا کوئی خطاب دیا جاسکے گا۔

اگر آپ غور کریں تو یہ نسخ شراعی اور انحصار نجات کی حقیقت بھی اسی آفتاب کی تکمیل میں موجود ہے کیونکہ آسمان پر کروڑوں تارے یکے بعد دیگرے دنیا کو نور پہنچانے کے لئے طلوع ہوتے ہیں جس کا رنگ الگ ہوتا ہے اور تاثر الگ جیسے جیسے بڑے تارے آتے جاتے ہیں چھوٹے تاروں کا نور ان کے نور میں گم ہوتا رہتا ہے اور اب دنیا کی نگاہ صرف ان بڑے تاروں پر لگ جاتی ہے اور انہی کی روشنی کو سامنے رکھ لیتی ہے چھوٹے تارے نہ انکھوں میں آتے ہیں نہ ان کی روشنی ہی سامنے ہوتی ہے پھر چاند نکلنے پر یہ بڑے تارے بھی پھیکے بلکہ ایک حد تک بے نور سے نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی روشنی راہ نماباقی نہیں رہتی مگر آخر کار جب آفتاب نمایاں ہوتا ہے تو چاند بھی موٹھ چھپا لیتا ہے اور پھر دنیا کی نگاہ کے سامنے ذات بھی اگر نمایاں ہوتی ہے تو سورج کی اور روشنی بھی دکھائی دیتی ہے تو صرف اسکی نیز تاثر (حرارت) بھی محسوس ہوتی ہے تو صرف اسی کی گویا نگاہوں میں عذاب کوئی تارہ باقی رہتا ہے نہ کسی کی روشنی اور تاثر ظاہر ہے کہ یہ تاروں کا نمایاں ہو کر چھپا دیا جانا، معاذ اللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ قدرت نے ابتدائی تاروں کی نمائش میں غلطی کی تھی جس سے آخر کار چاند اور پھر سورج کو لانا پڑا؟ نہیں بلکہ ابتدائے شب میں انسانی معاشرہ کے مزاج کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ اسے ہلکی اور ٹھنڈی روشنی ملے تاکہ وہ معمولی کام کاج کر کے شب باش ہو جائے لیکن آخر شب میں جب نیند بھر چکتی ہے اور دنیا کا مزاج تمدن و معاشرت کے بڑے سے بڑے کام انجام دینے کے لئے مستعد ہو جاتا ہے جس کے لئے اسے تیز روشنی اور مزاج کے ابھار کے لئے قومی حرارت درکار ہوتی ہے تو اسی وقت خاتم الانوار کو چمکا دیا جاتا ہے جو پچھلے انوار کو منسوخ کر کے صرف اپنا نور پھیلا دیتا ہے۔ نہ اسلئے کہ پہلے انوار غلط تھے بلکہ اس لئے کہ ان کا وقت ہی اتنا تھا پس جتنے وقت پر وہ اور ان کی روشنی دنیا سے اوجھل کر دے گی۔ اتنا ہی ان کا وقت اور دورہ کار گزار ہی تھا پھر بھی اگر کوئی سورج کی روشنی نمایاں ہو جانے کے بعد انہی ابتدائی شب کے تاروں کی روشنی میں ظلمت سے نجات پانے کا متلاشی ہوگا تو اسے کوئی بھی عقلمند انسان عقلمند کہنے کی جرأت نہ کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح خاتم النبیین کی نبوت اور شریعت آجانے کے بعد ابتداء کی شریعتوں کے گزرے ہوئے

انوار میں نجات ڈھونڈھنا اور انہیں کو ابدال بالاد تک باقی رکھنے کی آرزو باندھنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی طلوع آفتاب کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رات ہی کے باقی رہنے اور ستاروں ہی کے قائم رہنے کی خواہش رکھے۔ سو اگر یہ خلاف فطرت ہے تو وہ بھی خلاف فطرت ہے۔ اس لئے اصول کے طور پر متعین ہو گیا کہ دورہ خاتم کے بعد ابتدائی اور درمیانی دوروں کے قوانین و معمولات نجات دہندہ نہیں بن سکتے اب اگر باقی رہتا ہے تو صرف یہ کہ وہ آخری دور کون سا ہے اور کس کا ہے اور کون خاتم النبیین ہیں۔ جن کی آمد کے بعد قوانین سابقہ سب منسوخ ہو کر صرف انہی کے بتائے ہوئے قافلوں میں نجات کا انحصار ہو چکا ہے؟

سو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق واقعات سے ہے اور واقعات کے ادراک کے لئے انسان کو دو ہی عظیم قوتیں دی گئی ہیں۔ ایک سمجھ کہ کسی مخبر صادق سے آدمی واقعہ کو سن کر یقین کرے اور دوسرے بصر کہ آثار و شواہد دیکھ کر ذمی اثر کا یقین کرے۔ جیسے دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر سورج کے نکلنے کا یقین کیا جاتا ہے۔ سو جہاں تک خبر صادق کا تعلق ہے۔ کون نہیں جانتا کہ خاتمیت کا دعویٰ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نے نہیں کیا۔ آدم علیہ السلام تو اول النبیین ہیں۔ وہ خاتم ہونے کے دعویٰ کیسے فرما سکتے تھے۔ اولوالعزم پیغمبروں میں نوح علیہ السلام کا بھی یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ خاتم النبیین ہیں اور کیسے ہوتا۔ جبکہ فرمایا کہ وہ بھی ایک درجہ میں اول النبیین ہی تھے۔ جنہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد ساری دنیا کی نسل انہیں سے چلی اور وہی اول نبی تھے جنہوں نے عالم میں کفر کا مقابلہ کیا۔ سو ابتداء عالم بشریت میں اگر نبوت ختم کر کے مکمل کر دی جاتی تو ایسا ہی ہوتا جیسے بچپن ہی میں کسی کو آخری حکمت کی تعلیم دی جانے لگی اور مبادی ترک کر دیئے جائیں جو سراسر خلاف فطرت ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم ہیں بلکہ انہوں نے تو اور دعایہ مانگی کہ اے اللہ میری اولاد میں ایسا اور ایسا عظیم الشان نبی پیدا فرما۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے تو آئین شریعت لانے والے اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ خدا کے پہلے گھر میں داخل ہونے والے پیغمبر کی خبر دی۔ حتیٰ کہ اس کی امت تک میں سے ہونے کی تمنا کی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ انہوں نے تو اپنے آنے کی بڑی عرض و غایت ہی اگلے عظیم پیغمبر کی آمد کی بشارت سنانا

ظاہر کی۔ ہاں یہ دعویٰ اگر کیا تو حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم نے کیا اور فرمایا کہ میں ہی قہر نبوت کی آخری اینٹ ہوں۔ میں ہی وہ ہوں کہ جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ میں ہی وہ ہوں کہ جس پر دین کی تکمیل ہوگئی اور میں ہی وہ ہوں کہ اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے بغیر انہیں بھی چارہ کار نہ تھا پھر ان کے خدا نے بھی انہیں ہی خاتم النبیین فرمایا اور کسی کو نہیں فرمایا نام یک فرمایا کہ

ماکان محمد ابا احد من رجالکم محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین؛ نہیں تھے لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین
تھے۔

اس لئے سچی اور مستند نقل و خبر کی روشنی میں یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور ان ہی کا یہ دور آخری دور ہے جس کے بعد کسی شریعت و نبوت کا کوئی اور دور آنے والا نہیں۔

نقل و روایت کے بعد اب سوال عقل و روایت کا رہ جاتا ہے کہ کیا عقل اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ نبی وہی آخری نبی اور یہ شریعت وہی آخری شریعت ہے؟ حالانکہ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا کیونکہ سابق میں شریعتوں کی تبدیلی و تنسیخ کا اصول انسانی ذہن کی تبدیلی اور اس کا تدریجی ارتقار قرار دیا گیا ہے تو کیا یہی صورت آج بھی نہیں ہے کہ انسانی ذہن تبدیلیوں اور انقلابات کا محور بنا ہوا ہے بلکہ آج کی دنیا میں ذہنی تبدیلیاں شاید پہلے کی دنیا سے بھی کہیں زائد ہیں۔ روز روز نظریات تبدیل ہو رہے ہیں اور انسانی مزاج بدلتا جا رہا ہے تو کیسے کہہ دیا جائے کہ انسانی ذہن کسی ایک حد پر آکر ٹھہر گیا ہے جس کے بعد تبدیلی نہیں تو پھر سمجھ لیا جائے کہ یہ شریعت آخری شریعت ہے جس کے بعد نئے ذہنوں کو اپیل کرنے والی کوئی شریعت آنیوالی نہیں؟

اس اشکال کو حل کرنے کے لئے اسی تبدیلی ذہن کے اصول پر غور کیجئے جس پر غور نہ کرنے سے اشکال پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں مختلف شریعتوں کے آنے اور ایک ایک وقت میں کئی کئی نبوتیں اور کئی کئی شریعتیں رائج ہونے کی بنا درحقیقت دنیا کے مزاجوں کے تفاوت کی رعایت تھی تاکہ ان کے حسب حال اور مزاجوں کی مناسبت سے انہیں تربیت دیا جاسکے اور انہیں کے رنگ طبع

کے موافق انہیں خدا کی بندگی اور عبودیت کے لئے تیار کیا جاسکے کیونکہ جب تک مرنے اور سامانِ تربیت موافق مزاج اور حسبِ حال نہ ہو آدمی تربیت سے اثر نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کہ اگر مزاجوں اور ذہنوں کے احوال کی رعایت کئے بغیر ایک ہی قانون ان سب کو لا کر دیا جاتا جسکا ان کے مزاجوں میں مشرق و مغرب کے بعد کے ساتھ مشرق و مغرب ہی جیسا تفاوت قائم تھا تو وہ کبھی بھی اصلاح پذیر نہ ہو سکتے اگر قوم سخت مزاج ہے تو شرعی قانون میں بھی شدت اور سختی ہی کے رنگ کی ضرورت ہوگی۔ نرم قانون اس مزاج کی قوم کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ نرم قوم ہے تو سہل اور ملائم احکام کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں سختی قانون کا اگر نہیں ہو سکتی، حکمت پسند قوم ہے تو قانونِ تربیت بھی حکیمانہ رنگ کا ہونا چاہیے اور سادہ لوح قوم ہے تو قانون کی بھی سادگی ناگزیر ہے۔ بچوں کے لئے ابتدائی درجہ ہی کی تعلیم مفید ہوتی ہے۔ اگر انہیں حکمت کی اونچی باتیں ابتدائی میں بتائی جانے لگیں تو وہ کبھی بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے اور بڑوں کے لئے اونچی باتیں اور اونچی تعلیم ہی موثر ہو سکتی ہے اگر انہیں حروفِ ابجد سکھائے جانے لگیں تو وہ ہنس کر استاد کو بھی ٹھکے بنا دیں گے۔ اس لئے شریعتیں دنیا میں حسبِ مزاج اقوام لائی گئیں اور مرتبہ ان شریعتیں (انبیاء علیہم السلام) بھی مختلف قوموں کے حسبِ حال ہی تعلیم و تربیت کے مختلف پروگرام لیکر مبعوث ہوئے۔

جیسے ارشادِ حق ہے :-

نکل جعلنا منکھ شرعة و ہم نے تم میں سے ہر ایک قوم کے لئے
منہا جا :- ایک شریعت اور ایک راہ رکھی۔

جس سے شریعت کا اختلاف ثابت ہے۔ اسی کو حدیثِ نبوی میں بطور تشریح بیان اس انداز سے ظاہر فرمایا گیا کہ :-

نحن معاشر الانبیاء بنوا للعلات ہم انبیاء کی جماعت علاقائی بھائی ہیں۔ باپ ہمارا
ابونا واحد و امہاتنا شتی (یعنی دین) ایک ہے اور مائیں ہماری (یعنی
شریعتیں) الگ الگ ہیں۔

اس لئے یہ مقدسین کرام انبیاء علیہم الصلوات والسلام ہر قوم میں الگ الگ اور ہر خط
میں حسبِ احوال ہی مجھے گئے۔

وان من امة الاخلافيها کوئی امت نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا
نذیر ۛ نہ آیا ہو۔

ولكل قوم هاد ہر قوم میں ہادی آیا۔
ولكل امة رسول ۛ ہر امت میں رسول آیا۔

نیز حسب رنگ اقوام رنگ بھی مختلف لیکر آئے۔

یہود تند خو تھے تو موسیٰ علیہ السلام جلال پیغمبر دیئے گئے۔ نصاریٰ نرم خو تھے، تو
عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلال پیغمبر دیئے گئے۔ سبکی قوم بادشاہت پسند تھی تو سلیمان علیہ السلام
جیسے شانہ رنگ کے پیغمبر دیئے گئے۔ نرود کی قوم نجومی رنگ کی تھی تو ابراہیم علیہ السلام جیسے
عارف ملکوت سموات پیغمبر عطا کئے گئے۔ غرض جیسا قوم کا رنگ ہوا، ویسا ہی رنگ
پیغمبری بھی رکھا گیا۔ پھر اسی عنوان سے کتابیں بھی مختلف آئیں اور مختلف انداز کے اصول تربیت
لیکر آئیں۔ جن پر انہی کی قدر مخاطب امت کی آخرت میں جزا رکھی گئی۔

كل امة تدعى الى كتابها ہر امت اپنی ہی کتاب کی طرح بلانی جائے
اليوم تجزون ما كنتم گی آج کے دن تم کو اپنے کئے کا جو اس

تعلون ۛ کتاب کے مطابق تھا، بدلہ دیا جائیگا

اسی اصول پر قبلے مختلف رکھے گئے تاکہ مختلف امتیں اپنے اپنے رنگ سے ان
کی طرف رخ کر کے یاد خداوندی میں لگیں۔

ولكل وجهة هو موليها ۛ اور ہر امت کے لئے ایک جہت ہے۔
جس کی طرف وہ رخ رکھتی ہے۔

مہر حال ہر قوم میں ہر خطہ میں انبیاء آئے اور ان قوموں کے مناسب حال شریعتیں اور قانون
حق کی کتابیں لائے۔ جن سے ان کی اصلاح فرمائی۔ ایسے صاف واضح ہے کہ ہر قوم کا قانونی
مزاج الگ الگ تھا۔ ایسے اس کا قانون بھی اسی کے حسب حال الگ تھا جس سے دوسری قوموں
کے مزاج میل نہیں کھاتے تھے اور جو قانون ایک کے لئے تھا، وہ دوسری کے لئے نہ تھا۔ شریعتیں
بھی الگ الگ تھیں اور نبوتیں بھی حسب حسب اصول میں متحد مگر پروگرام میں مختلف۔

اس سے یہ نتیجہ باسانی نکل آتا ہے کہ ان قومی اور وطنی شریعتوں میں کوئی شریعت بھی ساری دنیا کے لئے نہ تھی اور اس لئے نہ تھی کہ وہ ایسی اصولیت و کلیت اور جامعیت لے کر نہیں آئی تھی کہ دنیا کی ساری مختلف المزاج اور مختلف مذاق قوموں کے لئے تنہا کافی ہو جاتی جیکہ دنیا کی اقوام ہی میں خود ایسی اصولیت و کلیت اور ہمہ گیر مزاج کی استعداد نہیں آتی تھی جو بین الاقوامی قانون کی متقاضی اور طلبگار ہوتی اور کسی ایک ہی جامع راستہ اور قدر مشترک یا اصولی نقطہ پر ان اقوام کو جمع کر سکتی اس کی تکوینی اور قدرتی وجہ تو یہ تھی کہ عالم بشریت کی استعداد تدریجاً ہی بڑھی ہے۔ اکدم مکمل نہیں ہوئی۔ جیسے سچے تدریج ہی شباب اور بلوغ تک پہنچتا ہے۔ درخت تدریج ہی تناور درخت ہوتا ہے اور پھل دیتا ہے اور اس لئے اسکی ابتدائی اور درمیانی حالت طبعاً نامتام ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عالم بشریت کے اجزاء تدریجاً بلوغ تک پہنچتے ہیں۔ خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوان و انسان تو قدرتی بات ہے کہ وہی تدریج اس کے مجموعہ کی صفت بھی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ عالم کے اجزاء نبات و حیوان اور بشر و انسان تو بتدریج حد کمال تک پہنچیں اور مجموعہ یکدم بام ترقی پر پہنچ جائے جیکہ مجموعہ نام ہی ان اجزاء کا ہے۔ جن میں تدریج مشاہدہ کی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ بلوغ سے پہلے پہلے کی حالت ناقص اور نامتام ہی کہلائی جاسکتی ہے اگر وہ حد کمال ہوتی تو اسے اگے کیوں بڑھایا جاتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نامتام یا کمزور حالت کے احکام الگ ہوتے ہیں اور حالت بلوغ کے احکام نابالغ پر اور بالغ پر نابالغ کے احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے تکمیل انسانیت بھٹنے بھی درمیانی قوانین تھے۔ وہ نامتام ہی انسانیت کے لئے تھے اس لئے وہ خود بھی انسانیت کی طرح تکمیل طلب تھے۔ ایسے جیسے جیسے انسانی معاشرہ حد کمال کی طرف بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے دینی قوانین بھی بتدریج شباب و کمال کی طرف بڑھتے گئے اور جوں جوں انسان کی طبعی مدنیت کے چولے وسیع اور فراخ ہوتے رہے اور اسکا تمدن ترقی کرتا گیا۔ اسی قدر دین کے شرعی لباس اور شریعتوں کے چولے بھی اپنے اندر وسعت و فراخی پیدا کرتے گئے۔ تاکہ انسانیت کی تربیت اس کے ذہن اور مزاج کے حسب حال ہو سکے۔ حاصل یہ ہے کہ دین تمدن کی وسعتوں کی حد تک ہی وسیع ہوتا گیا ہے۔ تمدن کے بھٹنے گوشے پیدا ہوتے گئے اور ان

کے راستہ سے انسان کے لئے گمراہی کے احتمالات اور واقعات رونما ہوتے گئے۔ اسی حد تک ہدایتوں کے گوشے بھی پھیلنے گئے تاکہ ہر ضلالت کے ذخنے کا ہدایت سے سدباب کیا جا سکے اور اسی لائن سے انسان کو اس کے مالک و خالق کی طرف متوجہ کیا جاسکے۔ پس ادیان کی یہ تدریجی ترقی و تکمیل حسب تدریج انسانیت طبعی تھی جس پر یقین لانے کے لئے ظاہری اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

تاہم جبکہ ہر حقیقت کیلئے اس عالم اسباب میں جو بلاشبہ قدرتی کارخانہ ہے، اظہارِ قدرت کے لئے اسباب بھی رکھے گئے ہیں، اس نئے دنیا کے ابتدائی اور وسطی زمانوں میں دین کا قومیتوں اور وطنوں کی حد بندیوں میں محدود رہ کر وسیع اور ہمہ گیر نہ ہونا یا بالفاظ دیگر تکمیل طلب رہ کر استعداد کی زبان سے آخری تکمیل مانگتے رہنا۔ جیسے قدرتی ہے ویسے ہی ظاہری اسباب سے سوجر بھی ہے۔ وہ وجہ ہے کہ ہمہ گیر اسباب و وسائل نہ ہونے اور ناواقف طبیعتوں کے ان کی طرف متوجہ نہ ہونے کے سبب ہر قوم دوسری قوم سے الگ، ہر خطہ دوسرے خطہ سے کٹا ہوا اور ہر ملک دوسرے ملک سے بے تعلق رہتا تھا۔ عمومی ریل میل تھا نہ ہمہ گیر خلط و اختلاط۔ ہر قوم دوسری قوم سے نا آشنا اور اگر کسی حد تک آشنا بھی ہوتی تو دور سے کچھ عمومی احوال سننا کرنے تمدن میں اشتراک نہ رسم و رواج میں یکسانی، نہ مذاق میں وحدت ہر قوم کے یہاں دوسری قوم ایک افسانہ تھی اور ایک ایسی عجوبہ روزگار چیز سمجھی جاتی تھی جس کے افسانے مافوق العادت سمجھ کر حیرت سے سنے جاتے تھے اور دل بہلانے کے لئے قصہ کہانیوں میں نوادر روزگار کے سے انداز بیان میں آتے تھے جیسے گویا یہ قوم اس عالم کی بسنے والی ہی نہیں بلکہ کسی نئی دنیا کی بسنے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بعد اور اس تفاوت کے ہوتے ہوئے، جب انسانیت کے مذاق و مزاج ہی میں یکسانی اور ہمہ گیری نہیں تھی اور اس مابینی بعد کے ہوتے ہوئے مزاجوں کی یکسانی رسم و رواج کی وحدت نحو بؤ کا اتحاد اور ذہنی رخ کی ایکتا ممکن بھی نہ تھی تو قانون شریعت و تربیت میں ہمہ گیری اور وحدت کیسے رکھی جاتی کہ سب کا ایک پلیٹ فارم ہو جانا اور سب کا ایک ہی قانون اور ایک ہی شرعی راستہ ہونا۔ جس میں قومیت نہ ہوتی بلکہ بین الاقوامیت ہوتی۔ وطنیت نہ ہوتی بلکہ بین الاوطانیت ہوتی۔ اس لئے شریعتیں بھی الگ الگ رکھی گئیں اور قومیتیں بھی الگ

الگ آئیں۔ شرائع کے مزاج بھی متفاوت رہے اور ہر تہیان دین کے مزاج بھی اقوام کے مزاج کے حسب حال جدا جدا رکھے گئے۔ یہ شریعتیں بلاشبہ بایں معنی تو سب کامل تھیں کہ اپنی اپنی قوموں کی نجات کے لئے کافی وانی تھیں۔ مگر خود بنفس تکمیل طلب تھیں۔ جامع محض نہ تھیں۔

اور جب شرائع کے جامع نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قومیتوں اور وطنیتوں کے دائرہ میں محدود اور اقوام کے جزوی مزاجوں کی رعایت سے جزوی رنگ میں آئی تھیں تو شریعت کے جامع ہونے کے معنی اسی سے واضح ہو گئے کہ وہ قومی کے بجائے بین الاقوامی اور وطنی ہو سیکے بجائے بین الاوطانی ہو اور اس میں قوموں کے جزوی مزاجوں کی رعایت کے بجائے نفس انسانی اور اس کے کلی مزاج کی رعایت ہو اور ایسے وہ کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کے لئے پیغام ہو اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے اور یہ جب ہی ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ ساری دنیا کے مزاجوں کی کلی رعایت لے کر آئے اور ایسے ہر گیر اصول و قوانین پر مشتمل ہو جو دنیا کی ساری قوموں کے لئے یکساں قابل قبول ہوں۔

مگر جبکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ دین تمدن ہی کی وسعتوں کی حد تک وسیع ہوتا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا جامع دین اسی وقت بھیجا جاسکتا تھا کہ دنیا کی قوموں کے تمدن اور مدنی مزاج میں ہمہ گیری اور یکسانی کے جنہات پیدا ہو جائیں اور ان میں قومیتوں کی تفریق کے بجائے عالمگیر بین الاقوامیت کا مذاق پیدا ہو جائے۔ یہاں تک کہ قومی وطنی نسل اور طبقاتی حد بندیوں سے یہ تفریقیں انسانوں کی عقلوں پر شاق گزرے لگیں آفاقی اور غلامی کہ فرق بلابانع پر بھاری ہونے لگیں شاہی و گدائی کا تفاوت عقلوں کے نزدیک ناگوار حادثہ ثابت ہوا۔ بوسے کے نسل اور جوش کو لو کہ لعنت پکارنے لگیں۔ چھوٹ چھات کو مہنر کے بجائے عیب سمجھا جانے لگا۔ ذہینوں کی حد بندیاں مٹ کر ہمہ گیر مساوات کی استعداد پیدا ہو جائے اور اونچ نیچ کے بجائے انسانی بھائی چارہ اور اخوت کی صلاحیتیں ابھرنے لگیں تو یہی وہ وقت ہو سکتا تھا کہ انسانیت کی یہ فطرت ہمہ گیر قانون اور بین الاقوامی شریعت کی خاموش پکار کرے اور قدرت اسے ایسا ہی جامع قانون بخش دے۔

اس اصول کے بعد اب واقعات کی روشنی میں نظر دوڑائیے کہ یہ استعداد کب ابھری؟

۱ اور کیوں ابھری، ظاہر ہے کہ ہم گریہ مساوات کی استعداد جب ہی ابھری تھی کہ ہم گریہ تفریق اور اپنی
 پینچ انتہائی حدود پر اچکی ہو اور اس سے دنیا تنگ آکر رہے عمل کی خواہش مند ہو چکی ہو سو تاریخ شاید ہے
 کہ قبل از اسلام زمانہ جاہلیت دنیا کے لئے اس اپنی پینچ کا انتہائی دور تھا۔ معاشرتی اپنی پینچ نے
 غلاموں کو نبی اپنی پینچ نے اچھوتوں کو اقتصادی اپنی پینچ نے نادار مزدوروں کو مذہبی اپنی پینچ نے
 عوام کو اور سیاسی اپنی پینچ نے رعایا کو بے پناہ مظالم اور تحقیر و تذلیل کا شکار بنا کر رکھا تھا۔ اونچے لوگ
 مطلق العنانی کے مقام پر تھے اور پینچ لوگ ڈھوروں اور ڈنگروں کی طرح ان کا یرغمال تھے غلاموں
 کو معمولی سی کوتاہی اور فروگزاشت پر سانپوں سے ڈسوا دینا اور تالابوں میں ڈھکیل کر ان کے
 ڈوبنے اور دریا گیز موت کا تماشہ دیکھنا برہمنوں کے شکنجوں میں ان کے پینچے اڑا دینا۔ آقاؤں کا
 قانونی اور عرفی حق تھا۔ بادشاہ آقائے مطلق ہوتا تھا۔ رعایا اس کی غلام بھی جاتی تھی۔ اسے حق تھا کہ
 کسی گھرانے کے ایک فرد کی کوتاہی پر پورے گھرانے اور خاندان کو کوہو میں پڑوادے۔ حکمران سلسلہ
 کے افراد کا رعایا کے افراد سے ناقابل تحمل بیگاریں لینا اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے داد و عیش
 دینا حکمرانوں کا جائز حق تھا۔ مذہبی پیشواؤں کا عوام پر خدا کے نائب کی حیثیت سے ان کے اور ان کے
 زن و فرزند کے جان و مال میں ہر قسم کے تصرف کا حقدار ہونا عام بات تھی۔

روم و فارس کے اونچے تمدن میں امیر اس وقت تک باعزت سوسائٹی میں آنے کے
 قابل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ لاکھ دو لاکھ کی مالیت کے زور جو اس کے پیسے، زر تار لباس اور
 مرصع سونے کے تاج کے زیب بدن نہ ہوں۔ یہ سب سامان جاہ و طرب و غریب کی محنت و مزدوری کا
 ثمرہ ہوتے ہیں اور خود غریب بدن چھپانے کے لئے معمولی لباس اور پیٹ بھرنے کے لئے سوکھے
 ٹکڑے تک سے بھی محروم تھے۔ گویا غریب حیوانات کی مانند تھے اور غلام بیلوں اور گدھوں کی طرح
 تھے جن پر طاقت سے زیادہ بار ڈالنا اور بہر صورت ان پر ہر تعدی کو جائز اور ہر ظلم کو روا رکھنا ہی
 آقائی کی صحیح پوزیشن تھی۔ پھر اوپر سے ان پسماندوں کی ہر چیز اونچوں کے لئے حلال تھی۔

خرش ہر طبقہ میں طبقاتی اپنی پینچ اپنی انتہائی شرمناک حدود پر اچکی تھی جس کے تحت ہر
 اپنی پینچ کا جائز حق پینچ کی تذلیل اور ان میں ہر قسم کے تصرف کا جواز تھا اور پینچ کا واجب مقام اونچوں کے
 جابرانہ اختیارات کے سامنے سرنیا زھکائے رکھنا اور ہمہ تن اطاعت بن کر حاضر رہنا تھا۔

عدل و مساوات تو بعد کی چیز ہے، نفسِ انسانیت کا احترام بھی ختم ہو چکا تھا۔ نہ صرف افعال ہی کی حد بلکہ انسانی جوہر کے لحاظ سے اونچوں نے اپنے کو نیچوں سے بالاتر سمجھ رکھا تھا۔ کچھ طبقات سورج بنی اور چند بنی بنے ہوئے تھے۔ کچھ خدا کے منہ سے پیدا شدہ تھے اور ان کے مقابلہ میں نیچ مشہ خاکی سے یا خدا کے پیروں سے پیدا شدہ تھے۔ گویا اونچ انسانی نوع سے بالاتر کوئی جداگانہ نوع تھی جس کا مادہ تولید بھی عام انسانوں جیسا نہ تھا اور نیچ عام انسانوں سے نیچے کی سطح کی کوئی نوع نہ تھی۔ جنہیں انسانیت کے حقوق بھی حاصل نہ تھے اور اونچ ہمیشہ کے لئے اونچ اور نیچ ہمیشہ کے لئے نیچ پس اونچ نیچ محض معاشرتی نہیں تھی جو سہری اور بنیادی تھی اور جوہر انسانی میں بھی طبقاتی تفاوت شامل تھا۔ ایسے نیچ کا سایہ بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ اس کا پس خوردہ بھی نجس تھا۔ ایسے انسانی برادری کے معاشرتی تعلقات بھی اس کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر نہ صرف معاشرت بلکہ عبادت میں بھی یہ تفریق ایک جائز حق شمار ہوتی تھی۔ اچھوت اور چھوت ایک معبد میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ برابر کھڑا ہو جانا تو کیا ہی ممکن تھا؟ علم مذہب صرف اونچی ذات کا حق تھا۔ نیچ کے لئے تعلیم مذہب حاصل کرنا بھی ممنوع تھا۔ غرض مختلف اقوام میں اونچ نیچ اور طبقاتی تفریق کی مختلف بھیانک صورتیں رائج تھیں جنہیں صن معاشرت اور صحیح دین خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ نفرت باہمی اور جذبہ انتقام کی آگ کا اشتعال ہی ہو سکتا تھا۔ سو ہوا۔ رعایا ملوک پر لعنت بھیجتی تھی اور راعی رعایا کو ملعون جانتے تھے۔ دنیا و دین کی یہ کیفیت کسی ایک ملک یا ایک ہی قوم کی تھی۔ بلکہ عرب و عجم اسی بلا میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی لئے اس دور کی اس تباہ حال دنیا کے قلوب پر اس کے خالق نے نظر کی تو پوری دنیا کو غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔ جیسا کہ لسان نبوت نے زمانہ جاہلیت کی اس حقیقت کو واشکاف فرمایا ہے۔

ارشادِ نبوی ہے:-

ان الله نظر الى قلوب
بنی آدم فمقت عربہم
وعجمہم
و عجمہم

یعنی قلوب میں خیر باقی نہیں رہی تھی۔ روحانیت کے نشانات کم ہو چکے تھے۔ صرف

مادیت اور نفسانیت ہی کا دور دورہ تھا۔

اس قومی غرور و وطنی تعصب اور معاشرتی تحقیر و تذلیل سے دنیا تنگ آچکی تھی تو اس کا قدرتی ردِ عمل یہی جذبات ہو سکتے تھے اور ہوئے کہ شریف و ذلیل کی یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو نسلی غرور اور قومیتوں کے تعصبات مٹیں اور یہ تفریقیں ختم ہوں اور ظاہر ہے کہ ان وطنی اور قومی حد بندیوں کے مٹ جانے کی آرزو درحقیقت انسانی اخوت و مساوات ہی کی آرزو تھی اور آقاہ و غلام شاہ، وگدا، امیر و غریب حاکم و محکوم کی اونچ نیچ کی فضا ختم ہو جائیگی خواہش درحقیقت وحدت باہمی اور ربط مابینی ہی کی خواہش تھی چنانچہ پسماندہ طبقوں میں اس کے چرچے ہونے لگے اور ان اچھوت اقوام کا فکر بدلنے لگا۔ اب وہ اس تحقیر و تذلیل کی قضا پر قناعت کر بیٹھنے کے لئے تیار نہ رہے، بلکہ ردِ عمل کے طور پر ان میں جذبہ پید ہو گیا کہ وہ اس تحقیر اور اچھوت پن کا جو اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ نکلا کہ ان تفرقوں اور حد بندیوں پر اجتماعیت کے جو محدود تصورات ذہنوں میں جمے ہوئے تھے ان تفریقوں کے ختم ہونے پر وہ بھی ختم ہو گئے اور مدنیت کے وہ عمومی اور ہمہ گیر تصورات ان کی جگہ آ گئے۔ جو اب تک اجتماعیت، نسلیت، قومیت اور امیر و غریب یا آقا و غلام کی طبقاتی تفریق اور چھوت چھات سے ہٹ کر پارہ پارہ ہو گئی تھی جب وہ ذہنوں میں ایک بوسیدہ لباس کی طرح قابلِ نفرت اور اتار پھینکنے کے لائق بن گئی تو اس کا طبعی ردِ عمل ہو سکتا تھا کہ ان تفریقوں کے علی الرغم ہمہ گیر خلط و اختلاط اور باہمی مساوات کی خواہش او بھرنے لگے اور انسانیت گیر اخوت و ارتباط کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ جو انسانی فطرت کا صحیح اور اعلیٰ مقام ہے۔

بلاشبہ اس جذبہ سے وہ مدنیت کبریٰ جو انسان کی طبعی ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مدنی الطبع کہا جاتا ہے، اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہونے کے مقام پر آگئی کیونکہ اس کا ابتدائی مقام تو یہ ہے کہ انسان صرف مثالی زندگی میں اجتماعیت کا ثبوت دے اور ایک گھر کے لوگ انس و موانست اور نظم و تنظیم سے زندگی بسر کریں ظاہر ہے کہ تدبیرِ منزل کا نظم ایسا ابتدائی نظم ہے کہ اس سے ایک انسان صرف جانوروں سے تو ممتاز ہو سکتا ہے کہ ان کی طرح الگ الگ بھٹوں اور گھونسلوں میں انفرادیت کے ساتھ نہ رہے لیکن انسانی معاشرت کے اعتبار سے یہ کوئی قابل

ذکر مقام نہیں۔ جسے انسانیت کی تنظیم کہا جائے۔ ابتداءً عہد میں انسان اسی طرح زندگی بسر کرتا تھا کہ ہر سرگھرانہ خود اپنی ہی انفرادی سیاست کے نیچے آیا ہوا تھا جس میں کوئی عمومیت نہ تھی۔ اس کے بعد اس مدینت میں وسعت آئی تو انسان نے قبائلی زندگی سیکھی جس میں چند گھرانوں کا مجموعہ مل کر اپنا نظم قائم کرنے لگا اور اب وہ منزلی اجتماعیت سے کھل نظر آنے لگی جسکی اس کے نزدیک کوئی خاص قدر و قیمت نہ رہی مگر یہ بھی مدینت کی انتہا نہ تھی۔ اس لئے انسان کی طبعی مدینت پسندی اس پر زور کی، بلکہ وہ اس سے گذر کر شہری زندگی تک آیا جس میں چند قبائل باہمی ربط و اتحاد سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے۔ جس سے وہ پہلی قبائلی اجتماعیت بھی انہیں طفولیت محسوس ہونے لگی مگر یہ بھی مدینت کی انتہا ثابت نہ ہوئی کیونکہ اس تنظیم کا معیار شہریت تھی۔ انسانیت نہ تھی۔ انسانیت کے لحاظ سے یہ شہروں کی تفریق فطرت کی اصلی پیاس کا پورا علاج نہ تھا۔ اس لئے انسان نے اس سے آگے ترقی کر کے مدینت کو ملکی اجتماعیت بنایا اور کئی کئی شہروں پر مشتمل ملکی نظام قائم کیا اور اب اس اجتماعیت کی صورت قبائلی چودراہٹ یا شہری نوابی اور جاگیر داری کی سی نہیں رہی، بلکہ حکومت کی سی ہو گئی جس میں مختلف شہروں کا ایک نظام بن گیا اور انسان کے روابط وسیع تر ہو گئے اور دنیا میں مختلف حکومتیں مختلف معیاروں سے قائم ہو گئیں کہیں نسلی ارتباط سے ایک ملک کے لوگوں کا تیرازہ بندھا اور کہیں قومی اور وطنی لحاظ سے اجتماعیت پیدا ہوئی۔ اس نظم کے بعد اُسے وہ پہلی شہری اجتماعیت بھی ابجد محسوس ہونے لگی کیونکہ ارتباط باہمی کا ایک وسیع دائرہ اس کے ماتھے لگ گیا جس سے اسکے مدنی الطبع ہونے کا ظہور زیادہ قوت سے ہونے لگا۔ مگر یہ مدینت بھی آخری اور انتہائی ثابت نہ ہوئی اور انسان کی فطری اجتماعیت پسندی نے ملکوں میں اقلیتی شان پیدا کر لی کہ کئی کئی ملکوں پر مشتمل ایک اقلیتی نظام قائم ہو گیا جس کے زیر اثر سینکڑوں ملک آگئے اور انسان کی انسانیت شعاری کا دائرہ اس وسیع اجتماعیت کے راستہ سے کہیں زیادہ وسیع ہو گیا جس سے اندازہ ہوا کہ اس کا مدنی الطبع ہونا طبعی طور پر منزلی زندگی، قبائلی زندگی، شہری زندگی اور ملکی زندگی تک محدود نہ تھا۔ یہ حد بندیاں اس کے ناواقف ماحول کی ناواقفی یا حوصلہ کی بندشوں کا نتیجہ تھیں جوں ہی حوصلہ کو پھیلنے کا موقعہ ماتھے لگ گیا۔ فوراً ہی اس کی وسیع فطرت کو اپنی وسعت یاد آگئی اور وہ مدینت عامہ کے اس وسیع میدان

میں کو دہڑا جس کے سامنے پہلی محدود اجتماعیتیں ماند ہو کر رہ گئیں لیکن یہاں تک پہنچ کر اس کی فطرت نے اسے اور آگے بڑھایا اور بتلایا کہ یہ بھی ایک حد بندی ہے کہ وہ کسی اقلیم کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جائے کیونکہ یہ دائرہ پھر جغرافیائی ہے۔ اگر انسان اس حد خاص کا پابند ہو کر اس میں گھر جائے تو اسکی انسانیت جس کا احاطہ ہر احاطہ سے زیادہ وسیع ہے، پھر بھی زمینوں کے ٹکڑوں کی پابند اور اس پابندی سے پارہ پارہ ہی رہے گی جس میں اس کی انسانیت کی توہین ہے کہ بیچ کو تنگ کے مانند بنا دیا جائے، اگر اب تک اس کی انسانیت کے ٹکڑے آقا و غلام، امیر و عزیز اور اویچ بیچ کی تفریقوں نے کئے تھے تو اب وہی ٹکڑے اقلیموں کے ارضی ٹکڑوں سے ہو گئے جو ہر حال پھر حد بندی اور انسانوں کی وطنی تفریق ہے۔ اس لئے اب اسکی فطرت نے مدنیت کبریٰ کا ذہنی نقشہ یہ بنایا کہ وہ جغرافیائی یا نسلی معیار کے بجائے انسانیت کے معیار سے اجتماعیت قائم کرے اور انسانیت جبکہ آقا و غلام، بیچ اور اویچ حاکم و محکوم حتیٰ کہ افراد قبیلہ و شہر اور مکان مالک و اقلیم سب میں مشترک ہے اور اسلئے ان سب سے زیادہ وسیع اور ان سب کے لئے ہم گیر ہے تو کیوں نہ انسانیت ہی کے اس وسیع ترین اور جامع ترین معیار سے اجتماعیت قائم کی جائے جس کے احاطہ میں شہر و ملک ہی نہیں ساری اقلیمیں بھی آجائیں اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک ہی نظام ایک ہی تمدن ایک ہی انداز معاشرت اور ایک ہی نوع کے آئین و قوانین ہو جائیں جس سے دنیا میں انسانیت کبریٰ کا ظہور ہو، اور انسانیت سارے معیاروں پر غالب ہو کر اپنی برتری کو نمایاں کر سکے۔ اب اندازہ کیجئے اگر اجتماعیت کے ہر پھلے محدود دائرہ سے نکل کر اوپر کے وسیع دائرہ اجتماعیت میں آنا اور انسانیت و مساوات کو وسیع سے وسیع تر اور عالمگیر بناتے رہنا ہی اس کے مدنی الطبع ہونے کی ترقی تھی تو اس مدنیت پر پہنچ کر جس میں ساری دنیا کے انسان ایک بھائی چارہ کے مقام پر آجائیں یقیناً اس کی مدنیت و اجتماعیت کی آخری منزل ہوگی جس کے بعد مدنیت کا کوئی اصول درجہ باقی نہیں رہتا کیونکہ سارے انسانوں سے ملکر اور انہیں باہم ملا کر اب آخر انسان کے لئے کون سا طبقہ رہتا ہے جسے وہ اپنی مدنیت میں شامل کرے؟ اور اس سے بھائی چارہ کے تعلقات اور تمدنی روابط قائم کرے جو انات تو اس کے بھائی چارہ میں آنے سے رہے کہ وہ ان کی

طرف اخوت کا ہاتھ بڑھائے جنات آنے سے رہے کہ انہیں اپنی برادری میں شامل کر کے ملائکہ آنے سے رہے کہ وہ اسکی برادری میں شامل ہو کر اس کے نظام تمدن کا جزو بنیں۔ رہے انسان تو وہ سب کے سب ایک نظام اجتماعیت میں شامل ہو گئے۔ اس لئے اب کوئی طبقہ باقی نہ رہا جس کے ملانے کے لئے مدینیت کی توسیع کی جائے اور اخوت و مساوات کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ اس حد پر پہنچ کر پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نظام ہو جائے انسانی اجتماعیت اور مدینیت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس کی اجتماعیت میں کوئی ترقی ممکن ہوگی تو اسی مدینیت کو خوشنمایا مستحکم بنانے کی جزئیات کی ہوگی۔ نفس مدینیت کی ترقی کا اس کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔ ایلئے اسے ہی تمدن کی نوعی انتہا کہا جائے گا جس کے بعد ذہن انسانی کی ترقی کا کوئی اصولی میدان باقی نہیں رہتا۔ بس اسی آخری دائرہ کی اجتماعیت کو عالمی اجتماعیت کہا جائیگا جس کی اخوت بھی عالمی، آئین بھی عالمی، قانون معاشرت بھی عالمی ہوگا اور تمدن و مساوات بھی عالمی کہلائے گا۔

کیا زمانہ جاہلیت سے رفتہ رفتہ یہی عالمی ذہنیت انسان میں پیدا نہیں ہو رہی تھی، کیا اسی عالیت کے ٹکڑے ٹکڑے نسلیت، قبائلیت، وطنیت، قومیت، آقاویت، انانیت وغیرہ نے نہیں کر رکھے تھے اور جب زمانہ جاہلیت میں ان معیاروں سے نفرت اور ان کی اوج پینچ سے وحشت انسانوں میں پیدا ہوئی جو عالیت کے راستے میں خارج تھے تو ان کے ذہن سے نکل جانے کے بعد کیا نہیں کہا جائیگا کہ انسانی ذہن عالمی ذہن پرا گیا اور اس میں ہمہ گیری اور عالمگیری کی انتہائی استعداد پیدا ہوگی؟ بلاشبہ اس کا اقرار کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ عالمی مدینیت کی اس استعداد کے بعد قدرتا اس کی فطرت میں ایک ایسے عالمگیر قسم کے مذہب کی تلاش اور جستجو کا پیدا ہو جانا امر طبعی تھا جو قومی نہ ہو، بین الاقوامی ہو، وطنی نہ ہو، بین الاوطانی ہو، نسلی نہ ہو، بین النسلیتی ہو، لسانی نہ ہو، بین الاسنیتی ہو، لونی نہ ہو، بین الاوانی ہو، کسی ایک طبقہ کو پیغام نہ ہو بلکہ سارے انسانی طبقات کو پیغام ہو۔ اس کا پیغمبر مقامی نہ ہو عالمی ہو۔ اس کی کتاب آتی نہ ہو جہانی ہو۔ اس کا قبلہ ملکی نہ ہو، بین الملکتی ہو۔ اس کی حفاظت زمانی نہ ہو، بین الازمانی ہو۔ اس کی اشاعت جہتی نہ ہو، بین الجہاتی ہو۔ اس کی تعلیم زمانی نہ ہو، بین الازمانی ہو۔ غرض اس کی ہر چیز ہمہ گیر عالمگیر اور عالمینی ہو، کیونکہ بین

قوم کے حسب حال ہو کر ہی اس کیلئے مفید اور اس کی صحیح تربیت کا کفیل ہو سکتا ہے۔ سو جب تمدن میں عالمیت کی استعداد کا وقت آجائے تو دین بھی اس استعداد کے حسب حال ہونا چاہیے اور جبکہ مدنیت اپنی وسعت کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر آ کر ختم ہو جائے، گویا انسان کے مدنی الطبع ہونے کی آخری منزل آجائے کہ اس کے بعد تمدن کی اصولی وسعت کا کوئی میدان باقی نہ رہے تو دین کی بھی آخری تکمیل ہو جائے کہ اسکے بعد نئے دین آنے کا کوئی سوال باقی نہ رہے پس جیسے اس تمدن کے بے انتہا وسیع گوشوں سے جس جس رنگ کی گراہی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا جائے، اس آخری دین کے بے انتہا وسیع گوشوں سے اسی اسی رنگ کی دافع ضلالت ہدایتوں کا ابھرتے رہنا بھی حقیقت بنتا جائے جو ان گراہیوں کے دفاع کا مکمل سامان ہو۔ نہ اس طرح کہ دین کامل تمدن کے گوشے مٹاتا ہے، بلکہ اس طرح کہ اس عالمگیر دین میں لوگوں کو عالمگیر تمدن سے ہٹائے بغیر خود تمدن ہی کے گوشوں کو ذریعہ ہدایت بنا دینے کی قوت بھری ہوئی ہو۔

وہ تمدن کے ہر کونہ سے خدا کا جمال جہاں آرا دکھلانے کی قوتیں لیکر آیا ہو، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس آخری اور کامل دین میں دنیا و آخرت دونوں ملا کر یکس کر دی گئی ہوں اور جیسے اس کا جزو دیانات ہوں، ویسے ہی اس کا جزو معاملات و معاشرت اور ملکیت بھی ہوں، اس کی لامحدود ہدایتیں سجد ہی تک محدود نہ ہوں بلکہ گھریلو زندگی سے لے کر عالمی حکومت کی زندگی تک وسیع ہوں۔

پس اگر آج عالمی تمدن کا وقت آ گیا ہے اور ضرور آ گیا ہے کیونکہ جدید اکتشافات اور نئی ایجادات نے پوری دنیا کو ایک عالمہ اور ایک قبیلہ کر کے رکھ دیا ہے۔ آج اقلیمیں ملک بنی ہوئی ہیں اور ملک مغلے بن کر رہ گئے ہیں، آج ۱۷ منٹ میں راکٹوں کے ذریعہ پوری دنیا کا چکر لگایا جا سکتا ہے، آج انسان زمین کی سطح کو چھوڑ کر سمندروں کی تہ اور فضاؤں کی بلندیوں میں بلاجان ہے، آج گھر بیٹھے مشرق و مغرب کی آوازیں اور بولیاں انسان کے کانوں پر پڑ رہی ہیں، آج وہ سطح زمین سے ابھر کر فضاؤں میں اڑ رہا ہے، آج مہینوں کی مسافتیں گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی فاصلوں میں طے ہو رہی ہیں، آج ہفتوں کا کام مہینوں کے راستے سے لمحوں میں انجام پا رہا ہے، حتیٰ کہ اس کے کان آج حال ہی نہیں، ماضی بعید کی آوازوں سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں، اخلاق و علوم تک کو تول لینے کی

مشینیں سطح دنیا پر نمایاں ہو چکی ہیں جو جسمانیات سے گزر کر عالم معنی تک بھی پہنچ چکی ہیں۔ غرض
 جبکہ آج کے نئے اختراعات اور اکتشافات نے زمان و مکان اور جواہر و اعراض تک کو پیٹ کر
 رکھ دیا ہے اور انسان اپنی معاشرت مدینت کے لحاظ سے مقامی نہیں بلکہ عالمی اور عالمی نہیں
 بلکہ عالمینی ہو گیا ہے تو اس کی قدرتی خواہش ہونی چاہیے کہ اسکا مذہب بھی مقامی یا قومی نہ رہے
 بلکہ عالمی اور صرف عالمی بلکہ عالمینی ہو۔ پس اگر آج پوری دنیا کا مذہب عملاً ایک نہیں بنا ہے تو کم
 از کم انسانی جذبات اس نقطہ پر ضرور آگئے ہیں کہ وہ ایک ہی ہونا چاہیے تو آج ہی کا وقت ہے کہ
 اس میں عالمی مذہب آسمان سے اُترا ہوا موجود ہے۔ جو اس جذبہ کی تسکین کے لئے آگے بڑھے
 اور جہانوں کی اصلاح کا پیغام دے۔ ظاہر ہے کہ آج کا مذہب وہ نہیں ہو سکتا جو کسی ایک قوم کو
 پکارے یا ایک وطن کو اپنا کر رہ جائے یا نسلی امتیازات کی راہوں سے انسانیت کے حصے
 بخرے کرنے پر تلا ہوا ہو یا چھوت چھات کی تعلیم سے انسانیت میں نفرت کی تخم ریزی کرے
 یا رنگ اور لون کی تفریق سے انسانیت کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ ہو۔ آج کا مذہب یقیناً وہ نہیں
 ہو سکتا جو مقامی حد بندیوں اور تنگیوں کی تنگنائی میں انسانوں کو پھانسا کرے انہیں غلطی سے
 مقامی بنانے کی راہ دکھلائے۔ بلکہ آج کا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو اپنے داعی اور پیغمبر اعظم کو
 عالمینی بتلائے اور اعلان کرے کہ :-

وما ارسلناک الا رحمة
 اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے
 للعلمین ۛ
 رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

جو اپنے داعی اول کو عالمینی نذیر بتلائے۔

لیکون للعلمین نذیرا۔
 تاکہ (ہمارا) دل تمام جہان والوں کیلئے ڈرائیواں ہو جائے۔

جو اپنی کتاب کو عالمینی کتاب کہے۔

ان هو الا ذکر ہی للعلمین ۛ
 یہ قرآن کریم تمام جہان والوں کے واسطے ایک نصیحت ہے۔

جو اپنے قبلہ کو عالمینی قبلہ کہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی
 یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے

بیکتہ مبارکاً و ہدی للعلمین ۛ
 مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے۔

جس کا رسول کسی ایک قوم یا صرف ایک نواز کے انسانوں کو نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کو جو قیامت تک پھیلا ہوا ہے، اصلاحی آواز دے۔

قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً ۛ
کیلئے اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

جس کی بشری و نذیری اس کے خدا نے کسی دور کے ساتھ مخصوص نہ کی ہو۔

وما ارسلناک الا کافۃ للناس
اور ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لئے خوشخبری
بشیراً و نذیراً۔
سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

جس کا پیغمبر انسانوں میں کالے اور گورے کی تفریق کئے بغیر سب کے سروں پر رحمت و شفقت کا ہاتھ رکھے اور اعلان کرے کہ

بعثت الی الاسود الاحمر
مجھے سُرخ و سیاہ (تمام اقوام عالم کی ہدایت کیلئے)
بھیجا گیا ہے۔

جو آقا و غلام کی تفریقیں مٹانے کے لئے آیا ہو۔

یدخل فی امتی حرٌّ و عبدٌ
میری امت میں آزاد اور غلام (سب) داخل ہیں
جو انسانوں کو ان کے جوہر کے لحاظ سے اونچ نیچ کا تصور مٹا کر مساوات کا اعلان فرمائے۔

کلکم بنو آدم فادم من تراب
تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے
جو نسلی امتیازات کو ختم کرنے آیا ہو اور فرمائے کہ

یا ایہا الناس انا خلقناکم من
ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوباً
و قبائل لتعارفوا ۛ
یا ایہا الناس تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے
پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا
تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

جو وطنیت کی حد بندیوں کو مٹانے اور پوری دنیا کو ایک وطن بنانے کے لئے آیا ہوں۔

ان اللہ نزوحی الی الارض مشارقہا
و مغاربہا و یبلغ ملک امتی
اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے
کر دی جسے میں نے دیکھا اور عنقریب میری امت

کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک میری نگاہوں
مازوحی الی منہا ۛ

نے دیکھا۔ (یعنی مشرق و مغرب تک)

جو وطنی غرور کو ختم کرنے کیلئے آیا ہو۔

یس لعربی علیٰ عجمی فضل الابدین
کسی عربی کو کسی عجمی پر دین و تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت
و تقویٰ حاصل نہیں۔

جو قومیتوں کی حدود بن دیاں ختم کرنے کے لئے آیا ہوں۔

کان النبی یبعث الی قومہ خاصتہ
و یبعث الی الناس کافتہ
دوسرے انبیاء (صرف اپنی قوم ہی کی طرف بھیجے جاتے
تھے اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

جس نے چھوت چھات مٹانے کا اعلان کیا اور کفار کے ہاتھ کا کھانا پینا جائز رکھا۔

الیوم اهل لکھو الطیبات و طعام
الذین از تو الکتاب حل لکھو
و طعامکھو حل لھم
آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئیں اور
اہل کتاب کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ
ان کو حلال ہے۔

اور خلاصہ یہ کہ جو ایمانی اخوت کے ساتھ انسانی اخوت کا بھی علمبردار بن کر آیا ہوتا کہ انسان میں
انسان سے نفرت کا تخم باقی نہ رہے۔

اللھما شھدان الناس
کلھما اخوة
میں۔

جو سارے انسانوں کی خدمت کا نصب العین لیکر آیا ہو۔

الخلق عیال اللھ فاحب الخلق
الی اللھ من یحسن الی
عیالہ
تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک
سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو اسکے
کنبہ کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔

جو اس انسانی بھائی چارہ کے لئے باہمی ہمدردی کی تعلیم لیکر آیا ہو کہ

احب لاکھیک ماتحب لنفسک
اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے
لئے پسند کرتے ہو۔

جو غلاموں کو بھائی بتاتا ہوا آیا ہو۔

اخوانکم حولکم۔ تمہارے غلام تمہارے نبھائی ہیں۔

جس نے اخلاقی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

قل سیرونی الارض فانظر وا
آپ کہہ دیجئے کہ زمین کے اندر چلو۔ پھر واپس دیکھو کہ
کیف کان عاقبة المکذبین

جس نے تجارتی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

هو الذی جعل لکم الارض
وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا

ذلولاً فامشوائی مناکبھا و
سو تم اس کے رستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں

کلوا من رزقہ والیہ النشور؛
کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

جس نے تعلیمی سفروں کو عام کیا۔

فلولا نفر من کل فرقة منهم
سوائے اسیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جگہ

طائفة لیفتقہونی الدین
میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ

ولینذر واقوامہم اذارجعوا
لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو

الیہم لعلہم یحذرون؛
ان کے پاس واپس آکر ڈرائیں تاکہ وہ لوگ

احتیاط رکھیں۔

غرض اس کی ہر تعلیم میں عمومیت جامعیت اور بین اقوامیت کی روح دوڑ رہی ہو جس

لے ہر قوم کے ساتھ انتہائی رواداری کی تعلیم دی ہو اور منافرت کا بیج مٹا دیا ہو۔ سو بتلایا جائے کہ

وہ مذہب آج اسلام کے سوا کون ہے اور جو تعلیمات اوپر ذکر کی گئیں۔ یہ اس کی نہیں ہیں تو اور کس

کی ہیں؟ اور اس کے سوا کون ہے جو انسانی معاشرہ کو مقامی کے بجائے عالمی اور نہ صرف عالمی بلکہ

عالمینی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے آج کی عالمی دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ جو تمدن

کے کسی بھی گوشہ کو مٹائے بغیر اسی گوشہ سے مالک کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ ان یہ ضرور ہے

کہ جہاں اس نے عالیت اور عالمی اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے یہ ہمہ گیر تعلیم اور ہمہ گیر انس

وانسانیت کی طرف راہ نمائی کی ہے۔ جس کے تحت اقوام عالم سے موانستہ اور مسالمت کی

راہیں کھلتی ہیں اور منافرت ختم ہو جاتی ہے۔ وہیں اس نے معاشرہ میں مسلم قوم کا شخصی وجود قائم

رکھنے کیلئے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلط ملط ریل میل، ربط ضبط اور ذاتی الفت و مودت سے روکا بھی ہے تاکہ ان کے اسلامی استقلال میں فرق نہ آئے لیکن اجتماعی معاملات اور عمومی معاشرت میں اس ریل میل سے بچکر رواداری حسن سلوک مواسات دفع مظالم امن پسندی اور دفع منافرت کے جذبات کو عام بنانا چاہا ہے تاکہ اس کے بین الاقوامی معاملات میں فرق نہ آئے جو بالآخر اسلامی اشاعت اور عمومی دعوت و تبلیغ کا وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب ایسی ہمہ گیر تعلیم و تربیت دوسرے مذاہب لیکر ہی نہیں آئے بلکہ اسلام ہی یہ انسانیت گیر تعلیم و تلقین لے کر آیا ہے تو اسکا غیر مسلموں سے مودت و اختلاط بے جا کو روکنا درحقیقت نفرت باہمی سے روکنا ہے نہ کہ نفرت پیدا کرنا ہے کیونکہ وہی تو نفرت کا سرچشمہ ہے جن کے اختلاط سے روکا جا رہا ہے تو یہ روکنا تعصب سے نہیں بلکہ عالمگیر مقاصد کے تحفظ کے لئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ذہنیت جب بین الاقوامی رنگ کی استعداد پر آگئی جیسا کہ اس امت کی ابتداء میں اوپن پنچ سے تنگ آکر مساوات اور اخوت باہمی کی ذہنیت پیدا ہوئی اور آج وہی ذہنیت استعداد سے گزر کر فعلیت کی صورت میں نمایاں ہے جبکہ اسی ذہنیت نے نئی نئی عالمگیر ایجادات کر کے اس عالمی ذہنیت کو فعلاً عالمی بنا دیا ہے تو بین الاقوامی شریعت بھی خدا نے اسی ذہنیت کے دور میں اتاری جو اسلام کے سوا دوسری نہیں ہے۔ پس اسلام کو اسی دور میں آنا چاہیے تھا جس دور میں انسان کا مزاج بین الاقوامی بننے کا پرواز پڑا۔

غور کیا جائے تو آج بین الاقوامیت اور ہمہ گیری اپنی نوعیت کے لحاظ سے اصولاً انتہا کو پہنچ چکی ہے جس کے بعد اس میں اصولی نوعیت کا کوئی درجہ باقی نہیں اور جس میں اصولاً اور نوعاً کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں کہ ذہن انسانی کو آگے بڑھنے کی گنجائش ہو ماں کمی بیشی ہوگی تو وہ جزئیات و فروعات میں ہوگی نہ کہ بین الاقوامیت کے دائرہ میں کیونکہ جب ساری دنیا کے انسان ایک قوم بن جانے کے مقام پر آپہنچے ہیں تو آگے انسان ہی نہیں رہتا کہ رشتہ اخوت آگے بڑھے جیسا کہ ابھی واضح ہو چکا ہے تو عوامیت کے نقطہ نظر سے مدنیت کا آخری نقطہ آپہنچا جس کے بعد بین الاقوامیت کا کوئی مقام باقی نہیں رہا کہ انسان اس سے آگے کسی اور عوامیت کی تلاش کرے اور مدنیت کا دائرہ وسیع

ہو۔ ایسے اسی ذہنیت کے مناسب حال دین بھی ایسا عمومی اور عالمی بھی یا گیا کہ اس کے بعد دین و شریعت کا بھی کوئی اصول مقام باقی نہیں رہا کہ دین اس کے آگے بڑھے یا کسی نئے دین کی ضرورت پڑے۔

اس لئے اب اگر دینی ترقی ہوگی تو اسی دائرہ عمومیت میں رہ کر ہوگی۔ اس سے نکل کر نہیں ہوگی۔ سو ایسی ترقی جزئیاتی کہلاتی ہے جو کسی اصول کے دائرہ میں محدود رہ کر ہو۔ مثلاً اگر انسان زمین سے آگے بھی بڑھے گا تو زمین یا مکان ہی کے نام پر آگے بڑھے گا نہ کہ انسانیت کے بھائی چارہ کے نام پر۔ کیونکہ دنیا کی پوری انسانیت کے نظام اخوت میں آجانے کے بعد آگے کوئی نسل بھائی ہی نہیں رہتا کہ اس سے رشتہ اخوت قائم کیا جائے۔ اس لئے مدینیت اصولاً اپنی آخری حد پر آچکی ہے۔ اور اجتماعیت بھی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی جس کے بعد کوئی نقطہ نہیں۔ ایسے دین بھی آجانا چاہیے کہ اس کے بعد اصولاً دین کا کوئی نقطہ باقی نہ رہے البتہ جیسے اس خاتم الدینیت تمدن میں اسی کے اصول کے تحت بے شمار فروع نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی جو ایجابات سے نمایاں نکلتی رہیں گی۔ ایسے ہی خاتم الاویان دین سے بھی اس کے جامع اصول کے تحت فروعات نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی جو اجتہادات سے برآمد ہوتی رہیں گی۔ نفس دین اور اس کے قواعد و اصول نہ بدلیں گے اور نہ جدید قواعد و اصول آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی رہی ہے۔ پھر جیسے اول البینین آدم علیہ السلام کے ابتدائی کنبہ کو ابتدائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی، ایسے ہی خاتم البینین کے دورہ میں آدم کے انتہائی اور بوٹھے کنبہ کو انتہائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی جس سے شاخیں تو بے شمار نکل سکتی ہیں مگر جڑ اور تنب ایک ہی ہے۔ گلابیں جیسے دنیا کی مدینیت کے قومی حد بلوغ پر آگئے اور اب اس میں اصولاً نشوونما کی گنجائش نہیں رہی۔ اگر گنجائش ہے تو نئی نئی شاخوں اور نئی نئی جزوی ایجابات کی ہے جن کے اصول ہمہ گیر رنگ کے ہاتھ لگ چکے ہیں جن کی روشنی میں ماہرین سائنس نئی نئی اشیاء نکالتے رہیں گے۔ ایسے ہی دین بھی جو آدم سے چلا تھا نشوونما پا کر حد بلوغ کو پہنچ چکا ہے اور اب اس میں نشوونما کی گنجائش نہیں رہی۔ اگر ہے تو فروعی مسالک پیدا ہوتے رہنے کی ہے کہ اس کے اصول کی روشنی میں مجتہدین امت اور مفتیان با بصیرت اس کے قواعد و ضوابط سے زمانہ کے حسب حال فروعات نکالتے رہیں گے۔

اور امت کی تربیت ہوتی رہے گی جو آئندہ ہدایت اور علم و مشائخ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ کسی جدید نبوت کی حاجت باقی نہیں رہی۔ غرض آج جو معاملہ بھی ہے، وہ سارے انسانوں کا ہو گیا ہے اور سارے انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر کا ذہن ہی آخری ذہن ہے کہ اس کے بعد ذہن انسانی کے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اگر کسی نئے خطہ کی دریافت ہی ہوگی تو وہ بھی ان ہی سارے انسانوں کے لئے ہوگی۔ غرض تمدنی دنیا میں بشریت کے عموم کی اصولی حد آگئی۔ جس کے بعد بشریت بھی نہیں رہتی تو بشر عالم بشریت سے آگے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہنی پرداز کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ آگے صرف اے عملی جامہ پہنانے کے طریقے رہ جاتے ہیں تو وہ فروع ہیں۔ جو اس ہمہ گیر انسانیت کے لئے انسان میں سامہوتے رہیں گے۔ جن سے اس ہمہ گیر انسانیت پر گھٹنے بڑھنے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ خلاصہ یہ کہ جب ذہن انسانی کی پرداز اصولاً ختم ہوگئی تو نئے اصولوں کی مانگ بھی ختم ہوگئی۔ اس لئے نئے دین کے آنے کا کوئی مقتضی بھی باقی نہ رہا۔ کیا دین آئے یا نبی نبوت آئے۔ اس لئے اس دور خاتم الادوار میں دین خاتم الادیان بھی آنا چاہیے تھا۔ جو آگیا اور پچھلے مقامی اور محدود ادیان اسی طرح منسوخ ہو گئے جس طرح خاتم المدنیات تمدن آجانے کے بعد پچھلی محدود مدنیات منسوخ ہو کر ختم ہو گئیں اور جیسے یہ پچھلی مدنیات اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھیں۔ بلکہ اس وقت کی انسانی ذہنیوں کا مقتضا تھیں وہ اگر منسوخ ہوئیں تو ذہن انسانی کی تبدیلی سے جو ارتقار پذیر تھا۔ ایسے ہی پہلے ادیان بھی اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھے۔ بلکہ اس وقت کے انسانی ذہنوں اور مزاجوں کے مقتضا اور ذہنی پیکار کے مطابق تھے۔ وہ اگر منسوخ ہوئے تو انسانی ذہن کی تبدیلی سے جو ارتقار کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اب جبکہ اس کی اصولی دوز بھی ختم ہوگئی کہ انسانی اجتماعیت کا انتہائی کنارہ آگیا تو وہ اصولاً ختم ہو گیا۔ ایسے ہی جبکہ دین کے اصولی اکمال کا وقت آگیا تو وہ بھی اصولاً ختم ہو گیا۔ ہمہ گیر فروع کی گنجائش تمدن میں بھی ہے اور تدین میں بھی سو وہ چلتی رہے گی۔ اب جیسے پچھلے تمدنوں کو دوبارہ لوٹانے کی کوشش کرنا ذہن انسانی کے لئے چیلنج ہے۔ ایسے ہی اسلام آجانے کے بعد پچھلے مذاہب کو لوٹانے کی سعی کرنا ذہن انسانی کو ترقی معکوس کی طرف لیجانا ہے۔ جس کے لئے فطرت کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ پس جیسے یوں کہا جائے کہ اب زندگی کا انحصار موجودہ تمدن میں ہے۔ اے

چھوڑ کر آج دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی۔ نہ بچاؤ ہو سکتا ہے۔ جیسے گن اور بم سے الگ ہو کر تیر کمان اور تیشہ و تبر پر آجائے تو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا یا عالیت پیدا ہو جانے کے بعد کوئی شخص پھر وہی قدیم گھریلو یا قبائلی یا شہری قسم کے محدود تمدن پر چلنے کی کوشش کرنے لگے تو وہ تمدنی آفات سے نجات نہیں پاسکے گا جب تک اسی تمدن کی پناہ نہ پکڑے جو وقت کے تقاضوں سے برسرِ ظہور آیا ہوا ہے۔

ایسے ہی یوں بھی کہا جائیگا کہ دینِ کامل آجانے کے بعد اخروی زندگی اور نجات کا انحصار اسی دین میں ہے۔ لے چھوڑ کر پھیلے ناتمام ادیان میں (جو اس وقت کے انسانوں کے لئے کافی تھے۔ مگر تام و کامل نہ تھے) نجات ڈھونڈنا آخرت میں بچاؤ نہیں کر سکتا۔

وہو اخرۃ من الخاسرین ۛ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے
ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن
یقبل منه و ہونی الاخرۃ اور وہ تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

من الخاسرین ۛ

غور کرو تو خاتم النبیین کے دین کی یہ خصوصیت بھی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اسلام آجانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین سے روشنی ڈھونڈنا گھائے اور خسارے کی بات ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ یوں کہا جائے کہ آفتاب طلوع ہو جائیکے بعد اسے چھوڑ کر کسی ستارے کوئی روشنی ڈھونڈھنے لگے تو وہ کام نہیں چلا سکتا۔ گھائے میں پڑ جائے گا جیسے یہ غیر معقول ہے۔ ایسے ہی وہ بھی غیر معقول ہے۔ پس ستارے اپنے اپنے وقت میں اپنی دھیمی اور مناسب وقت روشنی سے انسانوں کو فائدہ پہنچاتے رہے جو اپنی اپنی جگہ صحیح تھے مگر رات کو دفع کرنے کے لئے جب سورج طلوع ہو گیا۔ اور ستارے روپوش ہو گئے تو ان کا چھپنا ان کے غلط ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی حالت کارکردگی ختم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نیز اسی لئے کہ ان کی کارکردگی کا وقت رات کی تاریکی تھی۔

طلوع آفتاب کے بعد دن میں صرف آفتاب ہی مفید خلائی اور کارگذار ثابت ہو سکتا ہے۔ دن میں ستاروں کا کام نہیں رہتا کہ رہنمائی کا کام کر سکیں۔ بہر حال اس تمثیل سے حضرت خاتم النبیین

صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ناخ الا دیان ہونا اور اپنے دورہ میں اسی میں نجات کا منحصر ہونا اور اسکا اسی مشینی تمدن اور عالمی مدنیت کے دورہ میں آنا اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔
 خلاصہ یہ کہ آفتاب نبوت بشری ازل سے چمکا اور کائناتی ابد تک چمکتا رہے گا اس دوران میں اس کے نور کا کسی وقت انقطاع ہوا اور نہ ہوگا کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ روشنی اسی کی کام کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔

اول ما خلق اللہ نوری
 سب سے پہلے میرے ہی نور کو اللہ نے پیدا کیا
 کنت نبیا وادم بین
 میں اس وقت بنی تھا جبکہ آدم مٹی اور پانی کے
 الاموالطیر . انا اول من
 درمیان میں تھے اور ان کے ڈھانچہ کا خیر ہی کیا جا
 تشق منه الغبراء۔
 رہا تھا۔ سب سے پہلے میں ہی قبر سے اٹھوں گا۔
 انا اول من یفتح باب الجنة
 سب سے پہلے میں ہی جنت کا دروازہ کھولوں گا
 فانا اللبنة وانا خاتم النبیین
 پس میں ہی قصر نبوت کی آخری اینٹ ہوں اور
 میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

غرض بشری ازل سے بشری ابد تک اولیت کے ساتھ اور خاتمت کے ساتھ یہی نور چمکتا رہا اور چمکتا رہے گا نہ اس کے لئے انتہا ہے نہ اختتام اور اسی کے فیضان سے کائنات چمکتی رہی اور مختلف روپوں میں چمکتی رہے گی۔

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کر کے نکھار کر
 ہے یہ وہ نام خار کو مچھول کر سے سنوار کر
 ہے یہ وہ نام ارض کو سما کر سے ابھار کر
 اکبر اسی کا ورد تو صدق سے بار بار کر
 صَلِّ عَلَیْ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلَیْ مُحَمَّدٍ

آفتاب کی تشبیہ کی روشنی میں ختم نبوت کے یہ چند اساسی پہلو تھے جنہیں طالب علمانہ رنگ سے پیش کر دیا گیا یا درداشت میں بعض اور پہلو بھی اجمالاً درج کرنے گئے تھے لیکن ہجوم کا رہبالت نہیں دیتا کہ انہیں بھی تفصیل سے یا اجمال ہی سے کسی ترتیب سے پیش کرنا

وقت نکالا جائے اور فرصت کے انتظار اور امید و بیم کی تاخیر کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ مرتب شدہ ذخیرہ بھی رہ جاتا اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا۔ ایسے ان کی تسوید تبیض کا انتظار کئے بغیر جو پہلو مرتب ہو گئے، وہی پیش خدمت کر دیئے گئے۔ حق تعالیٰ قبول فرمائے۔

والحمد لله الذی بنعمته تنو الصلحت

والحمد لله اولاً و آخراً ۛ

محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ ۛ



حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
کی مزید گراں قدر تصانیف حاصل کرنے کیلئے
ادارہ اسلامیات ۱۹۰-انارکلی لاہور ۲